اسد محمد خاں
غصّے کی نئی فصل

اسد محمد خاں

ISBN 969-8379-06-1

غصے کی نئی فصل

(کہانیاں)

اسد محمد خاں

خطاطی: عبدالرشید شاہد
طباعت: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی

پہلی اشاعت: ۱۹۹۷

مدیر کتب خانہ: اجمل کمال
مہتمم: ذی شان ساحل
ناشر: زینت حسام

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری بائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰
فون: 3474 811 (92-21)
ای میل: aaj@biruni.erum.com.pk
انٹرنیٹ: http://www.pakdata.com/aaj

ملنے کا پتا:
سٹی پریس بک شاپ
۵۰۹، رفیق سنٹر، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی ۷۴۴۰۰
فون: 0107 51 (92-21)

ترتیب

***

ترجمے

اپنے سب بچوں

اور نواسا نواسی

کے نام

ایک بے خوف آدمی کے بارے میں

کشور خان چِنگلی وال میرا ساتھی ہے۔ ہم دونوں بندرگاہ پر کام کرتے تھے۔ ہم دونوں ہی شہروں کی اس تھکی ماندی دُلھن ـــــ کراچی ـــــ کے گرفتار ہیں۔ دونوں اپنی اپنی زاد بوم سے آ کر یہاں بس گئے اور اس خوب صورت، بد صورت، مشکل، من موہنے، سفاک اور جیتے اور جادو بھرے شہر کے دامِ محبت میں اس طرح گرفتار ہوے کہ اب کہیں اور دل نہیں لگتا۔ اسی شہر میں ہمارے گھر بنے، اسی شہر میں بچوں کی کلکاریوں سے یہ گھر آباد ہوے۔ اب یہ ہمارے بچوں کا شہر ہے اور ہمارا شہر ہے۔ کبھی کبھی اس شہر کی رفتار اور اس کے بوجھ سے دل اُوبھنے لگتا ہے تو اپنے اپنے چِنگلی گاؤں لوٹ جانے کو جی چاہتا ہے مگر عجیب قصّہ ہے کہ دو دن کے لیے بھی ہم اس شہر سے بچھڑ جائیں تو سب کچھ پھیکا پھیکا لگتا ہے۔ دوسری سب بستیاں کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ ہم پھر کراچی لوٹ آتے ہیں۔

کشور خان برسوں پہلے گاؤں ڈاک خانے چِنگلی سے مزدوری کرنے یہاں آیا تھا۔ یہ گاؤں صوبۂ سرحد کے گلزار ضلعے سوات کی پھولوں بھری تحصیل ڈگر میں بسا ہوا ہے۔ اس گاؤں کے کسی روشن محلے مداخیل میں کشور خان رہتا تھا۔ یہ جب چِنگلی سے کراچی آیا تو بس اتنی اردو جانتا تھا کہ رہگیروں سے وقت پوچھ لے اور کیماڑی کا رستہ معلوم کر لے۔ اس نے کیماڑی پہنچ کر بندرگاہ پر مزدوری شروع کر دی۔ محنت سے کام کیا تو بندرگاہ والوں نے اسے قاصد بھرتی کر لیا۔ اس نے سر پر ٹین کی ایک چھت ڈال لی اور کراچی میٹرک کا کورس خرید لایا۔ دن میں یہ گھنٹی کی آواز پر دوڑ دوڑ کے کام

کرتا رہا اور راتوں میں اپنا کراچی میٹرک کا کورس پڑھتا رہا اور پاس ہو گیا۔
پھر اس نے انٹر کی کتابیں خرید لیں۔
پھر بی اے کی کتابیں خرید لیں۔
اس عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ میر تقی اور انیس اور مرزا غالب اور ڈپٹی نذیر اور اقبال اور اسمٰعیل میرٹھی اور احمد ندیم قاسمی بہت پیارے لوگ ہیں اور اس نے فیض احمد فیض سے محبت کرنا سیکھ لیا اور فراق گورکھپوری کی چاہت میں مبتلا ہو گیا (اگرچہ فراق کا پورا نام ہندوؤں جیسا تھا)۔
ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ یارا اسد خانا! اردو بڑا پیارا چیز ہے، بالکل میری پشتو کی طرح۔ پھر ایک اور دن اس نے بڑی رازداری سے مجھے بتایا کہ وہ اب اردو میں کہانیاں لکھنے لگا ہے۔
میں نے کہا قربان کنور خان شاباشے۔
کنور خان نے جب انٹر پاس کیا تھا تو بندرگاہ والوں نے اسے بابو بنا دیا تھا، اسے ایک میز اور ایک کرسی دے دی تھی جس پر بیٹھ کر فارغ وقت میں اس نے آدم خان درخانئی کی کہانی اپنے طور پر لکھی اور فلم اسٹار بدر منیر کی جرأت اور دلیری کو سامنے رکھ کے بھی ایک کہانی لکھی اور سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کے "خطبات مدراس" آرام آرام سے پڑھے۔
مجھ ناچیز نے اپنی کتاب "کھڑکی بھر آسمان" چھپوائی تو کنور خان بہت خوش ہوا، کہنے لگا، "خان صیب! دوست کا کتاب چھپے تو لگتا ہے جیسے دوست کے باڑے میں میٹھے پانی کا چشمہ نکل آیا ہے۔ یارا، تیرے کو کتاب مبارک ہو۔" پھر کچھ شرما کے بولا، "میں نے بھی ایک کتاب لکھی ہے، آپ مشورہ دو تو اس کو چھپوا دوں، بولو تو نہیں چھپواؤں۔"
میں نے کنور خان کو ہمت اور بے خوفی سے ترقی کرتے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے اسے بہت آگے بڑھنا ہے۔ مجھے خبر ہے یہ اپنی ماں کو اور اپنے بال بچوں کو ایک اور خوشی دینا چاہتا ہے اور اپنے "گراں" والوں اور اپنے دوستوں کے درمیان سربلند ہونا چاہتا ہے۔ ایسے بے خوف آدمی کا رستہ کون روک سکتا ہے؟ میں نے کہا، "بسم اللہ! ضرور چھپواؤ اپنی کتاب۔" اور میں نے اسے اپنے خطاط دوست سید اسحاق بزمی سے ملوا دیا۔ سید اسحاق بونیر (سوات) کے سید بادشاہ کی

اولاد میں سے ہیں، گویا ایک طرح سے کشور خان کے مرشدزادے اور گرائیں ہیں۔ انھوں نے بہت پیار سے ان صفحات کی کتابت کر دی اور کشور خان کی کتاب تیار ہو گئی۔

میں اردو ادب کا طالبِ علم، اس جادو زبان کے طلسمات کا اسیر، اپنے ساتھی کشور خان چنگلی وال سے اس بات پر خوش ہوں کہ اس نے اردو زبان سے پیار کیا۔۔۔ اتنا پیار کہ ایک کتاب لکھ دی۔ کشور خان کا کوئی دعویٰ نہیں۔ ہمعصر ادیبوں میں اسے کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں جانے گا۔ اس کا کوئی گروہ، کوئی "لابی" نہیں۔ بائی بروا سے کبھی تسلیم بھی نہیں کریں گے، ظاہر ہے۔ مگر کشور خان کو اس بات سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ تو صرف اپنے چھوٹے بیٹے اکبر خان کراچی وال کو جرأت اور جواں مردی اور کامرانی کی ایک کہانی سنانا چاہتا ہے اور کہنا چاہتا ہے کہ بچہ اکبر خانا! دیکھا، تمھارا باپ تیرا قومی زبان کا مصنّف ہے۔

اس کتاب کو چھپوانے میں جتنے پیسے خرچ ہوئے اتنے پیسوں میں کشور خان اپنے کئی شوق پورے کر سکتا تھا۔۔۔ دو بینڈھے خرید سکتا تھا، سوٹ سلوا سکتا تھا، ایک اور کمرے پر ٹین ڈلوا سکتا تھا ۔۔۔ مگر وہ بلند ہمت بہت ہے، وقت کے سمندر میں اپنے لکھے ہوئے لفظوں سے ایک ٹاپو بنا دینا چاہتا ہے، چھوٹی موٹی ابدیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے خبر ہے کہ چاہے کتنے ہی چاؤ سے پالا جائے، بینڈھے اپنی طبعی عمر کو پہنچ کے مر جاتے ہیں۔ سوٹ بھی تار تار ہو جاتے ہیں۔ چھتیں بالاخر بیٹھ جاتی ہیں۔

اسے ایک دانش ورثے میں ملی ہے کہ

کہ ترا دلوختو شاهان او سلطانان... وغیرہ وغیرہ۔

یعنی دنیا سے بڑے بڑے بادشاہ اور سلاطین اٹھ گئے تو کیا ہوا؟ ان کی وجہ سے کوئی فرق نہ آیا۔ اگر ایک لمحے میں ہزاروں آدمی فنا ہوتے ہیں تو دوسرے ہی لمحے ہزاروں اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس آمدورفت کا کوئی حساب نہیں، ایک بحرِ بے پایاں ہے جو بہا چلا جاتا ہے۔ (رحمان بابا۔)

اور اس بحرِ بے پایاں میں ایک چھوٹا سا بے خوف آدمی ایک چھوٹی سی کتاب سے اپنا ننھا سا ٹاپو بنا رہا ہے۔ خدا اُسے خوش رکھے۔

غصّے کی نئی فصل

حافظ شکراللہ خان اپنی بات اجمالاً ہی کہنا پسند کرتا تھا۔

حافظ شکراللہ خان اچھاخاصا صاحبِ علم اور کم گو آدمی تھا، شاید اسی لیے اپنی بات اجمالاً کہنا پسند کرتا تھا، چناں چہ اسے تفصیلات سے اور وقت ضائع کرنے سے الجھن ہوتی تھی۔

گٹھے ہوئے ورزشی بدن کا یہ پڑھالکھا روہیلہ آس پاس کے دیہات میں غصہ ور مشہور تھا۔ شاید اسی لیے پیٹھ پیچھے اسے حافظ گینڈا کہا جاتا تھا۔

یہ بات حافظ شکراللہ خان کے علم میں تھی کہ اسے حافظ گینڈا کہا جاتا ہے مگر وہ ایک نوع کے حِلم و درگزر سے کام لیتا تھا۔ اس نے اب تک صرف اُن لوگوں کو زدو کوب کیا تھا جنھوں نے توہین کے ارادے سے اور عمداً اسے اس کے منھ پر حافظ گینڈا کہا تھا۔ نادانستہ گینڈا کہنے والوں، بچوں، اور ہم چشموں کی بے تکلفانہ بےادبی کو وہ منھ پھیر کر ٹال دیا کرتا تھا۔

حافظ شکراللہ خان گینڈے میں ایک عجیب بات اَور بھی تھی۔ وہ لادین لوگوں اور دوسرے مذہبوں مسلکوں والوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ کہتا تھا بھَل منسی میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ وہ ہمارا کیا لیتے ہیں جو ہم سے متفق نہیں؛ وہ بےچارے تو ویسے ہی نقصان میں ہیں۔ دیہات میں بسے ہوئے کسی بھی ملّاں کا یہ رویہ عامتہ المسلمین کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے تھا، مگر لوگ حیران نہیں ہوتے تھے ___ انھیں حافظ شکراللہ خان کا مزاج معلوم تھا۔

حافظ شکراللہ خان، کوہِ سلیمان کے دامن میں دریاے گومَل کے کنارے آباد ایک گاؤں

روہ ری میں رہتا تھا۔ اس نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ روہ ری گاؤں صاحب السیف سلطانِ عادل، شیر شاہ سُوری کے بزرگوں کا آبائی وطن ہے۔ شیر شاہ کے دادا ابراہیم خان سوری اپنے نوعُمر بیٹے میاں حسن خان کے ساتھ روہ ری سے چلے تھے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ ابراہیم خان نے پنجاب کے شہر نار نول میں اور میاں حسن خان سوری نے سہسرام، بہار، میں انتقال کیا تھا۔ سب کی طرح حافظ شکراللہ خان بھی سمجھتا تھا کہ جب باپ اور دادا نہیں آئے تو اب سلطان شیر شاہ اس بُھولے بِسرے گاؤں میں کیا آئیں گے۔ اس طرح استدلال کر کے حافظ شکراللہ خان نے طے کیا کہ اگر پہاڑ میری طرف نہیں آتا تو لاؤ میں ہی پہاڑ کی طرف چلوں۔ پس شکراللہ خان گینڈے نے گھر والوں سے مشورے کے بعد دارالخلافہ جانے کا ارادہ کر لیا اور تیاریاں شروع کر دیں۔ شکراللہ خان نے ملک پنجاب و ملتان سے آگے سرہند، بہار، بنگالہ، مالوہ اور خاندیش کے نظم و نسق اور خوش حالی کے قصّے اور عالموں، دانش مندوں کا احوال سنا تھا۔ اس نے روہ ری گاؤں کے فرزندِ جلیل فرید خان شیر شاہ کے قصے سنے تھے جس نے قلیل مدت میں سات آٹھ سو کوس لمبی شاہراہ بنوائی تھی، زمینوں کا انصرام درست کیا تھا، ہند کے شورش زدہ علاقوں میں امن قائم کیا تھا، اور اپنی تلوار اور تدبّر سے فتنہ انگیزیوں اور شرارتوں کا خاتمہ کر کے خلقت کے لیے خدا کی زمین رہنے لائق بنا دی تھی۔

شکراللہ خان گینڈا ایک بار یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار سلطانِ عادل شیر شاہ کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اللہ کا نام لیا، گھوڑے پر زین کسی، گاڑھے کی ایک چادر میں وہ کتابیں باندھیں جن سے زیادہ دن جدا نہیں رہا جا سکتا تھا، اور شیر شاہ سے ملنے چل پڑا۔

حافظ شکراللہ نے اپنے بڑوں سے سیکھا تھا، اور سرکاروں درباروں سے ہو کر آنے والوں سے سن رکھا تھا، کہ لوگ کسی تاج دار کی خدمت میں پیش ہوں تو انہیں نذر گزارنی ہوتی ہے، کوئی ایسا تحفہ دینا ہوتا ہے جو پیش کرنے والے اور قبول کرنے والے دونوں کے لیے قیمتی ہو۔ حافظ نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ حضرتِ والاجاہ، سلطانِ ہند کے لیے اسے کیا سوغات لے جانی چاہیے۔

شکراللہ خان اپنے گاؤں کے اس ٹیبے پر گیا تھا جہاں بزرگ بتلاتے تھے کہ کبھی سُوریوں کا حجرہ

اور باڑا تھا۔ اس نے تین مرتبہ کھوبے بھر بھر کے اس ٹبے کی مٹی اٹھائی تھی اور زربفت کے ایک پارچے میں، جو اسے کسی لشکری نے جُزدان بنانے کی غرض سے دیا تھا، یہ مٹی باندھلی تھی۔

زربفت کے پارچے میں بندھی یہ مٹی اور اپنی پسندیدہ کتابیں اٹھائے حافظ شکراللہ خان پہلے اپنی پھوپھی کے گھر حسن ابدال پہنچا۔ حسن ابدال میں سات روز ٹھہر کے بافندوں کی ایک جماعت کے ساتھ وہ لاہور آ گیا۔ لاہور خوش اوقات بےفکرے لوگوں کا شہر تھا اور شکراللہ کم آمیز، خاموش طبع آدمی۔ وہ پانچ روز بافندوں کے ڈیرے پر پڑا سفر کی تھکن دور کرتا رہا؛ شہر کی چمن بندی اور بِھیڑ بھڑکا دیکھنے بھی نہ نکلا۔ چھٹے روز رسد لے جانے والے بنجاروں کی بیل گاڑیوں کے ساتھ ہولیا اور گھوڑے کو تھکائے بغیر دارالخلافے کی منزلیں سر کرنے لگا۔

حافظ شکراللہ خان روہ ری سے کچھ رقم لے کر چلا تھا۔ حسن ابدال میں محبت کی ماری پھوپی نے مٹھی بھر چاندی کے سکّے حافظ کے کِیسے میں ڈال دیے تھے اور لاہور تک جن بافندوں کے ساتھ آیا تھا وہ بھلے لوگ تھے، حافظ کو راہ میں کچھ خرچ ہی نہ کرنے دیتے تھے؛ کہتے تھے ہمارے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ ایک عالم و فاضل مُلّاں ہم سفر ہے۔ چناں چہ دارالخلافہ جاتے ہوئے شکراللہ خان کے پاس اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ راستے بھر بنجارے اس کوشش میں لگے رہے کہ اس رقم میں سے کچھ ہتھیالیں مگر حافظ گینڈے نے موقع ہی نہ دیا۔ بنجارے اس کے علم و فضل سے تو کیا مرعوب ہوتے، گینڈے نے اپنے گٹھے ہوئے بدن اور اپنی تلوار سے انھیں قابو کیا اور بالاخر رسد کے اس قافلے سے بچھڑ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

لاہور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ دارالخلافہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ سرکاری سرایوں میں بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ پیسے کی بچت بےشک تھی مگر حافظ ہجوم سے گھبراتا تھا۔ جیسے جیسے دارالخلافہ نزدیک آرہا تھا سڑک کے آس پاس بستیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ ان بستیوں میں مساجد بھی تھیں اور نج کی سرائیں، مہمان خانے بھی۔ حافظ شکراللہ خان نے سوچا، مسجدوں کے منتظمین تو خوش ہو کر اسے ٹھہرالیں گے۔ پھر خیال آیا کہ پیش اماموں، موذنوں کی روٹی میں حصّہ بٹانے کی بجائے کیوں نہ رقم خرچ کر کے کسی نجی سرائے میں ٹھہر جاؤں۔ منزل دو منزل سر کر کے شہر پہنچ جاؤں گا۔ پھر ضرورت پڑی تو کوئی نوکری کر لوں گا۔ دارالخلافوں میں ہزار کام ہوتے ہیں۔ تو اس طرح بھی

مہمان خانوں، سرایوں میں رکتا ٹھہرتا، حافظ شکراللہ خان دارالخلافے پہنچ گیا۔

شہر کی وہ سرائے جہاں حافظ نے ٹھہرنے کا ارادہ کیا تھا، کتب خانے کے نزدیک تھی۔ شکراللہ خان نے سوچا، شہر گھومنے سے بھی کیا ملے گا؟ شہر سبھی ایک سے ہوتے ہیں۔ مجھے یہاں چند ہی روز تو رہنا ہے۔ یہ دن سرکاری کتب خانے میں لگا دوں گا۔ کتابیں دیکھنے، اپنے مطلب کی چیزیں نقل کرنے سے اچھی سیر اور کیا ہو گی! وہ سرائے کے منتظم سے ملا، سرائے میں ٹھہرنے کا کرایہ، کھانے پینے کا خرچ معلوم کیا۔ سہولتوں کے اعتبار سے کرایہ زیادہ نہ تھا۔ کھانے پینے پر بھی وہی خرچ آ رہا تھا جتنا بڑے شہروں میں اچھی سرایوں میں ہوتا ہے۔ بس ایک مشکل تھی، سرائے میں کوئی سموچا کمرہ، کوٹھری خالی نہ تھی۔ سرائے کے منتظم نے کہا، "چاہو تو چار بستروں والے کمرے میں ایک بستر آپ لے سکتے ہو۔"

حافظ بولا، "اے بھائی! جو ہجوم کے ساتھ ہی رہنا ہوتا تو مفت کی سرکاری سرائیں کیا بری تھیں؟" سرائے کا منتظم کتابوں کا پشتارہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ روہیلہ مُلّاں رات بھر چراغ جلا کر کتابیں پڑھے گا یا چلّہ کھینچے گا؛ یہاں اس کا گزارہ مشکل ہے۔ اس نے حافظ شکراللہ کو قریب کی ایک سرائے کا پتا بتلا دیا۔ کہنے لگا، "آپ فاضل عالم آدمی ہو۔ وہاں کمرہ کوٹھری خالی ملے گی، اور اپنے مطلب کے لوگ بھی مل جائیں گے۔"

"اپنے مطلب کے لوگ" منتظم نے مسکرا کر کہا تھا۔ اس وقت یہ بات حافظ گینڈے کی سمجھ میں نہ آ سکی؛ تاہم اس نے زیادہ غور نہ کیا۔ وہ راسیں تھامے گھوڑے کو چلاتا ہوا دوسری سرائے میں پہنچا تو خوش ہو گیا۔ یہاں ایک پورا کمرہ خالی تھا؛ جگہ صاف ستھری اور کم خرچ تھی اور دوسری جگہوں کے مقابلے میں شور شرابا بھی بہت کم، سمجھو نہ ہونے کے برابر تھا۔

حافظ نے سرائے کے اصطبل میں اپنا گھوڑا باندھا۔ کمرے میں کتابوں کا بقچہ، زربفت کی پوٹلی، ہتھیار اور دوسرا سامان رکھا، کاغذ قلم دان سنبھالا اور کتب خانے کی راہ لی۔ حافظ گینڈا سخت کوش پہاڑی آدمی، کھانے پینے میں شہریوں کی طرح تکلف کیا کرتا۔ کتب خانے میں دن گزارنا تھا، چار چھ مٹھی بھنے ہوئے چنے فرغل کی جیب میں ڈالے اور جم کے بیٹھ گیا۔ دوپہر بعد حافظ شکراللہ ظہر کی نماز کے لیے اٹھا، کتب خانے کے چھوٹے باغیچے میں ترنج کے ایک ہرے بھرے

پھل داردرخت کے سائے میں فرض پڑھے، مٹھی بھر چنے چبائے، پانی پیا۔ کتب خانے کی سیڑھیوں کے پاس دھوپ میں ایک پھیری والا آن بیٹھا۔ وہ کوئلے کی انگیٹھی سے برتن باندھے، بھنگی سی بنائے، راستوں، بازاروں میں عربی قہوہ بیچتا پھرا تھا۔ سکون کی جگہ دیکھ کراب جو ستانے بیٹھا تو شکراللہ خان کو اس تھکے ماندے کی بیٹھک بھلی لگی۔ قہوے کی طلب نہ تھی مگر حافظ نے اس سے قہوہ خریدا اور پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پینے لگا۔ قہوہ اچھا تھا۔ حافظ شکراللہ خان جیسے کھل اٹھا۔ دو تین فنجان قہوے کے اور خرید کیے۔ دام دے کر اٹھنے ہی کو تھا کہ دیکھا کتب خانے کے دروازے سے ایک نوعمر آدمی برآمد ہوا ہے۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ نووارد نے حافظ کو کتابوں کے درمیان بیٹھے دیکھا ہوگا، سلام کر کے بولا، "فاضل! کچھ دیر بیٹھیے۔ ایک فنجان میری طرف سے پی لیجیے۔"

نوجوان نے اہلِ زباں کی رواں فارسی میں بات کی تھی۔ گینڈے نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گیا۔ "ٹھیک ہے، ایک فنجان اور سہی!" اس نے قہوہ لیا، نووارد کو اپنا نام بتایا، اس کا نام پوچھا۔ آنے والا اصفہان سے آیا تھا۔ وہ اپنا نام فےرُوز بتاتا تھا۔ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ فےرُوز منطق اور تواریخ کی تعلیم لے رہا تھا اور شہر جَون پور کے کسی فاضل کی شاگردی کی نیت سے گھر سے نکلا تھا۔

قہوہ ختم کر کے دونوں سیڑھیاں چڑھتے پھر کتب خانے میں جا بیٹھے۔

حافظ شکراللہ مغرب تک کتب خانے کے فراخ دریچے سے لگا بیٹھا پڑھتا رہا۔ اذان سے کچھ دیر پہلے وہ اٹھا اور کتب خانے سے نکل گیا۔ دور گوشے میں کتابوں کے چھوٹے سے انبار کے پاس بیٹھا فےرُوز اصفہانی کاغذ پھیلائے کچھ نقل کر رہا تھا۔

شکراللہ خان کا یہ پہلا دن بھرپور گزرا تھا۔ عشا سے قبل سرائے میں کھانا کھا کے اس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ شہر کے مرکزی علاقے میں افغانوں کے نوتعمیر مدرسے سے ملی ہوئی چھوٹی سی مسجد تھی۔ حافظ نے وہاں عشا کی نماز پڑھی۔ پھر کچھ بھٹکتا، پوچھتا پاچھتا وہ اپنی سرائے میں لوٹ آیا۔ تھکاماندہ تھا۔ فوراً ہی سو گیا۔

خدا معلوم حافظ گینڈے نے ایک پہر نیند لی ہوگی یا دو پہر، جو اسے آدھے جاگتے آدھے

سوتے میں لگا کہ جیسے ایک آدم خور غولِ بیابانی چنگھاڑتا بلبلاتا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ بھاگتا، جان بچانا چاہتا ہے مگر زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ بدن کی پوری طاقت سے وہ خود کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ پہلے پہل اسے کامیابی نہ ہوئی۔ غولِ بیابانی بپھرے ہوئے اونٹوں کے گلّے کی طرح بلبلاتا، تعزیر سہتے جان داروں کی طرح پکارتا، بَین کرتا، اس کے بالکل پیچھے، سمجھو دو قدم کے فاصلے تک آ گیا۔ آدم خور اپنے پنجے بڑھا کر حافظ شکراللہ کو چُھو سکتے تھے، اور کسی ایک نے تو اپنا نوکیلا پنجہ بڑھا کر اس کی پشت پر خراشیں بھی ڈال دیں... تس پہ شکراللہ خان نے ایک دبی ہوئی چیخ ماری اور جاگ پڑا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

معاذاللہ! یہ کیسا خواب تھا، حافظ نے سوچا۔ مگر یہ سراسر خواب نہیں تھا؛ کچھ حقیقت بھی تھی۔ کس لیے کہ چیخ پکار اور غیظ کی آوازوں سے کمرہ جیسے بھرا ہوا لگتا تھا۔ حافظ کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خدا پناہ میں رکھے! یہ کیسی آوازیں ہیں؟ یہاں، اس کمرے میں، یہ کیسی بلائیں آ گھسی ہیں؟ اس نے اٹھ کر چراغ کی لو بڑھائی۔ تکیے کے نیچے ہاتھ پہنچا کر اپنا پیش قبض نکالا، نیفے میں اڑس لیا۔ کمرے میں کوئی اَور نہ تھا؛ بس یہ رونگٹے کھڑے کرنے والی آوازیں گردوپیش سے، اوپر سے، حد یہ کہ فرش تک سے چلی آ رہی تھیں۔

حافظ گینڈے نے بدن کو دُلائی میں اچھی طرح لپیٹا، چراغ اٹھایا، اور نیام کی ہوئی تلوار لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں سرائے پر رہزنوں نے تو حملہ نہیں کر دیا۔ مگر یہ بھرا پُرا شہر تھا، اور شہر بھی کون سا ـــــ دارالخلافہ۔ شیر شاہ کی عمل داری میں ڈاکوؤں لٹیروں کی یہ ہمت کہاں ہو سکتی تھی کہ بستیوں پر یوں چڑھ دوڑیں۔ رہزنوں کی تو اس وقت بن آتی ہے جب حکم راں کم زور یا بددیانت ہوں۔ شیر شاہ نہ تو کم زور سلطان تھا نہ بددیانت حکم راں۔ حافظ شکراللہ خان نے سوچا، شاید سرائے میں آگ لگی ہے اور لوگ جانیں بچا کر بھاگتے ہیں، مگر اس نے برآمدے میں نکل کر دیکھا؛ وہ صحن کی طرف بھی گیا، اسے کہیں سے جلنے کی بُو نہ آئی۔ برآمدے میں اس نے دیکھا، ہر کمرے میں روشنی ہو رہی تھی مگر مسافر، مکین کوئی نہ تھا۔ صحن میں الاؤ جلتا تھا پر الاؤ کے پاس بیٹھنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ سائیس، خادم، چوکیدار، جریب بردار؛ نہ کوئی مکیں، نہ مسافر۔ دور دور تک کسی کا پتا نہ تھا۔

پھر حافظ کو سرائے کی چھت پر مشعلوں کی روشنی نظر آئی۔ آوازیں چھت ہی سے اٹھ رہی تھیں۔ اس نے چھت پر جانے کا زینہ تلاش کیا اور چراغ اور تلوار اٹھائے دھڑدھڑاتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔
وہاں حافظ شکراللہ خان گینڈے نے عجیب منظر دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ سرائے کی چھت پر طرح طرح کے چراغوں، مشعلوں، دِیوں، شمعوں، روشن ہانڈیوں سے جیسے رات میں بھی دن کا سماں ہے اور چالیس سے پچاس کی تعداد میں عورت مرد دائرہ بنائے بیٹھے ہیں اور حلق سے غیظ و غضب کی آوازیں نکالتے ہیں۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا جیسے اب اٹھیں گے اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے ــــ مگر اس طیش، اتنے غضب کے باوجود کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں، دوسرے پر حملہ نہیں کرتا۔ بس اپنے سامنے بیٹھے مرد یا عورت کو غصے کی آوازیں کر کے آنکھیں نکال نکال کے دانت نکوستے ہوئے دہلائے جاتا ہے۔

حافظ گینڈے نے چراغ نیچے رکھ دیا۔ تلوار اپنے بدن کی اوٹ میں کر لی اور حیرت میں ڈوبا ان لوگوں کو چیخ پکار کرتے دیکھتا رہا۔

اس نے ان میں بہت سوں کو پہچانا۔ سرائے کا مالک، جو دن میں اپنی پشت اور کہنیاں تکیوں سے ٹکائے بیٹھا اَدھ کھلی آنکھوں سے مہمانوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا، وہاں موجود تھا۔ منتظم، جو ہر مہمان کو اپنا مالک بلکہ مرشد سمجھتا تھا اور ہر ایک کے آگے بچھا جاتا تھا، اس وقت وہاں جما بیٹھا تھا۔ مطبخ کے ملازم، جو سارا دن پکانے اور چکھنے میں گزار دیتے تھے اور کھا کھا کے وزنی ہو گئے تھے، وہ سبھی بیٹھے تھے۔ کئی خدمت گار، اصطبل کے خادم اور سائیس، اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ کہ سرائے میں ٹھہرے ہوئے مسافر بھی جو اپنے لباس اور آسودہ حال طمانیت بھرے چہروں کی وجہ سے الگ پہچانے جاتے تھے، اس حلقے میں موجود تھے۔ حیرت پہ حیرت یہ تھی کہ مہمان بھی سب کی طرح چہرے مسخ کیے، دانت نکالے، آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے والے کو دیکھتے ہوئے بلبلا رہے تھے۔

"یہ مَیں کن لوگوں میں آ گیا؟" شکراللہ خان نے سوچا، "یا یہ کوئی خواب ہے؟"

مگر یہ خواب نہیں تھا۔ وہ سبھی لوگ جنھیں حافظ شکراللہ نے دن کے وقت معقول طریق پر آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے دیکھا تھا، اس وقت نصف شب گزار کر وحشت زدہ ہو رہے

تھے۔ "کیا یہ کسی قسم کے جنون میں مبتلا ہیں؟"

کیا یہ لوگ بیک وقت کسی دورے سے گزر رہے ہیں؟ کوئی خفیہ جماعت محفل کرتی ہے؟ یا کوئی شیطانی گروہ اپنی بھیانک رسمیں ادا کر رہا ہے؟

ابھی حافظ گینڈا یہاں سے ہٹنے اور کمرے میں اپنے سامان کے پاس لوٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص حلقے سے اٹھا اور مُنہ پر اس طرح ہاتھ پھیرتا کہ جیسے نیند سے ابھی بیدار ہوا ہو، حافظ کی طرف آیا۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا۔ یہ سائیس تھا جس کے سپرد اس نے اپنا گھوڑا کیا تھا۔ سائیس کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت، جو اپنے چہرے کے نقوش اور اپنی کھال کی رنگت سے کسی سرد ملک سے آئی لگتی تھی، حلقہ چھوڑ کر اٹھی اور چہرے پر ہاتھ پھیرتی حافظ کی طرف آئی۔ سائیس اور عورت نے نرمی سے حافظ کا ایک ایک ہاتھ تھام لیا اور اسے حلقے کی طرف کھینچنا چاہا۔ عورت کی نظر حافظ کی تلوار پر پڑی تو اس نے چنچنی آواز میں کہا، "توبہ! تم ہتھیار کیوں لائے ہو؟ یہ حلقہ غیظ کا حلقہ ہے۔ تلوار کا یہاں کیا کام؟ اسے رکھ دو___ ہمارے ساتھ آؤ۔"

شکراللہ خان نے سختی کے ساتھ عورت کی گرفت سے ہاتھ چھڑا لیا۔ سائیس نے اب تک نرمی سے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا؛ اب جو حافظ نے عورت کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا تو سائیس نے سختی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے حافظ کی کلائی پکڑ لی اور اسے حلقے کی طرف کھینچنے لگا۔ "آؤ! آؤ آغا___ اور دیر نہ کرو۔ تمھیں تو پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔"

"یہ میں کس وبال میں پھنس گیا ہوں؟" حافظ گینڈے نے غصے سے جھٹکا دے کر سائیس کی گرفت سے کلائی چھڑائی اور ہاتھ اٹھا کر دور ہو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے چراغ اٹھایا اور تیز تیز قدم لیتا زینے کی طرف چلا۔

ہاتھ چھڑا کر جاتے ہوئے اسے سبھی نے دیکھا، اس لیے پورے حلقے نے بہت ہی غضب ناک آواز میں اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے شکراللہ خان کو یوں لگا جیسے وہ تمام چالیس پچاس وحشی جھپٹتے ہوئے پیچھے آئیں گے اور اسے پھاڑ کھائیں گے۔ حافظ گینڈے نے اتنا بھیانک غصہ، یا آوازوں سے غصے کا ایسا وحشی اظہار، پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دُلائی لپیٹے، کسی بھی پُرتشدد واقعے کا سامنا کرنے کو تیار، ایک ایک قدم اترنے لگا۔ کیا خبر کب چراغ رکھ کر اسے تلوار کھینچ

لینی پڑے۔ بالآخر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب وحشت زدہ سرائے والے اور مسافر چھت پر اپنے حلقے ہی میں بیٹھے غصے کے جھاگ اڑاتے اور بھیانک آوازیں نکالتے رہے، سیڑھیاں اتر کے کوئی نہ آیا۔

صحن میں آ کر حافظ نے عافیت کا سانس لیا۔ وہ برآمدے میں پہنچا۔ اس نے سرائے کے منصرم کا حجرہ دیکھا؛ پھر قطار میں بنے مہمانوں کے کمرے دیکھے۔ سب دروازے کھلے تھے؛ سب کمرے خالی تھے۔ شکراللہ خان آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور چراغ گیر پر چراغ رکھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

تو یہ بات تھی جو پہلی سرائے کے منتظم نے کہنا چاہی تھی۔ کہتا تھا تمھارے اپنے مطلب کے لوگ ملیں گے۔ اس گیدی نے مجھے وحشت زدہ مجنون سمجھ کر ادھر ہنکا دیا۔ شکراللہ خان گینڈے کو اتنا غصہ آیا کہ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ فی الفور اس پہلی سرائے کے منصرم کو جا پکڑتا اور گھوڑے کے چابک سے اتنا دُھنکتا کہ گیدی کو تا عمر یاد رہتا، مگر حالات کا تقاضا یہ تھا کہ غصے پر فی الحال قابو پا لیا جائے؛ غور و فکر کیا جائے۔

"میں کسی بے آباد ویرانے میں نہیں، بستی میں ہوں۔ اور بستی بھی کیسی، ایک گنجائش سے زیادہ آباد شہر، جو شیر شاہی مملکت کے قلب میں واقع ہے؛ اس کا دارالخلافہ ہے۔ یہاں دیوانِ شُرطہ اور دیوانِ قانون موجود ہیں۔ سڑکوں پر سے طلایہ بھی گزرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں خود کوئی کارروائی کروں؟ میں تو ان مجنونوں کے خلاف، جو خلقت کی نیند میں خلل انداز ہو رہے ہیں، شکایت درج کراؤں گا اور ابھی اسی وقت درج کراؤں گا تاکہ میری نیند خراب ہوئی سو ہوئی، دوسرے بندگانِ خدا تو سکون سے اپنی نیند پوری کر لیں۔"

حافظ گینڈے نے باہر جانے کے ارادے سے کپڑے پہننا شروع کیے۔ ابھی وہ پوری طرح تیار بھی نہ ہوا تھا کہ چھت سے آتی غیظ و غضب کی آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ حافظ نے دروازہ کھول کر دیکھا، صحن میں روشنیاں اور سائے حرکت کر رہے تھے۔ پھر اکا دکا مہمان برآمدے سے گزرنا شروع ہوئے۔

ایک خوب صورت بچہ اپنی ماں کا ہاتھ تھامے گزر رہا تھا۔ حافظ متوجہ ہوا تو بچے نے مسکرا کر دیکھا۔ عورت نے بچے کو مسکراتے ہوئے پا کر حافظ شکر اللہ خان کی طرف نظر کی۔ پھر بچے کے تتبع میں وہ خود بھی مسکرانے لگی۔

چیزیں لحظہ لحظہ بدلنا شروع ہو گئی تھیں۔

پہلے بچہ مسکرایا تھا؛ پھر اس کی ماں مسکرائی تھی؛ پھر اس نے گاتی گنگناتی آواز میں حافظ گینڈے کو سلام کیا تھا، "سلام علیک فاضل! خیر باشد؟"

حافظ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مسکراتی ہوئی اس وجیہ و باوقار عورت سے کیا کہے۔ اس نے آہستہ سے کہا، "بحمداللہ۔۔۔ سب عافیت۔"

عورت بچے کا ہاتھ تھامے، اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور اپنی بڑی بڑی روشن آنکھیں جھپکاتی ہوئی گزر گئی۔ سرائے کا ایک خادم برتن اٹھائے حافظ کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ اب وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے حافظ شکر اللہ کو سلام کیا اور گزر گیا۔

خادم کے دفع ہوتے ہی دو مسکراتے ہوئے مسافروں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ادھیڑ عمر کی وہی عورت برآمدے میں آئی جس نے چھت پر حافظ کو روکنا چاہا تھا۔ وہ دروازے کے سامنے سے گزری تو بہت شفقت، بڑی اپنائیت سے صاحب سلامت کرتی، حافظ کو زیرِ لب دعا دیتی گزر گئی۔

"یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ سب لوگ جو اب میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے ہیں، مجھے سلام کرتے اور دعا دیتے ہیں، کچھ ہی دیر پہلے میرے لیے ـــ اور ایک دوسرے کے لیے بھی ـــ دشمنوں سے بدتر تھے۔ کینے اور کدورت اور حددرجہ طیش اور غضب ناکی سے دیکھتے تھے اور خوں خوار درندوں کی طرح دہاڑتے گرجتے تھے، اور اب دیکھو کیسی اپنائیت اور مہر و محبت سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی مہربانیاں اور صلہ رحمی کرتے اپنے اپنے کمروں کی طرف جا رہے ہیں۔"

مطبخ کا ایک فربہ اندام خادم برآمدے سے گزرتا ہوا ٹھٹھکا، پھر ادب کے ساتھ حافظ شکر اللہ

کی طرف بڑھا اور بولا، "غلام نے تازہ یخنی تیار کی ہے۔ آغا کا حکم ہو تو پیش کروں؟ انشاء اللہ پسند کیجیے گا۔"

حافظ گینڈے نے بے مہری سے اس مسخرے کی طرف دیکھا۔ "لو بھلا گیدی یخنی کو پوچھتا ہے! آدھی رات کو بد نصیبوں نے سوتے سے جگا دیا اور اب یہ شخص یخنی سے میری تواضع کرنا چاہتا ہے۔ دھت!" حافظ نے بستر سے اٹھ کر اس مسخرے فربہ اندام باورچی کے چوڑے چکلے چہرے پر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

مگر سرائے کے اس آخری اہل کار کا تپاک دیکھ کر حافظ شکراللہ خان گینڈے کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پھر کپڑے تبدیل کیے اور سونے کی کوشش کی، اور بوالعجبی! اسے نیند بھی آ گئی۔

صبح خادموں، منصرموں کا رویّہ ایسا ہی پُرتپاک کاروباری تھا۔ دن نکلنے پر انھوں نے خبر دی تھی کہ گرم پانی رکھ دیا گیا ہے؛ آغا حمام کر لیں۔ پھر لُوزیات اور شربت اور غذائیں اور قہوہ جس تواضع اور کثرت سے پیش کیا گیا وہ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ مسافروں، مہمانوں نے باہم وہی تپاک برقرار رکھا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آدھی رات کے وقت یہ سب لوگ آوازوں سے اور اپنی چَلت پھِرت اور دھمکیوں سے ایک دوسرے کی جان کے گاہک بنے ہوے تھے۔

حافظ کو دیر ہو گئی تھی۔ آج بعد نمازِ عصر اسے مسندِ عالی برمازید کور کی رُوبکاری میں پیش ہو کر عرضی گزارنی تھی کہ وہ دربارِعام میں سلطانِ ہند حضرت شیر شاہ سُوری کی کورنش سلامی کو حاضر ہونا چاہتا ہے، کیوں کہ وہ نہ صرف سلطان کی رعایا میں سے ہے بلکہ ان کے جدّی گاؤں رودہ ری کا باشندہ بھی ہے۔

کتب خانے میں بیٹھنے کے لیے اس کے پاس دوپہر تک کا وقت پڑا تھا۔ حافظ شکراللہ خان کاغذوں کا پلندا اور قلم دان بغل میں مار، کتب خانے روانہ ہوا۔

پچھلے دن کی طرح وہ اسی دریچے کے برابر جا بیٹھا۔ اس نے اپنے مطلب کی کتابیں نکلوا کر مطالعے میں گم ہوجانا چاہا، مگر آج کا دن پچھلے دن جیسا نہ تھا۔ رہ رہ کر شکراللہ کو رات کا شوروغل یاد آ رہا تھا۔ اسے وہ دہشت اور بے چینی یاد آئی جو چھت سے اترتے ہوے اس نے سیڑھیوں پر محسوس

کی تھی۔

اپنا قلم دان اور کاغذ چھوڑ کر حافظ شکراللہ خان باہر باغ میں جا کر ٹہلنے لگا۔ کھلی ہوا میں یکسوئی بحال ہوئی تو اندر جانے کا قصد کیا۔ دیکھا، گذشتہ دن کا ملاقاتی فےرُوز کتب خانے کی طرف آ رہا ہے۔ شکراللہ خان سلام کلام کے لیے ٹھہر گیا۔ فےرُوز اصفہانی پوچھنے لگا، "فاضل! آج غور و فکر میں ہو؟ کیا مطالعے کو طبیعت نہیں کرتی؟" حافظ نے ٹالنے کو کچھ کہہ دیا۔

فےروز بولا، "تھکے ہوئے ہو؟ ... کیا رات اچھی طرح سو نہ سکے؟"

حافظ گینڈے نے پھر ٹال دیا لیکن فےرُوز کے استفسار پر رات والی پریشان کن کیفیت اسے یاد آ گئی۔ حافظ نے سوچا، چند روز اِس شہر میں اَور رہنا ہے، فےرُوز سے کسی معقول سرائے کا پتا پوچھ لیتا ہوں۔

پوچھنے پر اصفہانی نوجوان نے کئی سرایوں کے پتے نشان بتائے، ان کے کرائے اور سہولتوں کی تفصیل بیان کی۔ شکراللہ خان کے لیے ان میں سے کوئی بھی مناسب نہ تھی؛ کسی کا کرایہ زیادہ تھا، کوئی سرائے کتب خانے سے دور تھی، اور بعض پُرشور منڈیوں بازاروں کے بیچوں بیچ تھیں۔ فےرُوز جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت جہاں حافظ ٹھہرا ہوا ہے، وہاں کیا مشکل پیش آئی ہے جو وہ سرائے بدلنے کے در پے ہے۔ حافظ شکراللہ خان کو مجبوراً ساری بات بتانی پڑی۔

فےرُوز اصفہانی پوری کہانی سن کر بجائے ہمدردی جتانے کے ہنس پڑا۔ کیا بوالعجبی ہے! حافظ گینڈے پر جو گزری تھی وہی شہر میں پہلے روز فےرُوز کو بھی پیش آئی تھی۔ کہنے لگا، "مگر فاضل! قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ مجھے سرِشام ہی علم ہو گیا تھا کہ یہ مَردُوزیوں کی سرائے ہے۔ میں تو اپنا سامان اٹھا کر رات سے پہلے ہی نکل آیا تھا۔"

حافظ شکراللہ خان مردُوزی نام کی کسی جماعت سے واقف نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔ پوچھنے پر اصفہانی نے بتایا کہ صدیوں کی تعلیمات مدنیت کا بگاڑ اس فرقہ مَردُوزیاں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ کہنے لگا، "یہ تو نہیں معلوم کہ ان کا معلّم کون ہے اور مرکز کہاں ہے؛ بس اتنا جانتا ہوں کہ صاحبانِ شوکت اسے اپنے مقاصد کے حصول میں مفید اور فیض رساں پاتے ہیں، سو دارالخلافوں میں یہ مسلک خوب پھل پھول رہا ہے۔ صاحبانِ ثروت

کی دیکھا دیکھی کم حیثیت لوگ بلکہ اب تو شاگرد پیشہ بھی اس جماعت میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔"

شکر اللہ خان گینڈا اس فرقے کی عمومی فکر سمجھنا چاہتا تھا، تو اصفہانی نے بیان کیا کہ مَرُدوزی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ آدمی کا مزاج محبت اور غصے، اور عقیدت اور نفرت سے مل کر تشکیل پاتا ہے، مگر اپنی تہذیب اور تعلیم اور تمدنی تقاضوں سے مجبور ہو کے انسان اپنا غصہ اور اپنی نفرت ظاہر نہیں ہونے دیتا، جس سے فتور واقع ہوتا ہے اور نفرت مزاج کی سطح سے نیچے جا کر سڑنے لگتی ہے۔ پھر یہ آدمی کے اندر ہی پلتی بڑھتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ غصے سے پاک ہو چکا اور اس کے مزاج کی ساخت غصے اور نفرت کے بغیر ممکن ہو گئی۔

مَرُدوزی کہتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا۔ غصہ آدمی میں ساری زندگی موجود، مگر پوشیدہ رہتا ہے؛ تاہم اگر دن کے خاتمے پر اسے ظاہر ہونے، یعنی خارج ہونے، کا موقع دیا جائے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ آدمی غصے اور نفرت سے پوری طرح خالی ہو جائے گا۔ مَرُدوزی اس کیفیت کو تکمیل کا نام دیتے ہیں۔

"اس لیے،" فیرُوز کہنے لگا، "اسی تکمیل کو پانے کے لیے، مَرُدوزی فرقے کا ہر فرد رات کو حلقے میں بیٹھتا ہے اور چیخ پکار کر کے اپنی دن بھر کی کمائی ہوئی نفرت اور دن بھر کا پالا ہوا غصہ خارج کر دیتا ہے، اور باقی رات اور اگلے تمام دن کے لیے ایک مہذّب، مکمل، مہر و محبت سے بھرا ہوا انسان بن جاتا ہے۔"

فیرُوز اصفہانی نے ضمناً یہ بھی اطلاع دی کہ سلطان شیر شاہ کا وزیرِ دربار، امیر بَرمازید کور مَرُدوزی ہے۔

"انا للہ و انا الیہ راجعون،" شکر اللہ خان نے جو تفاصیل سے بیزار ہو جایا کرتا تھا، فیرُوز کا طولانی بیان سن کر کہا، "انا للہ و انا الیہ راجعون! تو ان قُرَم ساقوں نے غصے اور نفرت جیسے قیمتی انسانی جوہروں کو ضائع کرنے کی سبیل بھی آخر نکال ہی لی۔"

اور یہاں حافظ شکر اللہ خان گینڈے کے ناتمام سفر کی روداد ختم ہوتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ حافظ شکر اللہ خان گینڈا اپنی بات اجمالاً ہی کہنا پسند کرتا تھا۔

وہ صاحبِ علم اور کم گو آدمی تھا، شاید اسی لیے تفاصیل سے حذر کرتا اور وقت ضائع کرنے

سے الجھتا تھا۔

اس نے آدمی میں موجود غصّے کے اس طرح بالالتزام ضائع کیے جانے پر کوئی نوحہ نہیں لکھا؛ اگرچہ گاؤں لوٹنے سے پہلے کاغذ کے ایک پُرزے پر وزیرِدربار، مسندِعالی، امیر برمازید کور کے نام چند سطور اس انداز کی لکھیں کہ انھیں یہاں نقل نہیں کیا جاسکتا۔

رخصت ہوتے ہوئے کتب خانے کی سیڑھیوں پر حافظ شکراللہ خان گینڈے نے زربفت کا وہ پارچہ فےرُوز اصفہانی کو تحفے میں پیش کردیا جس پارچے میں روہ ری، کوہِ سلیمان سے مٹی باندھ کر لائی گئی تھی۔ سُوریوں کے باڑے کی مٹی حافظ شکراللہ نے برف جیسے سفید پھولوں کے اس تختے میں جھاڑدی جو سیڑھیوں سے شروع ہو کر کتب خانے کے احاطے کی دیوار تک پہاڑی چشمے کی طرح جھاگ اُڑاتا چلا گیا تھا۔

اگلی صبح جب فےرُوز اصفہانی کتب خانے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اچانک پھولوں کے تختے پر اس کی نظر پڑی۔ جیسے ایک جسمانی ضرب نے اسے کھڑے سے سیڑھیوں ہی پر بٹھادیا۔

کل تک جس تختے میں برف کی طرح سفید پھول کھِلے تھے آج اس میں انگارہ سے لال گلاب دہک رہے تھے۔

سے لُون

کوٹھے پر پلے ہوئے اس لاوارث کو ــــ مجھے ــــ آج دن تک خبر نہیں ہے کہ باپ کیا ہوتا ہے، ماں کیا ہوتی ہے۔

میری "مائی باپ" سمجھو تو، مالکن کہو تو، بس وہی لاجی بائی تھیں۔

یا پھر اپنے بڈّا استاد بھاول پوری تھے، مگر استاد کی بات میں بعد میں بتاؤں گا۔

لاجی بائی جب بہت لاڈ کرتیں تو مجھے "بچہ" کہہ کے پکارتی تھیں، "میرا بچہ!" مگر مجھے معلوم ہے میں ان کا نہیں تھا۔ لاجی کا لے پالک بلکہ سمجھو بے تنخواہ کا نوکر تھا مَیں۔ اور لڑکیوں کے لیے کبھی تو میں لاڈ کا لڈّو اور کبھی کھیل تماشا تھا۔ سبھی آتے جاتے میرے سر پر چپت لگایا کرتی تھیں، سالی رنڈیاں!

مگر لاجی کے سوا کوئی دوسرا مجھے گالی نہیں نکال سکتا تھا۔

فلیٹ پر آنے والے مہمانوں، ملاقاتیوں سے میں بات نہیں کرتا تھا۔ نہ وہ مجھ سے بات کرتے تھے۔ کسی کام کو بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ نیچے سے پان سگریٹ ٹھنڈا گرم ملباری ہوٹل کا لڑکا لاتا تھا۔ اٹھنی چونی روپیا ٹپ بھی اس کو ملتا تھا۔

لاجی صاحب مجھے کبھی دس پندرہ روپیا خرچ کرنے کو دیتی تھیں جو میں بڈّا استاد کے پاس جمع کرا دیا کرتا تھا۔ یہ پیسے میرے اپنے تھے۔ آدمی کے پاس کچھ تو اپنا ہونا چاہیے۔ جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو وہ آدمی کس کام کا۔

میرا بہت جی چاہتا تھا کہ میں اس پیسے سے استاد بڈا پہلوان کے لیے، چھوٹی موٹی سہی، کوئی چیز خریدوں، سب کے سامنے انھیں دوں جیسے ان کے پٹھے ان کے لیے کبھی عطر، سرمہ، رومال لاتے تھے۔

استاد ہم لوگوں پر بڑا پیسا خرچ کرتے تھے۔

استاد کے لیے ایک بار میں عطر کی شیشی لے گیا تھا مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بولتے تھے، "نہیں اوئے، تیرے سے نہیں لوں گا۔"

میں نے پوچھا تھا، کیوں، تو کچھ سوچ کے بولے تھے، "تو چھوٹا بہت ہے، اس لیے۔" مگر چھوٹے تو ان کے بہت سے پٹھے تھے۔

میں چپ ہو گیا تھا۔ میں ان کا پٹھا نہیں تھا شاید اس لیے استاد نے مجھ سے عطر نہیں لیا ہو گا۔

مگر کسی نے ـــــ خبر نہیں کس نے ـــــ ایک مرتبہ مجھ سے کہا، استاد تیرے پیسے کو حلال کا پیسا نہیں سمجھتے۔ کوٹھے کی کمائی ہے اس لیے پرہیز کرتے ہیں۔

"کیوں بھلا؟" میں نے بات کہنے والے سے بہت حجت کی تھی، "کیوں جی؟ میری کمائی کوٹھے کی کمائی کیسے ہوئی؟ میں گھر کا سب کام کرتا ہوں۔ کیا یہ محنت کی کمائی نہیں ہے؟ لاجی صاحب جو کبھی دس، کبھی پندرہ روپے دیتی ہیں، کیا وہ میری تنخواہ نہیں ہوتی؟"

ایک بار صفائی کرتے ہوے مجھے دری کے نیچے سے پچاس کا نوٹ ملا۔ مجھے معلوم تھا یہ نوٹ لاجی صاحب کا یا لڑکیوں میں سے کسی کا نہیں ہے۔ میں نے وہ سنبھال کے رکھ لیا، سوچ لیا یہ بھی استاد کے پاس جمع کرا دوں گا۔

ہاں، یہ تو میں نے بتایا نہیں کہ بڈا پہلوان کی لکڑی کی ٹال تھی۔ ہماری بلڈنگوں کے مین بازار میں جس قسم کے پہلوان ٹہلتے پھرتے تھے، بڈا استاد ویسے نہیں تھے۔ برابر کے محلے میں ان کی یہ ٹال تھی اور بکرا منڈی میں ان کا گھر اور اکھاڑا تھا۔ وہ دس بیس شاگردوں کو زور کراتے تھے۔ یہاں اور خود ان کے محلے میں بڈا پہلوان کو بڈا استاد کہا جاتا تھا۔ انھیں پہلوان کے بجاے استاد کہا جانا یوں بھی صحیح تھا کیوں کہ گردنوں میں کالے دھاگے اور تعویذ ڈالے چار چھ اور بھی پہلوان

ہماری بلڈنگوں کے آس پاس موڑھے بچھائے بیٹھے رہتے تھے یا دکانوں کے تھڑوں پر اپنے چمچوں سے مالش کرایا کرتے تھے۔ جیسے رشیدا پہلوان، بےلُو پہلوان وغیرہ۔ یہ لوگ یا تو پولیس کے ٹاوٹ تھے یا اپنے ہاتھ پیروں کے بل پر پاڑے کی عورتوں، ان کے دلالوں سے بھتا وصول کرتے تھے۔

ہمارے پاڑے سے بڈا استاد کا تعلق صرف جلانے والی لکڑی کا تھا، سوئی گیس اس وقت تک آئی نہیں تھی۔ ہماری سڑک کے زیادہ تر دکان دار مٹی کے تیل والے چولھے اور اسٹوو جلاتے تھے۔ تنور ہوٹل اور نہاری ہوٹل والے البتہ ٹال سے لکڑی منگاتے تھے۔ ان میں سے کسی پر اگر لمبی رقم چڑھ جاتی تو بھی بڈا استاد نہ خود ادھر وصولی کے لیے آتے تھے نہ اپنے کسی شاگرد کو بھیجتے تھے۔ کسی وکیل کا ایک مرگھلا سا منشی بڈا استاد کی رقمیں وصولنے ادھر آتا تھا۔ استاد اسے جو محنتانہ دیتے تھے وہ بل چڑھانے والے گاہکوں کے حساب میں ٹانک لیتے تھے ــــ اصول کی بات تھی۔

میں نے شاید ابھی یہ بھی نہیں بتایا کہ لوگ بڈا استاد کے پاس امانتیں رکھایا کرتے تھے جو وہ اپنی لال کتاب میں چڑھا لیا کرتے تھے۔ اکثر رقمیں، زیور رکھوانے والے بڈا استاد کے شاگردوں کے رشتے دار تھے، ان میں بھی زیادہ تر عورتیں تھیں۔ ہمارے پاڑے کی عورتیں اول تو مال اپنے ڈب میں رکھنا پسند کرتی تھیں، دوسرے اگر کوئی چاہتی بھی تو استاد کی ٹال پر قدم نہیں رکھ سکتی تھی، رقمیں زیور رکھوانا تو دور کی بات ہے۔ بڈا استاد گانے بجانے والی عورتوں سے پردہ کرتے تھے۔ سڑک پر بھی بے آواز دیے اگر کوئی سامنے آجاتی تو گالیاں کھاتی تھی۔

اور گالیاں استاد کی ایسی ہوتی تھیں کہ کیا کسی نے سنی ہوں گی۔ اونچی آواز سے اپنی بہاولپوری میں استاد شروع ہوجاتے تو بہت دیر میں رکتے تھے۔

بڈا استاد کی لال کتاب میں میرے نام کا بھی کھاتا کھُلا ہوا تھا۔ محلے کے لوگ مجھے جاوید لاجی والا کے نام سے پہچانتے تھے۔ استاد نے اپنی کتاب میں میرا نام جاوید اصیل لکھا ہوا تھا۔ سب سے ہنس کے کہتے تھے کہ یہ چھوکرا لڑاکے مرغ کی طرح سینہ تان کے چلتا ہے اس کر کے اسے اصیل کہتا ہوں ــــ اصیل مرغ۔ مگر اصل وجہ میں جانتا تھا۔ ایک بار کسی نے مجھے استاد کے سامنے لاجی والا جاوید کہا تھا تو استاد ایک دم بگڑ گئے تھے، بولتے تھے، "چھوکرا کسی بھلے گھر کا ہے اور تم اسے رنڈی کے نام سے جوڑ رہے ہو۔ لاجی باجی سے اس کا کیا ناتا۔ نصیبوں کا پھیر ہے جو ایک اصیل چھوکرا

کوٹھے پر پڑا ہوا ہے۔ اب میرے سامنے کسی نے اسے لاجی والا کہا تو دیکھنا مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

استاد کی تجوری میں میرے نام پر ایک کم دو سو چالیس روپے جمع تھے۔

اب جو دری کے نیچے سے پچاس روپے ملے تھے تو میں نے حساب لگایا کہ میرے پاس ایک کم دو سو نوے روپے ہو گئے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔

میں نے سوچا بس گیارہ روپے اور ملاؤں گا تو تین سو کی رقم ہو جائے گی۔

دوسری صبح میں بازار کرنے نکلا تو پہلے سیدھا استاد کی ٹال پر پہنچا، ہاتھ اٹھا کے دور سے انھیں سلام کیا۔ استاد اونچی آواز میں بولے، "آیا اوئے اصیلا آیا بئی۔"

میں نوٹ مٹھی میں دبا کے لے گیا تھا، استاد کے حوالے کر دیا کہ لیجیے میرے حساب میں ٹانک لیجیے۔ انھوں نے لال کتاب نکالی، میرے پیسے لکھ لیے، نوٹ اندر تجوری میں رکھ آئے۔ مجھ سے بولے، "بیٹھ۔"

میں بیٹھ گیا تو کہنے لگے، "جے کوئی کام نہیں ہووے تو اِدھر ہی بیٹھ۔ میں بال کٹا کے، خط بنوا کے آدھے گھنٹے میں آ جاتا ہوں۔"

ٹال پر چاروں آدمی لکڑی پھاڑ رہے تھے، میرے یا کسی کے بیٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ دو باتیں قاعدے کے خلاف ہو رہی تھیں۔ ایک تو استاد کام کے وقت ٹال چھوڑ کے کہیں جاتے نہیں تھے، دوسرے بال کاٹنے، خط بنانے کے لیے موجو حجام استاد کے پاس خود آتا تھا۔

میں نے کہا، "استاد! آپ بیٹھو۔ میں موجو کو بلا لاتا ہوں۔"

کہنے لگے، "نہیں۔ موجو کو نہیں۔"

میں نے کہا، "پھر جس کو بولو۔ آپ کیوں جا رہے ہو؟ جس کا کام ہے وہ ادھر ہی آئے گا۔"

دھیرے سے کہنے لگے، "ہاں۔ جس کا کام ہے وہ آپ ہی جا رہا ہے۔" یہ کہہ کے وہ حاجیوں والا پیلا رومال کندھے پر ڈال ٹال سے نکلے اور اس گلی میں مڑ گئے جو ہماری بلڈنگوں والی

سڑک سے جا ملتی تھی۔

استاد ہدایت اللہ پہلوان گانے بجانے والیوں کی سڑک پر جا رہے تھے۔

یہ تیسری انہونی بات ایسی ہو رہی تھی جو اتنے برسوں میں کسی نے کبھی ہوتے نہیں دیکھی تھی...

ٹال کے تینوں مزدور ہاتھ روک کے کھڑے ہو گئے مگر سا گر دادا، جو ٹال کے سب سے پرانے آدمی تھے، اسی طرح لکڑیاں پھاڑتے رہے۔ دوسرے آدمی چپ کھڑے استاد کو گلی میں گم ہوتے دیکھ رہے تھے۔

مجھ سے خاموش نہ رہا گیا، میں نے کہا، "سا گر دادا! یہ استاد کہاں جا رہے ہیں؟"

انھوں نے اسی طرح کلہاڑا چلاتے ہوئے کہہ دیا، "خط بنوانے۔"

"وہ تو پتا ہے۔ پر ہماری والی سڑک پر استاد کبھی آج دن تک گئے نہیں۔"

سا گر دادا نے کلہاڑا روک لیا، بولے، "اب جایا کریں گے۔"

"کیوں؟"

"ادھر ان کے پیر نے 'سے لون' کھول لیا ہے۔"

ان کا پیر کون؟ میں استاد کے کسی پیر کو نہیں جانتا تھا اور پیر کے 'سے لون' کھولنے والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی، میں نے سا گر دادا سے پوچھ لی۔

کہنے لگے، "مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے وئی؟ ابھی آ جائیں گے، استاد سے ہی پوچھ لینا۔"

یہ سا گر دادا کی پرانی ترکیب تھی۔ جتنا بتا رہے تھے انھیں اس سے زیادہ معلوم تھا۔ چاہتے تھے میں خوشامد کر کے پوچھوں پھر وہ بتائیں۔ خیر، میں نے خوشامد کی تو انھوں نے پیر کے 'سے لون' کا پورا قصہ بتایا۔

کہنے لگے کہ بڑا استاد کے مرشد کسی دوسرے شہر سے یہاں آ گئے ہیں۔ فقیر ہیں، اپنی روزی خود اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتے ہیں۔ دوسرے شہر میں، اور اس سے پہلے کئی شہروں میں، ان کے بال کاٹنے، خط بنانے کے سے لون تھے۔ سردیوں میں حمام بھی گرم کرتے تھے۔ مرشد اپنے سے لون میں کوئی نوکر نہیں رکھتے۔ خود حجام کا سب کام کرتے ہیں۔ ان کے مریدوں

میں سے جس کا جی چاہتا ہے، بار بر کا کام سیکھ کے سے لون میں آ بیٹھتا ہے اور مرشد کا ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔ گاہک جو دے دیتا ہے، لے لیتے ہیں۔ وہ پیسے دینا بھول جائے یا ویسے ہی نہ دے تو مانگتے نہیں۔ جو مرید جتنا کمائے وہ اسی کا ہوتا ہے۔ مرشد کو جو آمدنی ہوتی ہے اس سے وہ اپنے روٹی کپڑے کرائے کا انتظام کرتے ہیں۔ نون، تیل، لکڑی، آٹا اپنا خرید کے لاتے ہیں۔ راشن ختم ہو جائے اور کمائی نہ ہو تو روزے پر روزہ رکھ لیتے ہیں۔ جس روز پیسے زیادہ آ جائیں اس روز اپنی روٹی لانے سے پہلے فالتو پیسوں کے بتاشے خرید کے بچوں کو بانٹنے نکل جاتے ہیں اور جب تک بتاشے ختم نہیں ہو جاتے واپس نہیں آتے، چاہے رات کے بارہ بج جائیں۔ مرید بھی سارے اپنی کمائی سے اپنی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں۔ مگر مرید لوگ کمایا ہوا باقی کا روپیا سے لون میں لگا دیتے ہیں۔

ساگردادا نے ایک اور خاص بات بتائی، کہنے لگے، "مرشد صاحب اپنا سے لون ہمیشہ طوائفوں کے بازار میں کھولتے ہیں، اس لیے ان کے گاہکوں میں زیادہ تر تماشبین ہوتے ہیں۔ مرشد انھیں بنا سنوار کے، عطر، خوشبو لگا کے رخصت کرتے ہیں۔ باجے گاجے، تماش بینی، حرام پائی میں رات گزار کے جو گاہک سے لون پر واپس آتا ہے مرشد جی جان سے اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے لیے پانی گرم کرتے ہیں، سر مالش کرتے، بدن دباتے اور اپنے ہاتھوں سے نہلاتے، پیٹھ ملتے ہیں۔"

پھر کہنے لگے کہ مریدوں میں کچھ تو اچھے پیسے والے لوگ ہیں اس لیے اُن کے مرشد ایک کے بعد جس بھی دوسرے شہر کے چکلے میں دکان خریدنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ لوگ پچھلا سے لون بیچ کے نئی جگہ خرید دیتے ہیں۔ تو بس، ایک شہر سے دوسرے شہر یہی سلسلہ چل رہا ہے۔

ساگردادا نے جو یہ ساری باتیں بتائیں، اس وقت پوری طرح پلّے نہ پڑیں لیکن میں سوچ میں پڑ گیا۔ سولہا سترہ برس کی عمر تو ایسی ہوتی ہے کہ مرشد صاحب کا یہ حال سن کے ہنسی بھی آئی۔ اچھے مرشد ہیں، تماش بینوں، رنڈی بازوں کی ایسے خدمت کر رہے ہیں جیسے خدا کے خاص بندوں کی خدمت کی جاتی ہے۔

مگر میں نہ تو ہنسا، نہ دادا ساگر کے سامنے مرشد کا مذاق اڑانے والی کوئی بات کہی۔ میں نے سوچا، بڈّا استاد کو معلوم ہو گا تو وہ خفا ہوں گے، گالیاں دیں گے، ہو سکتا ہے ہاتھ چھوڑ بیٹھیں۔

کوئی گھنٹے بھر بعد بڑا استاد واپس آئے تو چپ چپ تھے، خط بھی نہیں بنا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا، "استاد! خط نہیں بنوایا؟"

بولے، "ہاں۔ موقع نہیں ملا۔"

میں نے پوچھا، "موقع استاد؟ کیا بھیڑ زیادہ تھی؟"

بولے، "نہیں۔۔۔ بس موقع۔۔۔ ہاں اوئے برخوردار! تجھ سے ایک بات پوچھنا تھی۔ اچھا ہوا تُو گیا نہیں۔"

میں نے کہا، "استاد! جاتا کیسے۔ آپ بیٹھنے کو جو کہہ گئے تھے۔"

بولے، "اچھا؟ میں کہہ گیا تھا؟ خیر۔۔۔ تیرے سے یہ پوچھنا تھا۔۔۔ تو یہ بتا پتر! پچاس روپے تیرے پاس کدھر سے آئے؟"

میں نے کہا، "بس۔ آ گئے۔"

استاد پیار سے بولے، "بیٹا! کچھ پتا تو چلے کدھر سے آئے؟"

میں ٹالنے کو ہنسنے لگا۔ وہ بگڑ گئے، بولے، "جے بتائے گا نہیں کہ کدھر سے آئے پیسے تو اچھا نہیں ہوگا۔ سمجھ لے۔"

استاد خفا ہو گئے تھے۔ جان بچانے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے بتا دیا کہ دری صاف کرتے ہوئے ملے ہیں، مگر یہ نہ لاجی کے ہیں، نہ لڑکیوں کے۔ کسی کے نہیں ہیں۔

کڑوے پن سے بولے، "کسی تماشبین کے گرے ہوں گے؟"

میں نے کہا، "مجھے کیا پتا، میں نے تو کسی کی جیب سے نہیں نکالے۔۔۔ نہ کسی نے میرے ہاتھ پر رکھے۔"

کہنے لگے، "سوچ لے۔ کسی آتے جاتے نے خوش ہو کے تو نہیں دیے تجھے؟"

میں نے کہا، "خدا کا واسطہ ہے استاد! آپ کو پتا ہے، لاجی صاحب میرے کو بلڈنگ کے ان سب چکروں سے دور رکھتی ہیں۔"

چمک کے بولے، "ہاں اوئے تیری لاجی صاحب کو..." استاد نے اپنی بہاولپوری میں لاجی کے لیے ایک گرجتی ہوئی گفتار سنائی۔ پھر کہنے لگے، "ٹھیک ہے پُتر! ٹھیک ہے مگر یہ سمجھ لے

زہر ہوتی ہے یہ حرام کمائی، ہاں۔"

بڈا استاد کی بہت سی تقریریں حرام کمائی اور زہر والی بات پر ختم ہوتی تھیں۔

استاد کا شک شبہ دور ہو چکا تھا۔ مجھے بھی اطمینان ہو گیا۔ وہ اداسی سے پگڑی اتار اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

خط نہیں بنوا پائے تو شاید اس کی پریشانی تھی۔

بڈا استاد مجھے اپنے پٹھوں کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ میرے اٹھارہ برس کے ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کہتے تھے، "جیسے تیسے یہ تھوڑا وقت ٹال لے اس رنڈی کے ساتھ، پھر تجھے ٹال پر بلا لوں گا۔ کیوں کہ بئی اٹھارہ برس میں بندے کے باڑ مضبوط ہو جاتے ہیں، پھر چاہے کلہاڑا چلاؤ، آرا کھینچو، کچھ بھی کر لو، بدن کی بڑھوتری کو نقصان نہیں پہنچتا۔"

ان کا جی تو بہت کرتا تھا مگر اس وقت اپنی ٹال پہ وہ مجھے نوکری نہیں دے سکتے تھے۔ میں لکڑی پھاڑ لیتا، آرے کھینچ لیتا، اتنی جان تو مجھ میں تھی، پر ان کا کہنا تھا کہ کچے باڑ کے لڑکے کو کلہاڑا تھمانا جیسے ہرن کے بچے کو تانگے میں جوتنا ہے۔ "نا بئی نا۔"

لاجی صاحب کو میرے ٹال پر جانے آنے کا معلوم تھا۔ بڈا استاد سے میرا ملنا جلنا انھیں ناپسند نہیں تھا۔ مجھے کبھی روکا تو نہیں لاجی نے مگر میرے سامنے بڈا استاد کو موقع بے موقع کوسنے یا گالی نکالنے سے وہ باز بھی نہیں آتی تھیں۔

کوٹھوں پر زیادہ گالی وہی چلتی ہے جس میں کسی مرد کے مرد نہ ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ لاجی کو یقین تھا کہ استاد ہدایت اللہ بڈا پہلوان بہاولپوری کے ساتھ بھی یہی قصہ ہے، ورنہ اس سرکٹ کی عورتوں کو وہ اتنی گالیاں کیوں نکالتے۔

استاد کے گھر ایک ہی بیٹا پیدا ہوا تھا جو بارھویں برس میں تیز بخار میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ لاجی کہتی تھیں، ایک مر گیا، دوسرا نہ ہو سکا، اس کی وجہ بھی وہی تھی جس کا طعنہ وہ گالی کی شکل میں دیتی تھیں۔

ہمارے فلیٹ والی ناجو بڑی مُنہ پھٹ تھی۔ وہ جب بھی لاجی صاحب سے ناراض ہوتی اور لکڑی، ایندھن اور ٹال کا یا استاد کا ذکر نکل آتا تو ناجو کہتی تھی، "بھری جوانی میں لاجی کا دل آ گیا تھا

بڈّا بابا پر۔۔۔ پر وہ قلندری پہلوان ہیں، لنگوٹ کے پکّے، لاجی صاحب کے ساتھ کا ہے کو مُنہ کالا کرتے۔ بس جبھی سے لاجی بڈّا بابا کو گالیاں نکال رہی ہے۔ آج دن تک چپ نہیں ہوئی۔"

یہ بات ایک بار لاجی نے بھی سن لی۔ جوتی لے کے اٹھی تھیں لیکن ناجو اپنے فلیٹ سے نکل کے ہنستی ہوئی ملتانی بائی کے فلیٹ میں جا گھسی۔ لاجی صاحب نے دو دن بات نہیں کی اس سے۔ سب کو پتا تھا ناجو بکواس کرتی ہے۔ لاجی صاحب پیسے کے سوا کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوئی تھیں۔

عاشقی پر خیال آیا۔ ہمارے فلیٹ میں عشق عاشقی کا بہت چرچا ہوتا تھا۔ بالکل ایسے جیسے سبزی منڈی میں آلو گوبھی کی بات ہوتی ہے۔

دوسری جگہ کا تو پتا نہیں، اس فلیٹ کی سب لڑکیوں نے ایک نہ ایک پکّا عاشق لگا رکھا تھا۔ پکّے عاشقوں کو ان وقتی مہمانوں سے دور رکھا جاتا تھا جو دوسرے شہروں، قصبوں سے آ کر دل لگی، تماش بینی میں کچھ وقت گزار کے چلے جاتے تھے۔ پھر اگر انھیں اچھی سروس ملی ہوتی تو وہ دوبارہ بھی آتے تھے۔

عارضی مہمانوں کا ایک جتھا اپنے شہر کا بھی ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہلکے تماش بین ہوتے تھے اس لیے کوٹھے کوٹھے گھوم کے بری چگ مویشیوں کی طرح تازہ مال پر مُنہ مار کے آگے بڑھ جاتے تھے مگر کوٹھوں پر ان کی عزت کوئی نہیں کرتا تھا۔

ناجو کا پکّا عاشق ایک کالا کلوٹا گوانی "ڈفونا صاحب" تھا۔ ڈفونے کا نام تو کچھ اور تھا، فلیٹ کی لڑکیوں نے اسے اس نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

جارج ڈفونا انگریزوں کے زمانے میں ایر فورس کے ہوائی اڈے پر افسروں کی میس میں آبدار کی نوکری کرتا تھا۔ اس کا کام بس افسروں کو شراب پلانا تھا۔ میزوں پر برف کے تھرموس، لیموں کی باریک باریک قاشیں اور شراب کے ساتھ لی جانے والی گزک لگانے کا کام ڈفونا کے دوسرے ماتحت کرتے تھے۔ جارج ڈفونا تو صرف افسروں کو "گڈ ایوننگ سر" کہنے اور ان کی شراب سامنے رکھ کر مسکراتے ہوئے میز سے ہٹ جانے تک کا پابند تھا۔ خالی گلاس ہٹانا بالکل ہی نئے ماتحت کی ذمے داری تھی۔ ہاں، بچی ہوئی شراب سنبھالنے یا نئی سِیل بند بوتلوں کی ہیر پھیر

ڈفونے نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ وہ بچی ہوئی شراب میں سے اپنے اور ماتحتوں کے حصے لگاتا تھا۔ شیر کا حصہ اپنے لیے رکھتا تھا — اصول کی بات ہے۔

چرائی ہوئی سیل بند بوتلوں کو وہ خاص موقعوں کے لیے اور اپنے خاص دوستوں کے لیے سنبھال کے رکھتا تھا۔ لاجی صاحب کو کرسمس کی ایک سیل بند باٹلی ضرور پیش کی جاتی تھی۔

ڈفونے نے ناجو کو شراب پر لگانے کی بہت کوشش کی تھی۔ کئی برس تک، وہ جب بھی آتا آدھے گھنٹے، "بے بی کم آن — کم آن بے بی" کی رٹ لگا کے ناجو کو پینے پر آمادہ کرتا مگر ناجو کہتی تھی، "میں کڑوی چیز نہیں پیتی۔" ڈفونا ہنستا تھا اور کہتا تھا، "کروا کیڈٹر ہے بے بی سوئیٹ — یہ تو بمبئی کا مافک ہے، بائی گاڈبی کے تو ڈیکھو تم۔"

انگریزوں کے جانے کے بعد بھی برسوں آفیسر میس میں بار قائم رہی اور جارج ڈفونا بوتلیں کھول کھول کے، الٹا سیدھا ناپ ناپ کے پیگ بناتا رہا پھر موقع ملا تو وہ کسی ہوائی کمپنی میں گھس گیا۔ پیگوں، باٹلیوں کی جگہ جم کے اب دوسرے ہی ہیر پھیر کرنے لگا۔ اس نے ایک لمبی سی گاڑی خرید لی اور اپنی بیوی کو بار بار گوآ بھیجنے لگا۔

ڈفونے صاحب کی لمبی شیورلے گاڑی میں ہم لوگ کئی دفعہ سمندر کی سیر کو جا چکے تھے۔ یہ سیریں زیادہ تر سردیوں میں ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں ڈفونے کی بیوی کرسمس کی لمبی چھٹیاں گوآ میں اپنے بھائی کے پاس گزارتی تھی اس لیے بہت دن تک جارج ڈفونے سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

ایک برس کرسمس پر کیا ہوا کہ ڈفونا صاحب اپنی لمبی شیورلے کی جگہ ٹیکسی میں بیٹھ کے آیا۔ میں شام کے سودے کے لیے تھیلی اٹھائے اسی وقت فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ پر آیا تھا جو میں نے دیکھا کہ ڈرائیور ڈفونے کو سہارا دے کے ٹیکسی سے اتار رہا ہے — اتار کیا رہا تھا، سمجھو کھینچ کے نکال رہا تھا۔ ڈفونے کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بوتل تھی۔ وہ اتنی پیے ہوئے تھا کہ اسے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

میں نے بڑھ کے کچھ مدد کرنا چاہا تو ٹیکسی والا بولا، "یارا، اس مصیبت کی اولاد کو بٹھا کے پشیمان ہو گیا ہوں۔ تیرے کو کچھ پتا ہے ادھر اس کا وارث کون ہے؟"

مجھے ٹیکسی والے کی بات پر ہنسی آ گئی تو جارج ڈفونا نے نہ معلوم کیوں آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھا اور پہچان کر بولا، "بے جویڈ مائی بوائے، تم آ گیا ئے؟"

ٹیکسی والے کے چہرے پر رونق آ گئی۔ پوچھنے لگا، "تم اس کو جانتا ہے؟"

میں نے کہا، ہاں تو وہ بولا، "اس کا جیب میں سے بارہ روپیا چار آنہ نکال کے میرے کو دیو۔ میں خدا کا شکر کر کے ادھر سے جائے۔"

میں نے پوچھا، "لالہ! شکر کس بات کا؟"

بولا، "ہاں نا۔ شکر کیوں نہیں کرے گا؟ شکر کرتا ہے اس جنجال نے میرا ٹیکسی میں اُلٹی ٹلٹی یا دوسرا کوئی مصیبت نہیں کیا۔"

ڈفونا جتنی دیر بجلی کے کھمبے سے ٹکا لہراتا رہا میں نے اس کی جیبوں میں اس کا بٹوا تلاش کیا، ٹیکسی والے لالہ کو کرایہ دیا۔

ڈفونے کے پرس میں سو سو پچاس پچاس کے نوٹ تھے یا دس اور ایک کا نوٹ۔ کل گیارہ روپے کھلے تھے۔ لالہ نے کہا، "ٹھیک ہے یارا۔ یے ئی گیارہ روپیا دیو۔ ہمارا جان چھوڑو استغفر اللہ!"

ٹیکسی چلی گئی تو مجھے فکر ہوئی کہ اب ڈفونا صاحب کا کیا کروں۔ اتنی خراب حالت میں اسے فلیٹ پر لے جا کے مجھے لاجی کی گالیاں نہیں کھانی تھیں۔ میں نے اِدھراُدھر دیکھا، کوئی ہماری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ڈفونے کو کھمبے سے ٹکا ہوا لہراتا چھوڑ کر سودے کی تھیلی سنبھالے میں تو کھسک لیا۔

بیس پچیس منٹ بعد فلیٹ میں واپس آیا تو دیکھا ڈفونا لاجی کے کندھے سے لگا بھوں بھوں کر کے رو رہا ہے اور ناجو، بیلا اور گل بدن ان دونوں کو گھیرے کھڑی ہیں۔

لاجی صاحب نے بڑی مشکل سے ڈفونے کی گرفت سے اپنی گردن چھڑائی اور سانپ کی پھنکار جیسی آواز میں مجھ سے پوچھا، "کیوں رے او؟ اِس سالے بھڑوے کو فلیٹ کے دروازے پر تُو چھوڑ گیا تھا؟"

"واہ! میں کائے کو چھوڑ جاتا؟" میں نے شور کیا۔

کہنے لگیں، "خبر نہیں کون اس دلدر کو ہمارے دروازے پر پھینک گیا ہے۔۔۔ ذرا پتا کرنا

جاوید، کون تھا- میں تو ایسے لتے لوں گی، رحامی نہیں تو-"

لاجی کی اس پریشانی میں بھی گل بدن منہ چھپا کے ہنس رہی تھی- ذرا کی ذرا رک کے بولی، "جاوید! پتا ہے یہ کیوں رو رہا ہے؟ اس کی عورت ادھر گوآ میں مر گئی ہے- تار آیا ہے- ناجو کو بولتا ہے چل میرے ساتھ گوآ چل ـــ اپنی مَیری کو ڈفن کر کے آتے ہیں... کھکھ کھک کھی! مَیری اس کی عورت کا نام ہے-"

مَیری کا نام سن کے ڈفونا نے لاجی کی گردن چھوڑ گل بدن کی طرف دیکھا- روتے ہوئے بولا، "گل بڈن! میرا ساتھ تم چلو- ہم لوگ ڈفن کر کے آوے- ہاں؟"

گل بدن بولی، "دھت!"

ناجو نے قہقہہ مارا، "ہاں ہاں جارج! اسے لے جا- اسے صحیح ڈفن کرنا آتا ہے- ابھی اپنے شاجی کو ڈفن کر کے بیٹھی ہے-"

گل بدن کا مستقل عاشق جبل شاہ وڈیرو پندرہ روز پہلے مرا تھا- اس کا کمدار ہمیں آ کر خبر کر گیا تھا اور ہمارے فلیٹ سے جبل شاہ کی نشانی ایک رَلّی، ایک ناشتے دان لے کے شاہ جی کی زمینوں پر لوٹ گیا تھا-

ناجو نے جو کہا اس سے ڈفونا کو یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ گل بدن اس کے ساتھ گوآ چل سکتی ہے- مگر جب گل بدن نے دو تین بار سے اسے جا جا دفع ہو اور دَھت دُھت کیا تو وہ لاجی کے پیروں پر گر گیا- خوشامد کرنے لگا کہ گل بڈن کو میرے ساتھ گوآ بھیج ڈے میڈم! گاڈ المائٹی تیرا بیڑا پار کرے-

آدھے گھنٹے اور یہ تماشا چلتا رہا پھر لاجی صاحب نے رشیدا پہلوان کے پٹھے بھورے جابر کو بلوا لیا-

ڈفونا پرانا آدمی تھا اس لیے لاجی نے ذرا مروّت شرم کی- بھورے جابر کو سمجھا دیا کہ اسے آرام سے ٹیکسی میں لاد کے گرجے کے سامنے والے کمپاؤنڈ میں چھوڑ آئے- لاجی نے بھورے جابر کو دو طرف کا ٹیکسی کا کرایہ بھی دیا کیوں کہ ڈفونے کو جس کسی نے بھی فٹ پاتھ سے اٹھا کے ہمارے فلیٹ کے دروازے پر پہنچایا تھا اس نے اس کا پرس اور دو بوتلوں میں سے ایک اپنے لیے

رکھ لی تھی۔ ڈفو نے کی جیب میں بس ایک کالا رومال پڑا رہ گیا تھا۔

اس دن کا بھیجا ہوا جارج ڈفونا ہفتے بھر بعد لوٹ کے آیا۔ وہ آیا تو نیا سوٹ پہنے تھا اور ناجو کے لیے صدر کی سب سے بڑی دکان سے ہری ڈنڈیوں والے سفید پھولوں کا ہاتھ بھر لمبا گل دستہ لایا تھا۔ وہ لاجی، چمپا، یاسمین اور بیلا کے لیے بھی چھوٹے موٹے تحفے لایا تھا۔ گل بدن سے خفا ہوگا، اس سے بات بھی نہیں کر رہا تھا۔

ناجو سے کہنے لگا، یہ پھول گل دان میں لگا کے پانی بھر کے اپنے بستر کے پاس میز پر رکھ لینا۔

ناجو نے اسے خوش کرنے کو کہہ دیا کہ اچھا ابھی لگا دوں گی۔ پاس ہی گل بدن کھڑی تھی، پھول سونگھ کے بولی، "اچھی خوشبو ہے۔۔۔ پرانے کافور جیسی۔۔۔ اوہو! سمجھ گئی!۔۔۔ اُدھر سے بچا کے لایا ہے، مَیری کے ڈفن میں سے۔"

ناجو اور لاجی کے سوا فلیٹ کی سب عورتیں منھ دبا کے ہنس پڑیں۔ غصے میں جارج ڈفونے کی رنگت اور کالی ہو گئی۔ اس نے گل بدن کی طرف نفرت سے دیکھا اور اپنے غصے کو تھوک کی طرح اڑاتے ہوئے بولا، "فک یو! ... یو بلاڈی بچ! ... گو فک یور سیلف!" اور اٹھ کے باہر کی طرف چلا۔

اتنے غصے میں ڈفونے کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

لاجی نے ایک بار گل بدن کی طرف گھور کے دیکھا اور کہا، "رحامدی نہیں تو!" پھر جاتے ہوئے جارج ڈفونے کو وہ پیار سے پکارنے لگیں، "جارج! اے بیٹا سن تو! جارج پتّر بات تو سن۔ او برخوردار! گل بدن کی بات کا برا کیوں مناتا ہے۔ ارے مذاق کرتی ہے تجھ سے۔ جارج!"

مگر ڈفونا فلیٹ کا دروازہ آہستہ سے بند کر کے، مڑ کے دیکھے بغیر جا چکا تھا۔

تیسرے دن جارج ڈفونا ہمارے فلیٹ پر آخری بار آیا۔ وہ بہت برے حال میں آیا تھا۔ مجھے، رشیدا پہلوان اور بھورے جابر کے ساتھ مل کے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے نیچے پھینک آنا بالکل اچھا نہ لگا۔ افسوس ہوا مگر مجبوری تھی۔ وہ بری طرح پیے ہوئے تھا۔ آتے ہوئے خدا معلوم کسی گاڑی یا رکشا سے ٹکرایا تھا یا کھلے گٹر میں جا گرا تھا یا کسی کے ہاتھوں پٹا تھا جو اس کے کپڑے پھٹے ہوئے، کیچڑ میں لت پت تھے، گھٹنے کہنیاں ادھڑی ہوئی تھیں اور پیشانی اور گالوں پر کی کھال پھٹ گئی

تھی، خون رس رہا تھا۔

وہ ہمارے فلیٹ میں گھسا تھا اور اپنی عورت مَیری کا نام لے لے کے کچھ بکنے لگا تھا۔ پہلے تو سب سمجھے کہ گل بدن پر حملہ کرنے کے ارادے سے فلیٹ میں گھسا ہے مگر وہ نشے میں ایسا ٹُٹ تھا کہ گل بدن، ناجو، لاجی صاحب کسی کو نہیں پہچان پا رہا تھا۔ بس اسے تو اپنی مَیری کی تلاش تھی۔

میں نے بھورے جابر اور رشیدا پہلوان کے ساتھ مل کے اسے اٹھایا اور بلڈنگ کے سامنے فٹ پاتھ پر چھوڑ دیا۔ بھورا جابر فٹ پاتھ پر پڑے جارج کو اپنے بوٹ کی ٹھوکر مارنے کے لیے ذرا پیچھے ہٹا ہو گا۔ اس نے لات چلانے کے ارادے سے پاؤں اٹھایا تھا کہ رشیدا پہلوان نے کڑک دار آواز میں ڈانٹا، "نہیں بے!" بھورا جابر رک گیا اور منہ ہی منہ میں گالی نکالتے ہوئے جارج کے پاس سے ہٹ گیا۔

مجھے عجیب شرمندگی ہو رہی تھی جیسے جارج ڈفو نے کی اس خواری کا میں ذمے دار ہوں۔ میں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور بلڈنگ میں داخل ہونے کے لیے مڑا۔ پھر کنکھیوں سے دیکھنا چاہا کہ سڑک پر کس کس نے مجھے جارج کو ڈنڈا ڈولی کر کے فٹ پاتھ پر گراتے ہوئے دیکھا ہے۔ دن کا وقت تھا، بہت سے لوگ تھے۔

کوئی خاص چہرہ پہچان میں نہ آیا تو میں نے سر گھما کر دور تک نظر دوڑائی۔ سڑک کے دوسری طرف بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور وہ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ میں ایک ہی جھلک میں پہچان گیا۔ اس ہجوم میں بڈا استاد شامل تھے۔ میں نے سوچا ٹھیک تو ہے۔ وہ خط بنوانے، بال کٹوانے آئے ہوں گے۔ ان کے آدمی ساگر دادا نے بتایا تھا کہ ہمارے اس بازار میں اب استاد کا برابر آنا جانا رہے گا، یہاں ان کے مرشد نے سےلون کھول لیا ہے۔ مگر میں نے عجیب بات دیکھی ــــ اتنے دن ہو گئے تھے استاد نے ابھی تک خط نہیں بنوایا تھا۔ ہمیشہ پگڑی پہننے والے استاد ننگے سر تھے۔ ان کے سر کے بال بھی بڑھ گئے تھے۔ وہ ہجوم میں گھرے ہوئے اداسی کے ساتھ جارج کو فٹ پاتھ سے ہاتھوں پیروں کے بل اٹھتے دیکھ رہے تھے۔

ڈفونا کئی بار اٹھا اور گرا مگر کسی نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنے کی ہمت نہ کی۔

ہمت میں نے غلط کہا۔ کسی نے ضرورت ہی نہ سمجھی کہ کوٹھے سے پھینکے ہوئے اس کچرے کو سمیٹتا۔ سب کو معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں علاقے کا تھانے دار آئے گا، اسے اٹھا لے جائے گا اور دو چار دن کے لیے بند کر دے گا۔ رشیدا پہلوان نے تھانے میں جھگڑے کی خبر پہنچوا دی تھی۔

لوگ یہ سب دیکھ دیکھ کے اکتا چلے ہوں گے کیوں کہ میں نے دیکھا سڑک کے دوسری طرف جو بھیڑ جمع تھی اب چھٹنے لگی تھی پر میں نے دیکھا استاد بدّا بہاولپوری اس طرح سر جھکائے ڈفونے کا اٹھنا گرنا دیکھے جا رہے تھے۔ استاد کو میں نے اتنا نڈھال کبھی نہیں دیکھا تھا۔

پھر اچانک ہی عجیب بات ہوئی۔

بڑی بڑی آنکھوں والا لمبے قد کا ایک جوان آدمی جس کے لہراتے ہوئے سیاہ چمکیلے بال کندھوں تک آ رہے تھے، سفید کرتا تہ بند پہنے ننگے پاؤں سڑک پر دوڑتا ہوا آیا اور گھٹنے ٹیک جارج ڈفونے کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ جارج کے سر کے نیچے لگایا دوسرا ہاتھ اس کی مڑی تڑی ٹانگوں کے نیچے پہنچا کر ایک ہی بار کے مضبوط جھکولے میں بچے کی طرح ڈفونے کو سنبھال کر فٹ پاتھ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈفونے کو اور خود کو فٹ پاتھ سے اٹھاتے زور لگاتے ہوئے اس نے کہا تھا، "ال... لل... لا...!" پھر جیسے دوڑتا ہوا آیا تھا اسی طرح وہ اپنا بوجھ اٹھائے پرانی مارکیٹ کی طرف دوڑنے لگا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ڈفونے کو اٹھا لے جانے والے اس آدمی کے پیچھے میں چل پڑا۔ کچھ اور لوگ بھی تیز قدم مارتے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

پرانی مارکیٹ کی طرف مڑنے والی سڑک پر میرا آنا جانا کم ہی ہوتا تھا۔ ادھر کریانے کی چھ آٹھ دکانیں تھیں۔ سڑک پر ویلڈنگ اور ٹین کا کام کرنے والے بیٹھتے تھے۔ ایک لانڈری اور ساتھ میں حجام کی دکان تھی۔

سفید کپڑوں والا جوان آدمی ڈفونے کو اٹھائے حجام کی دکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بدّا استاد ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ وہ میرے برابر سے تیزی سے نکلے اور دونوں ہاتھ بڑھا کر انھوں نے جارج ڈفونے کو سنبھالنے میں جوان کی مدد کرنی چاہی، مگر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں

سے استاد کی طرف دیکھا اور گھری گونج دار آواز میں ایک بار نرمی سے مگر جم کے کہا، "نہیں!"
استاد نے ہاتھ کھینچ لیے اور جوان کو رستہ دے کر وہ ایک طرف ہاتھ باندھے خاموش کھڑے ہو گئے۔

ڈفونے کو اٹھائے ہوئے وہ جوان حجام کی دکان میں چلا گیا۔ کسی نے اندر سے دکان کے پردے کھینچ دیے۔

بلڈنگ والا ایک پڑوسی، دو تین رہ گیر، بڑا استاد اور میں دکان کے سامنے کھڑے رہ گئے۔

میں نے گھبرا کے ہمسائے کی طرف دیکھا۔

ہمسائے نے دھیرے سے کہا، "یہ مرشد ہیں۔"

اچھا؟ تو یہ بڑا استاد کے مرشد ہیں اور یہ ان کا 'سےلون' ہے۔

بڑا استاد کو کئی دن کے بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ سےلون کے سامنے نڈھال اور افسردہ کھڑا چھوڑ کے میں سر جھکائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا بلڈنگ میں آ گیا۔

دیر سے میں باہر تھا۔ ڈفونے کی وجہ سے لاجی صاحب ویسے ہی غصے میں تھیں، مجھے چوروں کی طرح گھر میں گھستے دیکھ کر شروع ہو گئیں۔ برسوں سے جو گالیاں نہیں سنی تھیں، سننا پڑیں۔

دن بھر کسی سے بات نہ کی، میں خاموشی سے اپنے کام کرتا رہا۔ شام کے لیے سودا لینے گیا تو سیدھا استاد کی ٹال کی طرف نکل گیا۔ دن میں جو کچھ دیکھا تھا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ارادہ تھا استاد سے پوچھوں گا۔ یہ سب آخر کیا ہو رہا ہے؟ مرشد صاحب ڈفونے کو اٹھا کے اپنے سےلون میں لے گئے تھے۔ استاد نے ہاتھ لگانا چاہا تھا تو مرشد نے منع کر دیا تھا۔ کیوں؟ اور یہ استاد کو کیا ہو گیا ہے؟ ہفتے چھ دن کے بڑھے ہوئے خط کے ساتھ ننگے سر، میلے ملگجے کپڑوں میں ادھر ہی گانے بجانے والیوں کے بازار میں دکھائی دے رہے ہیں۔ ہمیشہ کلف لگی پگڑی سر پر رہتی تھی، اب وہی پگڑی مٹ میلے سانپ کی طرح گلے سے لپٹی رہتی ہے۔ سر کے بالوں، مونچھوں کو وسمہ مہندی لگاتے تھے۔ بالوں کی جڑیں سفید نکل آئیں، انھیں پروا ہی نہیں ہے۔ استاد بیمار تو نہیں ہو گئے؟

ٹال پر پہنچا تو استاد کے نوکر اسی محنت سے کام میں لگے تھے۔ چار چھ پٹھے بھی بکرامنڈی والے اکھاڑے سے آئے ہوئے بیٹھے تھے۔ استاد نہیں تھے۔ میں نے پوچھا تو ان کے ایک پٹھے

نے مری ہوئی آواز میں کہہ دیا کہ خط بنوانے گئے ہیں۔ مطلب، وہیں اپنے مرشد کے سے لون کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں ساگر دادا کے پاس جا بیٹھا۔ وہ ریتی سے آرے کے دندانے گھس رہے تھے۔ میں نے جاتے ہی استاد کا پوچھا۔ دادا نے ایک بار نظر اٹھا کے مجھے دیکھا، بولے کچھ نہیں۔ مجھے غصہ اس بات کا تھا کہ دوسروں کو، بلکہ سبھی کو، ساری بات معلوم ہے ___ مجھے کوئی کیوں نہیں بتاتا۔

میں نے ساگر دادا سے اب کے ذرا غصے سے پوچھا۔

انھوں نے ریتی ہاتھ سے رکھ دی۔ میری طرف ذرا سا جھک کر بولے، "میں اَن پڑھ آدمی ہوں جاوید! استاد اور ان کے مرشد صاب اور مرید سارے، وئی یہ جانکار لوگ ہیں۔ پرسوں چَوتھ کتنی ہی دیر تک میں اُدھر سے لون میں بیٹھا رہا۔ مطلب یہ کہ آخر پتا تو چلے کہ بڈا استاد کو کیا پریشانی ہے؟ بیمار ہو گئے ہیں؟ کوئی ہور بات ہے؟ ... آخر پتا تو چلے۔ پر جاوید! کوئی پتا نہیں لگتا۔ استاد پہلے دن تیرے سامنے خط بنوانے سے لون کی طرف گئے تھے۔ مرشد نے دکان پر نہیں چڑھنے دیا۔ گھنٹا دو گھنٹا سڑک پر بیٹھ کے آ گئے۔ پھر دوسرے دن گئے، سارا دن بیٹھے رہے۔ مرشد صاب نے دنیا کے بال کاٹے، خط بنایا، مالش کی، ناخن لیے، مگر بڈا استاد کی طرف نظر ہی نہیں ڈالی۔ یہ سارا دن ادھری بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔ رات کو لوٹ کے یہیں ٹال پر آ کے لیٹ گئے۔ سوئے کیا ہوں گے، میری تو جب آنکھ کھلی، کروٹیں بدل رہے تھے۔ صبح بھی بکرامنڈی والے گھر نہیں گئے۔ سویرے سے پھر ادھری نمبر لگا دیا۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ اوں ہُنک! آج اتنے دن ہو گئے، یہ ئی چل ریائے۔"

میں نے پوچھا، "کھانے پینے کا کیا ہے؟"

ساگر دادا بولے، "رات میں ایک ٹیم روجن داری مجوروں کے، میرے ساتھ بیٹھ کے ایک آدھا ٹکڑ توڑ لیتے ہیں، ہور بس۔ بادام دودھ، آبجوش، لسی وسی، سب کھلائیاں پلائیاں بند ہیں۔"

استاد کا ایک پٹھا میرے برابر آ کے بیٹھ گیا تھا۔ پوچھنے لگا، "تو جاوید اصیل ہے نا؟"

میں نے کہا، "ہاں۔"

بولا، "استاد بڑا ذکر کرتے ہیں تیرا... تو ابھی اُدھر جائے گا، سے لون کی طرف؟"

میں نے ہاں میں سر ہلایا تو وہ جھپٹ کے گیا اور استاد کے پلنگ کے سرہانے رکھی کپڑے کی ایک تھیلی اٹھا لایا، میری طرف بڑھا کے بولا، "یہ لے جانا ادھر۔ سیب ہیں۔ تیرا بڑا مان کرتے ہیں استاد۔ تُو کہے گا تو شاید... دو چار سیب کھا لیں گے۔"

میں نے کہا، "اچھا،" مگر مجھے امید نہیں تھی۔

دو منٹ اور ٹال پر بیٹھ کے میں مرشد والی حجام کی دکان پر آ گیا۔

بڈا استاد دکان کا رستہ چھوڑ کے، ہاتھ باندھے، سڑک کی طرف پیٹھ کیے کھڑے تھے۔ سے لون میں مرشد اور ان کے دو مرید گاہکوں کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ مرشد صاحب پتلا کنگھا، پتلی قینچی سنبھالے گدھا گاڑی والے شیسے کے انگریزی بال کاٹ رہے تھے۔

مرشد گاہک کی کرسی کے دائیں طرف ہوتے تو بڈا استاد اُس طرف اپنا رخ کر لیتے۔ وہ بائیں طرف آتے تو استاد ادھر کو منہ کر لیتے۔ انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا تھا نہ ہی میری طرف دیکھا تھا۔

ٹوٹے ہوئے ہار کی طرح گردن میں ملگجی پگڑی ڈالے، جھکی ہوئی او بڑھا بڑھا مونچھوں اور چھ سات روز کی کھچڑی ڈاڑھی میں استاد اپنا سایہ لگتے تھے۔ میرے حلق میں جیسے کچھ پھنسنے لگا۔ جی چاہا استاد سے لپٹ کے رونے لگوں۔ یہ وہ طرّے وال بہاولپوری پہلوان ہی نہیں تھے جنھیں میں جانتا تھا۔ یہ تو کوئی تھکا ہارا بوڑھا آدمی تھا جو بھِک منگوں کی طرح حجام کی دکان کی طرف منہ کیے خدا معلوم کس انتظار میں کھڑا تھا۔

میں نے استاد کے مرشد کی طرف دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت مرشد نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ادھر نظر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں دنیا جہان کی نرمی اور مروّت تھی۔

وہ سب کے لیے اتنے بیبے، اتنے مہربان تھے۔ تو پھر بڈا استاد پر ایسی سختی کس لیے؟

میں نے مرشد صاحب کے لیے اپنے دل میں ایک شکوہ سا، بلکہ ایک غصہ جیسا محسوس کیا۔ کوٹھے پر پلے ہوئے اس لڑکے کو ـــ مجھے ـــ آج دن تک خبر نہیں ہے کہ باپ کیا ہوتا ہے، ماں کیا ہوتی ہے۔ بس بڈا استاد مجھے باپ جیسے لگتے ہیں۔ مگر مرشد صاحب نے میرے اس باپ کو

یہ کیسا باندھ رکھا ہے۔ کیا حالت کر دی ہے استاد کی۔

میں رُندھتے ہوئے گلے کے ساتھ اپنے غصے میں سیبوں کی تھیلی پکڑے حجام کی دکان پر چڑھ گیا۔

"سلاملیکم!" میں نے تیکھے پن سے مگر تمیز سے سلام کیا تھا اور کہا تھا، "میں جاوید ہوں، ان کا ـــ بڈّا استاد کا ـــ بچہ۔"

مرشد نے گاہک کے سر سے قینچی کنگھا ہٹا لیا۔ مسکراتی ہوئی ان کی بڑی بڑی آنکھیں جیسے سینے میں اتری جا رہی تھیں۔

بولے، "وعلیکم السلام! ـــ اچھا جاوید ہو؟ پر کیا لے آئے، اصیل؟"

انھیں استاد کا دیا ہوا میرا یہ نام معلوم تھا۔

میں نے بے خوفی سے کہا، "مرشد! سیب لایا ہوں ـــ استاد کے لیے۔"

"ہوں!" انھوں نے مسکراتے ہوئے سڑک پر ہاتھ باندھے کھڑے بڈّا استاد کی طرف دیکھا، نرمی سے بولے، "سیب لائے ہو؟ یہ بتاؤ حرام کمائی کے تو نہیں ہیں؟"

میں چپ رہا تو بولے، "یہ سیب حلال کی کمائی کے ہوں گے؟ کیوں بھئی اصیل؟"

میں کیا جواب دیتا۔ خاموشی سے استاد کی طرف دیکھنے لگا۔

اپنے مرشد کے اس سوال پر بڈّا استاد نے دونوں ہاتھ جوڑ کے چہرے کے سامنے کر لیے تھے۔ میں نے دیکھا استاد کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔

میں سمجھ گیا۔ مرشد نے یہ بات مجھ سے نہیں کہی تھی۔ یہ بات بڈّا استاد کے لیے تھی۔

ٹھیک اسی وقت سامنے سڑک پر سے جگنیا بائی گزری۔ یہ ستر بہتر برس کی بیمار عورت کسی زمانے میں بلا کا ناچتی تھی۔ سنا ہے ہزار ہزار میل سے اس کے بلاوے آتے تھے۔ اب یہ گٹھیا کی مریض تھی، اور لاوارث۔ جان پہچان کی کوٹھے والیوں اور دو چار دلالوں نے اس کا روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ کوئی آٹھ آنے، کوئی ایک روپیا روز اس کے ٹھکانے پہ بھجوا دیتا تھا۔ بس گزارہ ہو جاتا تھا۔

مرشد نے اب جو استاد سے بات کی تو ویسے ہی نرمی کے ساتھ، بولے، "اگر حلال کمائی کے ہیں تو... بدایت اللہ! یہ سامنے ماں جا رہی ہے میری، سیب اسے دے دو۔" مرشد نے نرم سیاہ

لٹیں جھٹکتے ہوئے اپنے سر سے چمنیا بائی کی طرف اشارہ کیا تھا اور سیبوں کی تھیلی مجھ سے لے کر نیچے سڑک پر کھڑے استاد کی طرف بڑھائی تھی۔

استاد یوں چلے جیسے مُردے میں اچانک جان پڑ گئی ہو۔ دکان کے تختے کے پاس آ کر وہ جھکے۔ انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے سیبوں کی تھیلی سنبھالی، اسے ایک بار اپنے سر پر رکھا۔ پھر سڑک پر مشکل کے ساتھ آہستہ آہستہ جاتی ہوئی چمنیا بائی کے پیچھے لپکے۔

"اماں!" بڈا استاد نے اسے آواز دی، "اماں۔"

چمینا بائی کو کبھی کوئی اماں نہیں کہتا تھا۔

ویسے بھی وہ اونچا سننے لگی تھی۔ استاد کی دوسری آواز پر وہ رکی تو انھوں نے دونوں ہاتھوں پر رکھی سیبوں کی تھیلی اس کی طرف بڑھا دی۔

"اماں، سیب ہیں تیرے لیے۔"

چمنیا بائی نے آنکھیں پٹپٹائیں، "سیب؟ میرے لیے؟ آں؟"

بڈا استاد نے ہاں میں سر ہلایا تو آنکھوں میں ٹھیرے ہوئے آنسو گالوں پر لکیریں بنا کر بہنے لگے۔

بوڑھی مرگھلی ڈانسر نے کانپتا ہوا اپنا سوکھا پنجا بڑھا کر سیبوں کی تھیلی اٹھالی۔ بڈا استاد نے دونوں ہاتھ پیشانی تک پہنچا کر چمنیا بائی کو سلام کیا، پھر کلمے کی انگلی اٹھائے ہوئے ہاتھ اونچا کیا اور ایک ہی جگہ پر "ایلی ایلی" کر کے ناچتے ہوئے ایک پھیرا لیا۔ پھر وہ مڑے اور حجام کی دکان کے تختے کے پاس پہلے کی طرح ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔

میں دکان سے اتر آیا تھا۔ گدھا گاڑی والا شیبا کرسی چھوڑ کے ایک طرف کھڑا تھا۔

مرشد نے مسکرا کر پہلے شیبے خرکار کو، پھر بڈا استاد کو دیکھا۔ نرمی کے ساتھ دھیرے سے بولے، "ہدایت اللہ! آؤ بھئی۔ اب تمھارا نمبر ہے۔"

میں نے استاد کو دکان پر چڑھتے نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا، ان کی خوشی کو پھوارے کی طرح اچھلتے ہوئے اب تو سبھی دیکھیں گے۔

میں بھاگتا ہوا اٹال کی طرف چلا گیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد یہی سڑک جو قبرستان کا رستہ لگتی تھی، جشن والی رونق دکھلا رہی تھی۔
بڈا استاد کے پٹھے طبل اٹھا لائے تھے اور نعرے مارتے ہوئے دکان کے آگے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ کسی نے دکان کا پردہ کھینچ دیا تھا اس لیے نظر تو آ نہیں رہا تھا کہ مرشد کے سے لون میں کیا ہو رہا ہے؛ بس ایک چہل پہل، ایک گھما گھمی لگتی تھی۔
کوئی آدھے گھنٹے بعد سے لون کا پردہ واپس کھینچ دیا گیا۔ بڈا استاد کرسی پر تھے، سڑک کی طرف ان کی پیٹھ تھی۔ وہ اٹھے اور مڑے تو سب نے دیکھا کہ ان کے بال ترشے ہوئے، خط بنا ہوا تھا۔ مونچھیں اسی طرح چڑھی ہوئی تھیں جیسی سب ہمیشہ سے دیکھتے آئے تھے۔ بے حساب خوشی سے اور مَردوں والے سنگھار سے استاد کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ان کی گردن میں سُرخ رنگ کا جھلمل کرتا نیا سَیلا بھی پڑا تھا۔

استاد کے پٹھوں نے دیکھا اور اپنے اکھاڑے کی فتح کا نعرہ لگایا، ''ایلی ایلی ایلی، قلندر ایلی حسّےدر، قلندر ایلی حسّےدر۔'' اس وقت ساگر دادا کا ہاتھ طبل پر تھا۔
بلڈنگوں کی بالکنیاں دور دور تک گانے بجانے والیوں اور انھی جیسے مردوں عورتوں سے بھر گئیں۔

استاد اور ان کے تین چار پیر بھائی اس وقت دکان میں نظر آرہے تھے۔ مرشد کہیں اندر ہوں گے۔ میں نے دیکھا استاد باربر والی کرسی کے پیچھے گئے جہاں مرشد کھڑے ہو کر کام کرتے تھے۔ انھوں نے جھک کر فرش کے اس حصے کو چھو لیا، پھر جو مٹی انگلیوں کی پوروں سے لگی رہ گئی اسے پیشانی پر مَل لیا۔ استاد نے گردن میں پڑا سرخ سَیلا اب سر سے باندھا اور ''قلندر'' کا نعرہ مار جوانوں کی طرح کود کر سڑک پر آ گئے اور جس طرح جیتا ہوا پہلوان ایک ٹانگ پر اچھلتا اکھاڑے کا چکر لگاتا ہے، استاد بڈا نے طبل کی تھاپ پر ''ایلی ایلی'' پکارتے ہوئے طوائفوں والی سڑک کا دورہ شروع کر دیا۔

''قلندر ایلی حسّےدر'' کرتے استاد کے سب شاگرد ان کے ساتھ تھے۔
ہماری بلڈنگوں والی سڑک کے لیے وہ یادگار دن تھا۔ لگتا تھا یہاں کا سب کچھ بدل گیا ہے۔
بعد میں کسی نے بتایا کہ سے لون کا سودا ہو گیا تھا۔

مرشد اور ان کے مرید اگلے روز پتا نہیں کب چلے گئے۔

استاد ہدایت اللہ بہاولپوری نے کہاں جانا تھا، اُسی ٹال اور اُسی بکرامنڈی کے اکھاڑے پر جمے رہے۔ لیکن استاد اب دوسرے ہی آدمی تھے۔ بیسواؤں، گانے بجانے والیوں کو گالی تک نہیں نکالتے تھے۔

بلڈنگوں والی سڑک کی وہ دکان اب بھی "مرشد کا سے لون" کہلاتی ہے۔ دکان خریدنے والے نے مرشد کو دور سے دیکھا تھا۔ وہ تو مرید بھی نہیں ہوا تھا، مگر نئے بورڈ پر اُس نے یہی لکھوا دیا تھا۔ سردیوں میں پابندی سے وہ حمام گرم کرتا تو ہفتے میں ایک بار استاد لکڑی کے اچھے اچھے سوکھے گٹکوں سے ہاتھ گاڑی بھر کے خود مرشد کے سے لون پہنچا آتے تھے۔ سے لون والے سے پیسے لینا، سمجھو ان کے لیے حرام تھا۔ اس وقت بھی وہاں کے زیادہ تر گاہک وہی تماشبین، لُچے لفنگے ہوتے تھے جو گانا سننے، حرام پائی کرنے بلڈنگوں والی سڑک پر نکل آتے تھے۔

شام پڑے استاد کبھی سڑک پر آجاتے اور ان لوگوں کو سر میں تیل پھلیل ڈالے، عطر ملے، کلائیوں پہ موتیے کے ہار لپیٹے تماش بینی کے ارادے سے تیز تیز قدموں جاتے ہوئے دیکھتے تو کہتے تھے، "مولا بڑا بے پروا ہے یار! کیا پتا مرشد ہوری کو پھر ادھری بھیج دیوے۔۔۔ ان گرے پڑوں کو بھی مرشد میرا اسی طرح اٹھا لیوے جیسے جارج خبرے کون کو فٹ پیری سے اِلّا اللہ کر کے اٹھا لیا تھا ... ہاں یار، جیسے مجھ بُرے کو اٹھا لیا تھا!"

سرکس کی سادہ سی کہانی

جیپ چل رہی تھی۔

وہ ابھی کہیں پہنچے نہیں تھے۔

تین چار گھنٹے سے جیپ چل رہی تھی۔ جیپ والا کسی سرکس کا رِنگ ماسٹر تھا جس نے ان دونوں کو پیدل جاتا دیکھ کر بٹھا لیا تھا، "ارے پیدل کیوں جا رہے ہو؟ آؤ جی بھائی صاحبو بیٹھو! بیٹھ جاؤ!"

بھائی صاحبو اس نے عادتاً کہا ہو گا کیوں کہ جنھیں اس نے بٹھایا تھا ان میں ایک مرد تھا، دوسری عورت۔

رِنگ ماسٹر کہیں سے پوری بوتل لگا کے چلا تھا۔ آدمی دل پھینک تھا اور خوب باتیں بنا سکتا تھا۔

کہنے لگا، "اب صبح ہونے والی ہے، میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے اسی لیے جلدی پہنچنا چاہتا ہوں بھائی صاحبو!" پھر بولا، "دن اُوگے تک سرکس گراؤنڈ آ جائے گی۔ اور وہاں بھائی صاحبو! میں تم دونوں کو بڑا جنگی ناشتا کراؤں گا۔"

پیچھے بیٹھی عورت اپنے آدمی سے دھیرے سے کچھ کہہ کر ہنسی ہو گی تو رِنگ ماسٹر نے جیپ کی رفتار ذرا دھیمی کر کے اونچی آواز میں کہا، "ہاں بھائی صاحبو؟ کیا بات ہو گئی؟ ہمیں بھی سناؤ۔ ہم بھی ہنسیں گے۔"

عورت انجن کی آواز پر اپنی آواز بلند کر کے بولی، "کچھ نہیں جی، بات کیا ہو گی۔"

رنگ ماسٹر ٹھٹھا مار کے ہنسا، "کچھ تو ہے جس کی رازداری ہے۔ بہت دیر سے آپ دونوں بھائی صاحبوں کے رازو نیاز کی آواز آ رہی ہے۔ کیا کوئی مَوج میلہ چل را ہے پیچھے؟ ... ہاہاہا! ہاں نا بھائی صاحبو؟"

مرد نے کوئی کڑوی بات کہنے کے لیے اسٹارٹ ہی لیا تھا کہ عورت نے اس کے منھ پہ ہاتھ رکھ دیا اور رنگ ماسٹر سے پوچھا، "سرکس گراؤنڈ اور کتنی دور ہے؟"

وہ بولا، "بس بھائی! سمجھو پہنچ گئے۔ پہلے ہمارا ہی ٹینٹ ہے۔ اس وقت اس میں ہماری بیلاجی سو رہی ہوں گی۔ ان کو تو ہم اٹھائیں گے نہیں۔ وہ کچی نیند سے اٹھ جائیں تو سارا سارا دن گندی گندی گالیاں بکتی ہیں۔ اس لیے آپ بھائی صاحبوں کےلیے ہم خود ہی کوئی ناشتا واشتا تیار کر لیں گے ... ہاں بھائی صاحبو!"

مرد نے آدھی جھونجھل، آدھے مسخرے پن میں کہا، "اچھا بھائی صاحبا!"

عورت ہنسنے لگی۔

مرد نے پھر پوچھا، "مگر بھائی صاحب! تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بیلاجی کون ہے۔ بیوی ہے تمھاری؟"

رنگ ماسٹر بولا، "بیوی ویوی کوئی نہیں۔ وہ رکھیل ہیں ہماری۔"

عورت اور زور سے ٹھٹھے مار کے ہنسنے لگی تو "بھائی صاحبا" خود بھی ہنسا، بولا، "آپ صاحبوں کو گشتی سرکسوں کا کچھ پتا ہی نہیں ہے، اسی لیے ہنستے ہو۔ ارے ہم اگر اپنے ساتھ کوئی بیوی ویوی رکھیں تو چل چکا سرکس۔ چل ہی نہیں سکتا۔ بالکل بھی نہیں۔"

مرد کو اس کی باتوں میں مزہ آنے لگا تھا، اس نے پوچھا کہ کیوں نہیں چل سکتا؟

کہنے لگا، "بیویاں تو ویسے ہی اپنے مردوں کی پتلونیں پھاڑ رکھتی ہیں، ہوشوں حواسوں میں نہیں رہنے دیتیں۔ اور بھائی ہمارا کام جان جوکھم کا کام ہے۔ کوئی ساٹھ فٹ اونچے تار پر چل را ہے بھائی صاحبو! تو کسی نے اوپر پیٹرول چھڑک کے، آگ دکھا کے، سو فٹ کی اونچائی سے بالشت بھر کے ٹب میں چھلانگ لگانی ہے۔ کوئی شیر کے منھ میں اپنی کھوپڑی دیے بیٹھا ہے بھائی

صاحبو! تو کسی نے ریچھ کے پچھائے میں ہاتھ دے کے کرتب دکھانے شروع کیے ہیں ـــ الغرض سب سرکس والے اپنی جان پر کھیل کے روزی کما رہے ہیں۔ ایسے میں کون عقل سے پیدل ٹھوٹیا ہو گا جو اپنے اوپر چڈھی گٹھانے کو ایک بیوی بھی رکھے گا۔ نا صاحبو نا! ہم لوگ تو رکھیلوں و کھیلوں سے گزارہ کر لیتے ہیں۔ شروع سے یہی چل را ہے ـــ اور کیا!"

عورت ہنستے ہنستے دُہری ہو گئی۔ بڑی مشکل سے ہنسی تھام کے ٹکڑوں ٹکڑوں میں بولی، "اور یہ جو ـــ رکھیل تمھاری، تمھیں گالی دیتی ہے گندی گندی ـــ یہ کیا ہے؟ اس نے بھی تو تمھارے اوپر چڈھی گانٹھ رکھی ہے؟"

وہ بولا، "نا بھائی صاحبو! نا۔ بیلاجی ٹائم ٹائم سے گالی نکالتی ہے ـــ وہ جو بولتے ہیں نا کہ تیرے ہونٹ کتنے شیریں ہیں کہ گالیاں کھا کے بھی وہ سُسرا بےمزا نہیں ہوتا ـــ تو وہی قصہ ہے بھائی صاحبو! پھر اگر بیلاجی ڈاؤ لنگ کبھی بے سُری بولنے لگتی ہیں، آؤٹ ہونے لگتی ہیں، تو آپ کا فلک شیر رنگ کا ماسٹر اُن کی سُرائی بھی کر دیتا ہے ـــ تاہم بیویوں کی سُرائی نہیں کی جا سکتی ـــ بہ وجوہ!"

عورت نے پوچھا، "سُرائی کیا ہوتی ہے؟"

فلک شیر رنگ ماسٹر (یہی اس کا نام تھا) بولا، "آپ سُرائی نہیں جانتیں بھائی صاحبہ؟ ارے پھینٹی لگانے کو بولتے ہیں۔ چار چوٹ کی مار لگائی نہیں کہ بیلاجی پھر گنّے کی طرح سیدھی اور میٹھی۔"

مرد نے کہا، "ہاں ماسٹر! یہ بتاؤ بیوی کو جو پھینٹی نہیں لگائی جا سکتی اس کے کیا وجوہ ہیں؟"

رنگ ماسٹر بولا، "حیرت ہے صاحبو! آپ بیوی والے ہو کے بھی یہ وجہ نہیں جانتے ـــ خیر، اس ٹائم کیوں کہ آپ کی میم صاحب سامنے موجود ہے یہ نکتے کی باتیں پھر کبھی عرض کروں گا۔ لوجی! آ گئیں سرکس گراؤنڈز۔"

انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سب طرف پیلے بلبوں کی جھالریں ٹنگی نظر آ رہی تھیں۔

سورج نکلنے میں دیر تھی۔ ایک عمومی سناٹے میں ڈیزل یا کیروسین سے چلنے والے جنریٹروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میلے کچیلے اوور آل پہنے، گھٹنوں تک کے ربڑ کے

جوتے چڑھائے بہت سے آدمی جانوروں کو کھانا پانی دینے اور پنجروں کی صفائی کرنے خیموں کے درمیان سے نکل نکل کے آ جا رہے تھے۔ پہیے لگے پنجروں کی ایک قطار خیموں چھولداریوں کے بیچ کھڑی کر دی گئی تھی۔ اب مختلف جانوروں کی بھی ہلکی ہلکی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ شاید جیپ کی آواز سے بے آرام ہو کر بیدار ہو رہے تھے۔

جیپ رک گئی۔

رنگ ماسٹر انجن بند کر کے اترتے نشے اور شرارت کے ساتھ عورت مرد کو دیکھ کے آنکھ مارتا ہوا پردہ اٹھا، پنجوں کے بل اپنے ٹینٹ میں چلا گیا۔ دو تین منٹ بعد پکنک باسکٹ جیسی بید کی صندوق کی صندوق ٹوکری اٹھائے وہ برآمد ہوا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کے انھیں پیچھے آنے کا اشارہ کرتا خیموں کے بیچ بیچ چلنے لگا۔ ڈانگریوں والے ورکر اس کے سائے کو پہچان پہچان کر سلام کر رہے تھے۔

بلبوں کی پیلی روشنی میں سرکس کے خیمے کچھ زیادہ اُجاڑ اور صبح کی آوازوں کے ہوتے بھی خاموش اور افسردہ لگ رہے تھے۔ تاہم اس افسردگی اور اجاڑپن میں دور ایک بہت بڑا خیمہ روشنی سے اور چمکیلی آوازوں سے چھلکتا ہوا دکھائی دیا۔

رنگ ماسٹر اپنی پکنک باسکٹ اٹھائے اسی روشن خیمے میں داخل ہو گیا اور اندر رک کر اپنے مہمانوں کا انتظار کرنے لگا۔ اب وہ اونچی کھلکھلاتی آوازمیں انھیں خیمے میں چلے آنے کو کہہ رہا تھا، "چلے آؤ بھائی صاحبو! آ جاؤ۔ رکنا نہیں ہے۔ توقف نہیں کرتا ہے۔ یہ خیمۂ بے تکلف ہے بھائی صاحبو! شیروں، اژدہوں سے پنجا کرنے والے دلیروں کے لیے طاقت سے بھرپور ایک دم تم فولادی ناشتے اسی خیمے میں ملیں گے۔ سمجھے بھائی صاحبو! تکلف نہیں کرنا ہے، یعنی توقف نہیں کرنا ہے۔ بس آ جاؤ۔"

رنگ ماسٹر کے اور مہمانوں کے خیمے میں داخل ہوتے ہی اندر کے سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

مگر نہیں، "ان کی طرف" زیادہ درست نہیں ہے، کیوں کہ سب رنگ ماسٹر اور عورت ہی کو دیکھ رہے تھے۔ مرد تو جیسے ان کے ساتھ تھا ہی نہیں۔

گٹھے ہوئے بدن والے تین چار بونوں نے منہ میں انگلیاں ڈال کر تیز تیز سیٹیاں ماری تھیں اور "ہاہاہا" کی آواز نکالی تھی۔ رنگ ماسٹر خود کو اس وقت سرکس کے رِنگ میں اترا ہوا سمجھ رہا تھا۔ اس نے سیٹیوں کے جواب میں ایک قدم آگے بڑھ کر عورت کو خود سے بھڑا لیا، اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے جھک جھک کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کسی بات کی داد وصول کرنے لگا۔

ہجوم میں سے ایک نے چیخ کر کہا، "وا بھئی وا___ ماسٹر فلک شیر نے ایمان سے یہ نمبر ون ماشوک گھیرا ہے!"

رنگ ماسٹر نے خوش ہو کے ٹھٹھا لگایا اور داد وصول کرتے ہوئے پھر ہاتھ لہرایا۔

عورت کا مرد غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے بڑھ کر رنگ ماسٹر کی کلائی پکڑی اور جس ہاتھ سے وہ عورت کو گھیرے ہوئے تھا وہ ہاتھ جھٹکے سے کھینچ کر ہٹا دیا۔

ہجوم نے خوشی کا نعرہ مارا "واہ!" وہ سب سمجھ رہے تھے اب رقیبوں کی لڑائی شروع ہو گی۔ مگر انہیں مایوسی ہوئی۔

عورت نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے اپنے مرد کو دیکھا اور ہجوم سے چیخ کر کہا، "سنو رے سنو۔ رنگ ماسٹر میرا 'ماشوک' نہیں ہے۔ میرا 'ماشوک' یہ ہے۔" اس نے کمر میں ہاتھ ڈال کے اپنے آدمی کو ہجوم کے سامنے کر دیا۔ پھر ہنستی ہوئی آواز میں چیخ کر کہنے لگی، "ارے وہ رنگ ماسٹر تو میری ماں کا بھائی ہے۔ ماما ہے میرا۔ سمجھو اس میرے 'ماشوک' کا ممیا سُسر ہے۔ کچھ سمجھے ممیا سُسر کیا ہوتا ہے؟"

ہجوم نے ایک آواز ہو کے کہا، "ہاں، سمجھ گئے۔"

"کیا ہوتا ہے؟" عورت نے پھر ہنستے ہوئے پوچھا۔

دو تین آوازوں نے گا کر کہا، "ماشوک کا سُسر ہوتا ہے۔" اور باقی سب تالی بجانے لگے۔

رنگ ماسٹر بےوجہ کھلا پڑتا تھا۔ وہ ہر سمت میں جھک جھک کر اور ٹھک ٹھک کر کے اپنی ایڑیاں بجا رہا تھا جیسے یہ پورا شو اسی کے لیے ہو رہا ہو۔ اسے بات بات پر داد وصول کرنے کا شوق تھا۔

وہ تینوں اور پکنک باسکٹ کسی میز تک ابھی پہنچے بھی نہ ہوں گے کہ تالیاں بجاتے سرکس

والوں نے اپنی میزیں چھوڑ دیں اور انھیں گھیر لیا۔
مرد کا غصہ یا جھوجھل، جو بھی تھی، اب تک ختم ہو چکی تھی۔ سرکس والے کھلے دل کے لوگ لگتے تھے۔ ان کی باتوں سے عورت کی، یا کسی کی بھی، توہین نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اپنی خوش مزاجی اور امنگ میں نئے دن کا استقبال کر رہے تھے۔
رنگ ماسٹر نے میز سنبھالتے ہی سرکس والوں کو دھکے دیتے ہوئے کافی جگہ بنالی اور پکنک باسکٹ اپنی کرسی کے قریب فرش پر رکھ دی۔ اب اس نے کرتب دکھانے کے انداز میں باسکٹ سے ایک ایک چیز نکالنی شروع کی جو وہ اپنی مرضی سے کبھی عورت کے، کبھی مرد کے اور خود اپنے سامنے رکھتا گیا یا واپس باسکٹ کے حوالے کرتا گیا۔
ہر چیز دیکھ کر ہجوم داد دیتا یا تالی بجاتا تھا۔
باسکٹ سے وِسکی کی بوتلیں، بیئر کے ٹن، لمبے ڈنٹھلوں والے شیشے کے گلاس، پنیر کے سربند ڈبے، کانٹوں دار تار، ڈبے کھولنے والے کٹر، کاگ اڑانے والے گھومے ہوئے اوپنر، پیچ کش اور دھمکیاں، الٹی میٹم اور بڑھیا بسکٹوں کے ٹِن، بٹر پیپر میں لپٹی روسٹ کی ہوئی سالم مرغی، جھوٹی تسلیاں، دلاسے اور ڈینگیں، کافی پینے کے مگ، کانٹے، چھریاں، اسلحے، پلیٹیں، ٹشو پیپر، وھائٹ پیپر، آٹھ دس نارنگیاں، اتنے ہی سیب، مخمل کے خوب صورت جھولنے میں بند سخت سینکی ہوئی ڈبل روٹی، مکھن لگی روٹی، روٹی لگا مکھن، صرف روٹی اور صرف مکھن، کچھ اور روٹی، شہد کا جار اور وٹامن کی گولیوں کی شیشی ـــــ بے شمار چیزیں۔
سب نکلی آ رہی تھیں۔ لگتا تھا عمرو عیار کی زنبیل ہے جس سے نعمتیں اور عشرتیں اور دوسری سب چیزیں بس چلی آ رہی ہیں۔
رنگ ماسٹر نے گولیوں کی شیشی اٹھا کر ہاتھ بلند کرتے ہوئے، ہجوم کو "درجہ بہ درجہ" آنکھ ماری اور اپنی اعلانچیوں والی آواز میں عورت اور مرد کو مخاطب کر کے کہا، "اور بھائی صاحبو! یہ ہیں اصلی سلاجیت کی جوہری گولیاں، یہ شیرنی کے دودھ اور کنوارے ریچھ کی کمر سے حاصل کیے ہوئے ایک خاص جوہر میں گوندھ کے تیار کی گئی ٹیبلٹیں ہیں بھائی صاحبو! جو حکیم ارسطاطالیس اصلی کی ایجاد ہیں صاحبو اور موج میلے کی کارکردگی میں سمجھو کہ تیر بہ ہدف ہیں۔ اس لیے..." اب وہ باقی

ہجوم سے مخاطب تھا، "اسی لیے بھائی صاحبو! یہ گولیاں میں اس معزز جوڑے کو پیش کرتا ہوں۔ اور کیوں نہ پیش کروں کہ اس وقت پورے سرکس گراؤنڈ میں ان دونوں سے زیادہ اس کا حق دار اور کون ہوگا ــــ بتاؤ کون ہوگا؟"

ہجوم نے، جو اَب ہر طرف سے انھیں گھیر چکا تھا، چیخ کر ایک آواز میں کہا، "کوئی نہیں!"

رنگ ماسٹر نے حکم دیا، "اچھا تو ان کے لیے ایک ایک گلاس سادہ پانی لاؤ۔"

پانی آ گیا۔

رنگ ماسٹر نے مرد اور عورت کو حکم دیا، "تو بھائی صاحبو! دو دو گولیاں سلاجیت اصلی ممسک قرص جوہری درجۂ اول آپ دونوں کھالو۔ فوراً ــــ رام بھلی کرے گا۔"

عورت نے انکار کر دیا۔ مرد نے ہاتھ بڑھا کر شیشی اٹھالی۔ اس پر لکھا ہوا پڑھا۔ عام سی وٹامن بی کمپلیکس کی گولیاں تھیں۔ اس نے دو نکالیں اور پانی سے نگل لیں۔

رِنگ ماسٹر سمیت ہجوم نے، "ہا آ ــــ شیر کا بچہ ہے!" کہہ کر تالی بجائی۔

مرد اٹھا، تعظیم کو جھکا اور اس نے داد وصول کی۔

وہ بھی ان کے رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔

اسے دیکھ کر عورت بھی اٹھی۔ اس نے بھی دو "ممسک جوہری" گولیاں نکالیں، ہتھیلی پر رکھ کر پورے حلقے کو دکھائیں۔ حلقے سے پسندیدگی کی گونج سنائی دی۔

"ہا آ آ آں!"

عورت نے پہلے ایک پھر دوسری گولی پانی سے نگلی اور وہ اپنے مرد کی طرح داد وصول کرنے کو جھکی، اپنی فراک کا گھیرا تھام کر، دونوں گھٹنے خم کر کے اس نے ہجوم کو تعظیم دی۔

"ہا آ۔ شیر کی بچی ہے ماشوک! شیر کی بچی ہے۔" اور ہجوم نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

دو بونے میزوں کے بیچ خالی جگہ میں ایک دوسرے کے پنجوں میں پنجے پھنسا کر گھمن گھیری ناچنے لگے۔

رنگ ماسٹر اور مہمان عورت مرد نے بھی تال دینی شروع کر دی۔

جو ہجوم انھیں گھیرے ہوئے تھا وہ اب گھمن گھیری ناچتے بونوں کی طرف گھوم گیا اور بڑے جوش سے تال دے دے کر کچھ گانے لگا، اس لیے تینوں اس تال دیتے گاتے ہجوم میں شامل ہو گئے۔

ان کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی ـــ اسپاٹ لائٹ سمجھو اب ان بونوں پر تھی۔

"تری درادا۔ تری دادا۔ تانا تانا، تن تنانا۔ او تری درادا۔ تری دادا۔"

نہ معلوم کیا گیت تھا۔ وہ جوڑا بھی سب کے ساتھ چیخ چیخ کر "تری درادا" کرنے لگا۔

کوئی پانچ سات منٹ یہ ناچ، تالیاں اور "تری دادا" چلتا رہا۔ پھر جس طرح اچانک بونوں نے ناچنا شروع کیا تھا، ایک دم ہی انھوں نے بند کر دیا۔ دونوں ہنستے اور ایک دوسرے کی پیٹھ تھپکتے ہوئے دائرہ توڑ کر ایک طرف نکل گئے اور کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔

ہجوم چھٹ گیا۔ سب اپنی میزوں پر چلے گئے۔ عورت اور مرد کو لیے ہوئے رنگ ماسٹر اپنی میز کی طرف بڑھا اور... ٹھٹھک کر وہیں کھڑا رہ گیا۔

رنگ ماسٹر کی میز پر شیر کی کھال سے بنا کوسٹیوم پہنے، گل مُچھوں والا ایک لمبا تڑنگا، چوڑا چکلا اور آدھ ننگا باڈی بلڈر بیٹھا پُرشور طریقے سے رنگ ماسٹر کے سیب کھا رہا تھا ... کھا نہیں رہا تھا، چر رہا تھا۔ باڈی بلڈر کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سیب تھا اور وہ اپنے مضبوط سفید دانتوں سے کبھی ایک سیب کو، کبھی دوسرے کو بھنساتا اور سر کا جھٹکا دے کر جیسے اکھاڑتا تھا، پھر خچر کی طرح منھ چلاتے ہوئے چبانے لگتا تھا۔ سیبوں کے رس سے گلمچھوں سمیت اس کا نچلا آدھا چہرہ چمک رہا تھا اور پھل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کی ہتھوڑے جیسی ٹھوڑی اور بالوں بھرے سینے پر گر رہے تھے۔

"سُڑپ سُڑپ" کی آوازیں سن کے اب دوسرے بھی ادھر دیکھنے لگے تھے۔

رنگ ماسٹر کو سامنے پا کر بھرے منھ کے ساتھ باڈی بلڈر "ہو ہو ہو" کر کے ہنسا۔ مرد پریشان ہو کر کبھی اسے کبھی رنگ ماسٹر کو دیکھنے لگا۔

رنگ ماسٹر غصے میں کانپنے لگا تھا۔

باڈی بلڈر بھونڈی آواز میں ہنستے ہوئے بولا، "کیا سوچ را ہے؟ آـــ مار مجھے!ـــ آ!"

عورت اور مرد نے سوچا، "کیسی اچھی صبح طلوع ہونے والی تھی۔ اب سب کچھ برباد ہو گیا ہے کیوں کہ ماحول میں غصہ ہے اور سب کے ساتھ کہیں کوئی دھاندلی کی جا رہی ہے۔"

رنگ ماسٹر نے سر جھٹک کر پیشانی پر ہاتھ پھیرا ـــ بالکل اس طرح جیسے کوئی نیند کے جھونکے سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا ہو۔

باڈی بلڈر نے ہنستے ہوئے اسے پھر للکارا، "آ ـــ مار!"

رنگ ماسٹر عورت کی طرف گھوم گیا۔ دھیرے سے بولا، "تم دونوں ایک منٹ کو ذرا باہر جاؤ۔"

خیمے میں سناٹا ہو گیا۔

عورت نے رنگ ماسٹر کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک بار ایسے تھرایا جیسے بجلی کا زندہ تار اسے چھو گیا ہو۔ وہ پہلے کی طرح دھیرے سے کہنے لگا، "نہیں بی بی! مجھے چھونا مت ـــ اب ہاتھ نہیں لگانا۔ بالکل نہیں۔"

عورت کو اندازہ نہیں تھا۔ اس نے، "اب ایسا بھی کیا،" کہہ کے رنگ ماسٹر کی پیٹھ تھپکنا چاہی تھی کہ وہ منہ اٹھا کے پوری طاقت سے چیخا: "ہاآآآآہ!" پھر اس نے جھپٹ کر قریب پڑی کرسی اٹھائی اور باڈی بلڈر کے سر پر چلا دی۔

مرد نے دل میں سوچا، "یہ گیا شیر کی کھال والا گل گُجھڑ ـــ اب نہیں بچتا۔"

مگر باڈی بلڈر نے بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ اٹھایا اور بازو کے پُر گوشت حصے پر یہ وار روک لیا۔ کرسی ٹوٹ کے گر گئی۔

مرد نے اپنی عورت کو بانہہ سے پکڑا اور کھینچتا ہوا اسے خیمے سے باہر لے گیا۔

جاتے ہوئے اُس نے سنا اندر سے ایسی آوازیں آئی تھیں جیسے سانڈ پھنکارتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے ہوں۔ خیمے میں بھرے ہوئے لوگوں نے "نانانا" کہتے ہوئے کسی کو باز رکھنے کے لیے ایک ساتھ شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

وہ دونوں خیمے سے نکل کر دو قدم ہی چلے ہوں گے کہ اندر "ٹھَٹ" کی سی آواز ہوئی۔ لگتا تھا چھوٹے بور کا فائر آرم چلایا گیا ہے۔ کسی کے دَھم سے گرنے کی بھی آواز آئی تھی۔

مرد واپس اندر جھپٹا۔ عورت اس کے پیچھے تھی۔ رنگ ماسٹر اپنی میز کے قریب ہاتھ میں پتیل کا چھوٹا سا جیبی پستول لیے کھڑا تھا۔ پستول کی نال سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا اور باڈی بلڈر کی کرسی اُلٹی پڑی تھی۔

برابر سے ایک بونا، "مار دیا رے مار دیا، آسو بلے کو مار دیا،" چلّاتا ہوا باہر بھاگا۔ کوئی اور اسے روکتا ہوا پیچھے چلا تھا مگر بونا بہت تیز دوڑ رہا تھا۔

عورت مرد نے فرش پر گرے ہوئے باڈی بلڈر کو دیکھا۔ وہ ٹوٹی کرسیوں کے ملبے میں پڑا اپنا دایاں شانہ سختی سے دبائے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی انگلیاں خون میں بھیگتی جا رہی تھیں۔ آسو بلا (بونے نے اس کا یہی نام لیا تھا) مرا نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب تک منہ چلا رہا تھا۔ "ہو ہو" کر کے ہنستے ہوئے اس نے منہ میں بھرے سیب کے ٹکڑے اور لگدی فرش پر گرا دی اور بولا، "پشتول چلاتا ہے... حرامی!"

رنگ ماسٹر نے اسے مارنے کو ایک اور کرسی اٹھالی ــــ اس کے دیسی پستول سے شاید ایک ہی فائر ہو سکتا تھا۔

مرد رنگ ماسٹر کو حملے سے روکنے کے لیے بڑھ رہا تھا کہ خیمے کے لوگوں اور بونوں نے چیخ کر کہا، "نہیں بھائی۔ قریب مت جانا۔ بالکل مت جانا۔"

مرد سوچنے لگا، "ارے! رنگ ماسٹر نے زخمی آسو کو مارنے کے لیے کرسی اٹھائی ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں، مجھے آگے آنے سے روک رہے ہیں۔" مگر اس نے کنکھیوں سے دیکھا کہ وہ سب کے سب ایک جتھے کی صورت میں رنگ ماسٹر کو گھیرتے جا رہے تھے۔ ہر ایک نے ایک ایک کرسی اٹھا رکھی تھی۔ ہر کرسی کی ٹانگیں کسی چار انگلیوں والے پنجے کی طرح رنگ ماسٹر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ گھیرا ڈال چکے تب ماسٹر کو اندازہ ہوا کہ وہ گھر گیا ہے۔

اس نے دیکھا اور حملے کے لیے اٹھائی ہوئی اپنی کرسی فرش پر رکھ دی اور اسی پر بیٹھ گیا۔ پھر سر جھکا کر اپنے جوتوں کے درمیان فرش کو گھورنے لگا۔

اب وہ ایک پُرسکون اور فکرمند آدمی تھا۔

عورت مرد نے سرکسوں میں کٹیلے جانوروں کو کرسی کے بڑھتے ہوئے پنجوں سے قابو میں

آتے دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے سامنے ایک انسان ـــ خود کٹھپتلیوں کا تماشا دکھانے والا رِنگ ماسٹر ـــ کرسی سے قابو میں آ گیا تھا۔

ایک بار پھر خیمے میں سناٹا ہو گیا۔

ایک چھوٹی سی آواز نے، کسی بچے کی آواز، نے اچانک سوال کیا، "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

عورت مرد گھوم گئے۔ خیمے کے دروازے میں ایک لڑکی آ کھڑی ہوئی تھی ـــ آٹھ نو برس کی بچی۔ اس نے اپنی چھوٹی سی تجسس بھری آواز میں پھر پوچھا، "جانم! کیا ہوا تھا ابھی؟"

اُس نے یہ سوال رنگ ماسٹر سے کیا تھا۔

"کچھ نہیں، ڈارلنگ! ... تم کیوں آ گئیں؟ جاؤ... سو جاؤ۔" رنگ ماسٹر نے جس طرح کہا تھا اس سے انہیں شک سا ہوا۔ دونوں نے پھر دیکھا۔ اب کے غور سے دیکھا۔

وہ بچی نہیں، عورت تھی، پوری عورت ـــ وہ بونی تھی۔

بونی نے پوچھا، "جانم! یہ ایسا کیوں بیٹھا ہے؟" وہ آسو بلّے کی طرف اشارہ کر رہی تھی، "کیا ہو گیا اس کو؟ کیسے چوٹ لگ گئی؟"

عورت نے سوچا، "جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ خوب جانتی ہے کیا ہوا ہے۔" بونی کو خبر کرنے والا بونا اس کے پیچھے پیچھے خیمے میں آ گیا تھا۔

"کیا ہوا اسے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"کیا خبر،" رنگ ماسٹر نے پھر سر جھکا کر فرش کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔

آسو بلّا کبھی بونی کو کبھی رنگ ماسٹر کو سر گھما گھما کے دیکھتا رہا تھا۔ اب جو رنگ ماسٹر نے "کیا خبر" کہہ کے سر جھکا لیا تو آسو فرش پر سے اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور شکایت کے لہجے میں بولا، "بیلاجی! بیلاجی! اس نے پشتول مارا ہے... حرامی نے۔"

خوب! تو رنگ ماسٹر کی رکھیل بیلاجی یہ ہے ـــ بونی۔

آسو کی بھدی آواز میں ماسٹر کے لیے گالی سن کر بیلاجی کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ بلّے کی طرف دیکھے بغیر اس نے منہ بگاڑ کر کہا، "بک بک نہیں کر!" اور خاموش بیٹھے ہجوم میں سے ایک کو انگلی کے اشارے سے بلایا، "او سُن، اِدھر آ ـــ ہاں تجھی سے کہہ رہی ہوں۔ لے جا اس سالے کو

— کمپوڈر اٹھ گیا ہوگا — اس کی پٹی کرا دینا۔"

ہجوم سے جو نکل کے آیا وہ بھی بونا تھا۔ وہ بھنبھناتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں بولا،

"ابھی کدھر اٹھا ہوئے گا کمپوڈر۔ رات پوری باٹلی ٹکا کے گیا تھا۔"

"جاجا، سالا بالشٹر! ادھر ہی جرح کرنے لگا ہے حرام کا! ابے جاتا ہے یا پچھائے پہ ٹھڈا کھائے گا۔ گاں...!"

رنگ ماسٹر ٹھیک کہتا تھا، بیلاجی کچی نیند سے اٹھا دی گئی تھی — اب یہ دن بھر گندی گندی گالیاں بکے گی۔

گالی کھا کے بونا زخمی آسو کے پاس گیا اور ہاتھ پکڑ کر اسے خیمے سے باہر لے چلا۔ لگتا تھا کرکٹ کے بیٹ کو اس کی بال کھینچے لیے جا رہی ہے۔

جوں ہی آسو اور بونا خیمے سے نکلے، بونی بیلاجی حلق سے لاڈ کی آوازیں نکالتی، رنگ ماسٹر کے جوتوں پر پیر رکھتی، اُچھل کر اس کی گود میں جا بیٹھی۔ "اررے میرا فلک شیر! پھلکو میرا — کیا بات ہو گئی ڈاہ لنگ؟ — تجھے کیوں غصہ آ گیا؟ آں؟ میری جان! پستول کائی کو چلایا تُو نے اس... اس پونے پہ کائی کو چلایا پستول؟"

بونی رنگ ماسٹر کے بڑھے ہوئے شیو پر اپنے رخسار رگڑنے لگی اور پُچ پُچ کی آوازیں نکالتی ہوئی کچھ یوں ظاہر کرنے لگی جیسے وہ اس کے بوسے لے رہی ہے، یا لینا چاہتی ہے مگر حاضرین کی وجہ سے جھجکتی ہے۔

رنگ ماسٹر اس کی پہنچ سے دور ہونے کو اپنا چہرہ دائیں بائیں ہٹا کر اسے روکتا رہا۔ "نا ڈاہ لنگ! نا بیلا! اری بات تو سن۔"

مگر بیلاجی کا لاڈ اور نقلی چوماچاٹی چلتی رہی اور بار بار وہی سوال کہ کیا بات ہو گئی؟ کیوں غصہ آ گیا؟ پستول کائی کو چلایا؟

رنگ ماسٹر نے بیلاجی کی غیر معمولی توجہ سے بچنے کو شاید ایک بار منھ کھول کر بتا دینا چاہا بھی مگر پھر "ہاں، وہ، یہ" کہہ کر چپ ہو گیا۔

"بتا نا، کیا بات ہو گئی جانم؟" بیلاجی اب اپنے پھلکو فلک شیر کی گود میں کھڑی ہو گئی، اس

کے کھلے گریبان میں دور تک اپنا انگوٹھیوں بھرا ہاتھ ڈال دیا اور اندر ہی اندر رنگ ماسٹر کا ادھیڑ سینہ تھپتھپانے لگی۔ اسے گدگدی ہو رہی تھی یا کوئی اور بات ہو گی جو وہ سرخ ہو گیا اور گھگھیانے لگا، "بس کر۔ ذرا ٹھیر تو۔ اری دیکھ تو سب ہیں ــــ بھلا یہ کون سا وقت ہے؟ بیلا! او بیلاجی! نہیں سنے گی؟"

بونی بیلاجی مَم مَم مَم کرتی ہوئی جیسے خود بھی اپنی مصروفیت میں مگن ہو رہی تھی کہ فلک شیر دلاور نے ہتھیار ڈال دیے اور منھ سے رال گراتے ہوئے بولا، "سن بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔ اس نے... اس نے سالے نے میرے سیب کھا لیے تھے ــــ اس لیے، اس لیے گولی ماری ہے۔ چل ہاتھ نکال... اُتر!"

بیلاجی بہت فتح مند اور مسرور اپنے فلک شیر ڈاونگ کی گود سے اتر آئی۔

اس نے خیمے میں موجود لوگوں اور بونوں کی طرف جیتی ہوئی عورت کے غرور سے دیکھا اور حکم دیا، "پھلکو کی باسکٹ میں اس کی سب چیزیں واپس رکھ دو۔"

خیمے میں موجود لوگ، حد یہ ہے کہ بونے تک بے تعلقی اور بیزاری بلکہ ایک وحشی نفرت سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بیلاجی کی بات پر توجہ نہ دی۔ عورت مرد دیکھ رہے تھے کہ بعض بونوں تک نے جماہیاں لی تھیں۔

"تمھاری بھیں کا یہ، کاوہ... سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟" بونی نے منھ بگاڑ بگاڑ کے گالی گفتار بکنی شروع کر دی تھی۔

عورت نے حیرت سے اپنے مرد کو دیکھا۔ دھیرے سے بولی، "اس چھوٹی ڈبیا سی عورت میں کتنا گند بھرا ہے!"

مرد کچھ نہ بولا۔ اسے بھوک لگنی شروع ہو گئی تھی ــــ صبح تڑکے سے بلکہ آخری پہر کے اندھیرے سے اب تک انھوں نے بڑی دیوانگی کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ رات جاگتے ہوئے کٹی تھی۔ بھوک تو لگنا ہی تھی۔

بیلاجی کی گالی گفتار سن کے سبھی بونے جلدی جلدی رنگ ماسٹر کا سامان اس کی باسکٹ میں بھرنے لگے تھے۔

بونی نے اب عورت مرد کی طرف توجہ کی۔ ایسا لگتا تھا دونوں پر اس کی نظر پہلے نہ پڑی ہو گی۔ اس نے ایک بار مرد کو دیکھا، منھ بنایا، پھر عورت کو دیکھا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جھک کر اس نے رنگ ماسٹر کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے بہت سختی سے انکار میں سر ہلایا، دبی ہوئی آواز میں بولا، "تُو پاگل ہو گئی ہے! اری وہ میاں بیوی ہیں۔"

بیلاچی رنگ ماسٹر کی کرسی کے پیچھے کھڑی تھی، اب وہ اس کے برابر آ گئی۔ وہ جھکی ہوئی برابر اس سے کچھ کہے جا رہی تھی۔

رنگ ماسٹر ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بیلاچی گرتے گرتے بچی، کھسیا گئی، مگر اس نے ڈپٹ کر بہت غصے سے مرد کو دیکھا اور بولی، "اورے او... کیا دیکھتا ہے؟ کون ہے تُو؟ کدھر سے آیا ہے... سالا پَروَرٹ!" وہ نہ معلوم کیوں اسے یہ عجیب طعنہ دے رہی تھی۔

مرد کے جواب دینے سے پہلے رنگ ماسٹر بول اٹھا، "مہمان ہیں میرے... ان سے کیا پوچھ رہی ہے؟ بتایا نا، میرے ساتھ آئے ہیں دونوں۔"

بونی نے فلک شیر کی کہی بات اَن سنی کر دی، اسی گندے لہجے میں مرد سے پوچھنے لگی، "او رے او... یہ رنڈی کون ہے تیری؟ ...ماں ہے؟"

اب مرد کے کچھ کہنے سے پہلے اس کی عورت آواز بنا کے ہنسی، بولی، "اری او پاگل! کیسی بھلکڑ ہے ــــ کیا پھر بھول گئی؟ اری اِس کی نہیں میں تیری مَینا ہوں۔ نایکہ ہوں اِدھر کی ــــ آٹھ آٹھ آنے لے کے میں ہی تو چھوڑتی جاتی ہوں ــــ پورے کا آٹھ آنہ، بونے کا چار آنہ، پونے کا ایک آنہ ــــ یاد آیا؟"

رنگ ماسٹر کا منھ تھتھا ہوا تھا لیکن عورت کی بات سن کے اس نے چہرہ اٹھا کے ایک زبردست قہقہہ لگایا، پھر پیٹ پکڑ کے ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بولا، "آج ملی ہے یہ تیرے سر کی استاد ...شاباشے... ہاہاہا... یہ ملی ہے۔"

بیلاچی کرسی کے پیچھے سے غصہ ور نیولے کی طرح خی خی کی آواز نکالتی ہوئی جھپٹی اور اس نے بہ یک وقت عورت کی طرف لگ چلایا اور مرد کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ عورت اس کے لیے تیار تھی۔ اس نے اپنی طرف آتے لگ کو ہاتھ بڑھا کر ذرا اوپر اٹھا دیا۔ بونی کا توازن بگڑ گیا اور وہ گر

گئی۔ مرد کی طرف چلایا ہوا اس کا گھونسا اوچھا پڑا ــــ ذرا سا نیچے۔ مارے تکلیف کے وہ دُہرا ہو گیا۔

بیلاجی بونی فرش پر پڑی ہوئی اسے ـــ مرد کو، خدا معلوم مرد ہی کو کیوں ـــ طرح طرح کی گالیاں دے رہی تھی، "تیری ماں کو بھیں کے یاں کا واں... حرافی سالا نامردا، گینگلو کی اولاد، سورا دلا کدھر کا..."

رنگ ماسٹر فلک شیر نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے بھی جھک کر فرش پر پیچ و تاب کھاتی بونی کو اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر چھوٹے مچلتے ہوئے بنڈل کی طرح اٹھایا اور بغل میں مار خیمے سے نکل گیا۔ وہ بُری طرح ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔

تین بونوں نے رنگ ماسٹر کی پکنک باسکٹ اٹھائی اور مشقت کی آوازیں نکالتے وہ بھی پیچھے چل پڑے۔

دور سے بیلاجی کی چیختی چنگھاتی آواز آ رہی تھی، "ان دونوں سالوں کی بھیں کا یہ کا وہ کا دلا سالا فش گولا... اور وہ سالی رانڈ..."

عورت نے تھکی ہوئی بیزار خوش مزاجی سے ہاتھ جھاڑ کر کہا، "گئی سُسری ــــ جان چھوٹی۔"

"مگر وہ تو کھانے کی سب چیزیں لے گئے ہیں۔ اب کیا ہو گا۔"

عورت نے لاعلمی میں کندھے اُچکائے۔

پیچھے سے کسی نے دھیمی گمبھیر آواز میں کہا، "میرے ساتھ آؤ، ناشتا کرا دوں گا۔"

عورت مرد نے مڑ کے دیکھا۔ نیلا اوور آل پہنے، ٹول بکس اٹھائے ایک سنجیدہ چہرے والا عرب، ایرانی یا شاید پاکستانی جیب میں ہاتھ ڈالے سکون سے کھڑا تھا اور انھیں ساتھ آنے کو کہتا تھا۔

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، "میرا نام بادل ہے۔ ادھر الیکٹریشین لگا ہوا ہوں۔"

مرد نے ہاتھ ملاتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کے لمس میں محنتی آدمی کا کھردراپن اور بے غرضی تھی۔

"تم پاکستانی ہو؟" مرد نے بادل سے پوچھا۔

"پتا نہیں... میں اور والد صاحب مسقط میں پیدا ہوئے تھے... دادا صاحب بلوچستان سے گیا

تھا۔"

بادل انھیں لیے ہوئے میزوں کے درمیان راستہ بناتا خیمے کے پچھلے حصے کی طرف چلا۔ میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ اب اپنے مگوں، گلاسوں اور پیالوں میں جھکے ہوئے چاے، کافی جیسا کچھ پینے لگے تھے۔ عورت مرد نے دیکھا ان کے مگ اور گلاس جھڑی ہوئی تام چینی اور پتلے ایلومینیم کے تھے، پیالیاں کوریں کنڈے جھڑی اور بے جوڑ تھیں۔ تام چینی کی کالونچ لگی رکابیوں اور اردو کے پرانے پیلے پڑے اخباروں پر بھورے بدرنگ آٹے کی گیندیں سی رکھی تھیں اور بہت سے پکے زرد کھیرے، چیرا دیے ہوئے اور نمک مرچ لگے، کھرّی میز پر پڑے لڑھک رہے تھے۔

کوئی کوئی ورکر بے دلی سے آٹے کی ان بھوری گیندوں کو اٹھا اٹھا کے کتر لیتا تھا ــــ کھیروں کو تو ان کے دیکھتے کسی نے چھوا بھی نہیں۔

وہ دونوں اور بادل بڑے روشن خیمے کو چھوڑ کر باورچیوں کی چھولداری میں آ گئے۔ یہاں چینیوں جیسی مہربان صورتوں کے آدمی عارضی چولھوں پر کچھ پکاتے تھے یا گرم کر رہے تھے۔

وہ کچھ بولے تو معلوم ہوا، شکلیں بے شک چینیوں جیسی ہیں مگر وہ چینی نہیں ہیں۔

بادل نے دھیرج سے سمجھاتے ہوئے ان سے کچھ کہا تھا۔ وہ لوگ اس مرد اور اس عورت کے بارے میں بات کر رہے ہوں گے کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی عورت مرد سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ کچھ بحثا بحثی کے بعد چینی دکھائی دینے والوں میں سے ایک نے ہاں میں سر ہلایا اور اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ کہیں سے تین فولڈنگ کرسیاں اٹھا لایا جو اس نے ایک صندوق کے پاس بچھا دیں۔ صندوق ایک طرح کی میز بن گیا۔

بادل اور عورت مرد بیٹھ چکے تو باورچیوں میں سے ایک بڑے خیمے کی طرف کھلنے والے دروازے میں اسٹول ڈال کے، رستہ روک کے بیٹھ گیا۔ اسے ڈر ہو گا کہ کہیں اُدھر سے کوئی اور نہ آ جائے۔ دوسرے باورچی ان کے لیے ناشتا تیار کرنے لگے۔

بادل نے بتایا، "دیگوں والی چاے بے کار ہے۔ یہ آپ لوگ کو نئی چاے بنا کے دیں گا۔"

مرد نے دھیرے سے کہا، "مہربانی ہے تمھاری۔"

وہ بولا، "مگر ادھر ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے دوست۔ یہ لانگری لوگ ویسا ہی طبیعت کا اچھا ہے۔"

باورچیوں نے آلو ابالنے کو چڑھا دیے۔

بادل آہستہ آہستہ باتیں کرتا ہوا اس ناکافی ناشتے کی پیشگی معذرت کرنے لگا جو ابھی ان دونوں کے سامنے لایا بھی نہیں گیا تھا۔ مگر مرد نے کہا کہ بھائی محبت سے جو بھی مل جائے گا نعمتوں سے بڑھ کے ہوگا۔

بادل بولا، "دوست اِدھر بڑا کڑکی ہے۔" بتانے لگا کہ ویسے تو سرکس چل ہی نہیں رہا اور جو تھوڑا بہت آتا ہے تو وہی تینوں "مُردار" آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ورکروں کو وعدے وعید کے سوا دیتے ہی کچھ نہیں۔ بےزبان جانوروں تک کو بھوکا مار رکھا ہے ـــــ سب کو بس آدھے پیٹ ملتا ہے۔

مرد نے سوچا: تینوں سے وہی تینوں مراد ہوں گے، رِنگ ماسٹر، باڈی بلڈر اور بیلا بونی۔

اخباروں پر پڑی آٹے کی گیندیں اور پکے پیلے کھیرے دیکھ کر اسے پہلے ہی حیرت ہوئی تھی۔ یہ وہ ناشتا تھا جسے رنگ ماسٹر "طاقت سے بھرپور ایک دم بم فولادی ناشتا" بتا رہا تھا!

اس نے پوچھا، "جب کچھ ملتا ہی نہیں ہے تو تم سب لوگ سرکس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

بادل بولا، "کدھر جاوے؟ سب لوگ کا شناختی پرچی سرکس کے ساتھ ہے۔ ویسے بھی باہر کے حساب سے دم، لیاقت کوئی نہیں ہے۔ نہیں کام ملے گا، نہیں کوئی کدھری گھسنے دیں گا۔"

مرد کو بونی اور رنگ ماسٹر کی سنگت یاد آئی۔ اس نے ویسے ہی، کچھ نہ کچھ کہنے کو، کہہ دیا کہ وہ دو ایک طرف ہیں اور باڈی بلڈر ایک طرف؛ میرے تو خیال میں وہ کچھ دبا ہوا ہے اور خطرے میں ہے۔ رنگ ماسٹر کے پستول سے ابھی مرتے مرتے بچا ہے۔ تم اس کا ساتھ کیوں نہیں دیتے۔ تمہارا بھی فائدہ ہے۔

بادل یہ سب سن کے ہنسا، کہنے لگا، "آسو بِلا بھی ایک حرامی ہے۔ انھی کا آدمی ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہو؟ وہ جو آسو کو دھتکارتی تھی، وہ کیا تھا؟ ـــــ بھئی سب ناٹک تھا۔ اصل پوچھو تو وہ آسو

ہی کا عورت ہے۔ رنگ ماسٹر کو تو بس ابھی پہنسا رکھا ہے۔ یا پھر سمجھو کسی کی بھی نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کو فلک شیر کے خیمے میں گئی ہے۔ ادھر سے اپنی تسلی کرا کے بلّے کے ٹینٹ میں جا کے پڑ جائے گی۔ چوما چاٹی کر کے اس مُردار کو منائے گی۔ کمپوڈر کو ٹھڈے مار مار کے بلّے کے بازو پر ایک دم نئی بینڈیج لگوائے گی۔ بھلے ہی اسے بخار ہووے نہیں ہووے، سر پے ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھے گی۔ پھر شام تک اُدھری پڑی سوتی رہے گی۔"

مرد نے کہا، "خوب!"

"شام کے بعد شو چلے گا۔ شو کے پیچھے وہ فلک شیر کے خیمے میں جا سوئے گی۔ سب کو پتا ہے۔ آسو کے گولی پڑنے کی خبر لے کے بونا بھاگا بھاگا اُدھر ہی گیا تھا۔"

"عجیب بات ہے!"

بادل بولا، "بس ایسا ہی انتظام ہے۔" ـــ "انتظام" کا لفظ کہتے ہوئے اس نے کراہت ظاہر کی تھی۔

"یہ بتاؤ، اب جو گولی چلی ہے اور بِلا زخمی ہو گیا ہے تو رنگ ماسٹر کے اور اس کے بیچ دشمنی نہیں ہو گئی؟"

"ہاں برابر ہو گئی۔ مگر یہ سب وقتی دشمنی ہے۔"

مرد نے دھیرے سے کہا، "عورت پہ ان کی دشمنی نہیں ہوتی ـــ سیبوں پہ ہو گئی؟"

"عورت؟ کیسا عورت؟ ـــ وہ عورت مورت نہیں ہے۔ پاٹنر ہے بھئی، ہم نے بولا ہے نہیں۔ سب چیز میں وہ بھی حصّہ بٹاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے ان لوگ کا دوستی دشمنی سب ٹائم ٹائم سے ہوتا ہے۔ کتنی دفعے وہ مردار اس کو اٹھا کے پھینک چکا ہے۔ کبھی یہ اس پر فیر کرتا ہے، کبھی وہ کرتا ہے۔ مرتا کوئی نہیں۔ بھاگتا کوئی نہیں۔ ہر بار سیزن کے شو ختم ہونے پہ یہ لوگ یار دوست بن جاتا ہے، حصّہ بخرا کرتا ہے۔ ہم لوگ کو تسلی دیتا ہے، بولتا ہے انتظار کرو۔ بونی اپنی کہتی ہے۔ باڈی بلڈر اپنی کہتا ہے۔ وہ بولتا ہے میں رنگ ماسٹر کی کمر توڑ دوں گا، بس دیکھتے رہو۔ فلک شیر کہتا ہے، آسو بلّے کو زندہ نہیں رہنے دینا ہے۔ دوست! ابھی یہ بھی ہو سکتا ہے بلّے کے ٹینٹ میں اس وقت وہ خود بھی بیٹھا ہووے۔ تین گلاس سامنے رکھے، بوتل کھولے لگا پڑا ہو یا پھر کھڑے ہو ہو

کے ٹھک ٹھک ایڑی بجا بجا کے بلنے کا اور بونی کا گلاس بھرتا ہووے یا آنکھ مار مار کے ٹھٹھے لگاتا ہووے۔۔۔ ان لوگ کا ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔"

مرد اور کیا کہتا، اس نے کہا، "ان کو مار کے نکالو۔ سرکس تو تمہی لوگ چلاتے ہو۔ بس، چلاتے رہو۔"

بادل بلوچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے اپنی سنجیدہ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

جنریٹروں کی آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا باہر دن نکل آیا ہے۔

مگر یہ کون بتاتا کہ نکلا بھی ہے کہ نہیں ۔۔۔ سبھی تو اندر تھے۔

وقائع نگار

فلم دیکھنے نکلا تھا، نہ ویزا لیا تھا نہ کچھ۔ ڈالڈا کے ڈبے بھر کے ایک ٹرک جا رہا تھا۔ مولو کہنے لگا، جاتا ہے تو اس میں چلا جا، فلم دیکھ کے آ جانا۔ میں نے کہا ہَو! پر یار دیکھ لے کہیں اُدھر کے ٹلّے نہ پکڑ لیں۔ مولو بولا، ہندو جیسی تو شکل ہے تیری۔ کوئی شک بھی نہیں کرے گا۔ چلا جا، چلا جا، ہرو بھرو ڈرتا کیوں ہے؟ کوئی گڑبڑی ہو تو ایسے ایسے کرنا۔ اُدھر، فلاں فلاں جگہ جانا۔ ایک بہت بڑا سرجن ہے دُوبے، اس کو ملنا، ایسا ایسا بولنا۔ وہ تیرے کو سیٹ کر دے گا۔ میں نے کہا، لے پھر میں چل پڑا... اور میں ٹرک پہ چڑھ گیا۔

پہنچ گیا۔ فلم دیکھی۔ بہت مزا آیا۔

مگر فلم دیکھ کے نکل رہا تھا کہ ٹُلّوں نے دیکھ لیا۔ پہچان گئے کہ اِدھر کا نہیں اُدھر کا ہے۔ یااللہ خیر! میں ڈپٹ لیا۔ وہ پیچھے پیچھے سیٹی بجاتے ہوئے۔ خیر جی، جیسا مولو نے بتایا تھا ویسا ہی میں نے کیا۔ جدھر جانے کا بولا تھا، گیا۔ گھستا چلا گیا۔ ادھر بہت بڑا سرجن تھا دُوبے اس کو ملا۔ وہ بولا، "یہ کوئی مَسلائی نہیں ہے، میں سیٹ کرا دوں گا۔" تو خیر جی، اس نے سیٹ کرا دیا۔

اس نے کسی سے فون پہ بات کی۔ ایک آدمی آیا۔ وہ میرے لیے بھی ہاسپٹل کے نوکروں کا اوور آل، ٹوپی، جوتے، دستانے، منہ پر باندھنے کا ماسک... یہی سب اٹرم سٹرم لایا تھا۔ میں نے سب کچھ پہن لیا۔ ہم ہاسپٹل کی اصل بلڈنگ سے ٹرالیاں دھکاتے ہوئے ایک چھت پڑے رستے پر آ گئے۔ میں نے جگہ سمجھنے کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو پھولوں کے قطعوں اور رنگین پتوں والی

جھاڑیوں کے پار، پورچ میں حلوں کی دو گاڑیاں رکتی دیکھیں۔

میرا ساتھی اپنے ماسک کے نیچے سے بڑبڑایا، "لو دیکھو، آ گئے سالے۔ دیری نہیں کرتے۔" ہم وارڈوں کے پیچھے جونیئر اسٹاف کے کوارٹروں والے علاقے میں نکل لیے۔

میرے ساتھی نے ٹرالی روک کے ایک کوارٹر دکھایا جس کا نمبر تیرہ تھا۔ کہنے لگا، "یہ میرا کوارٹر ہے۔ اب یہ ہم دونوں کا ہے۔"

میں نے پوچھا، "تم اکیلے رہتے ہو؟"

کہنے لگا، "نہیں۔ میں رہتا ہوں، میری بیوی پدما رہتی ہے۔"

میں بولا، "اچھا۔"

"مالوم ہے؟ ہماری جبان میں پدما کسے کہتے ہیں؟"

میں خوب جانتا تھا۔ میں نے کہا، "ہاں، کنول کے پھول کو۔"

وہ ہنسا۔ کہنے لگا، "دو کمرے ہیں اس کوارٹر میں۔ ایک میرا اور پدما کا ہے، دوسرا اب تمھارا ہو جائے گا۔"

میں نے کہا، "میری وجہ سے تم لوگوں کو تکلیف تو نہیں ہو گی؟"

"کاہے کی تکلیف؟ تم سکل سے اچھے آدمی لگتے ہو۔ پدما کو چنتا نہیں ہو گی۔"

"ہوں۔" میں اور کیا کہتا۔

وہ بولا۔ "گھر کا تو یہی ہے۔ گھر والی کا مجاج دیکھ کے چلنا پڑتا ہے۔ تین مہینے پیچھے بھی ایک مسلمان بھائی کو میرے کوارٹر میں ٹھہرایا تھا ڈاک صاب نے۔ پر وہ کیسا آدمی تھا؟ میں گھر میں نہیں ہوتا تھا تو پدما سے الٹی الٹی باتیں کرتا تھا۔"

مجھے ضرورت نہیں تھی جو پوچھتا کہ کیسی الٹی الٹی باتیں کرتا تھا، اس لیے چپ رہا۔

وہ خود ہی خاصا بکی آدمی تھا۔ بولا، "کبھی وہ کہتا تھا ہاسپٹل میں بھوت ہوتے ہیں۔ دن ڈوبنے اور دن نکلنے کے بیچ کھلے پھرتے ہیں۔ جس کسی کو نجر آ جائیں بس اس کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں... سالا ڈراتا تھا پدما کو۔"

میں نے بات ختم کرنے کو کہہ دیا کہ ہاں بعض لوگوں کو ایسی بے کار باتیں کرنے کا شوق

ہوتا ہے۔

"نہیں، بے کار باتیں نہیں تھیں۔ بڑا ہُسیار تھا۔ کہتا تھا مجھے بھوت اتارنا آتا ہے۔ اور کھبر نہیں کیا کیا آتا تھا اس کو۔ لالچی نہیں تو۔"

میں نے سوچا کوئی عیار آدمی ہو گا۔ ان میاں بیوی سے پیسے کھینچنا چاہتا ہو گا۔ یہی بات میں نے اس سے کہی تو پوچھنے لگا کہ عیار کسے کہتے ہیں؟ میں نے بتا دیا۔ وہ چالاکی سے ہنسا۔ بولا، "عیار جیسا عیار! باتوں میں چلا کے کام نکالنا چاہتا تھا۔"

مجھے رستے میں رکے رکے اُلجھن ہونے لگی تھی۔ میں نے پھر بات ختم کرنے کو کہا، "ہاں بڑے بڑے نوسر باز ہوتے ہیں۔ ہر ایک سے رقمیں کھینچنے کے چکر میں رہتے ہیں۔"

وہ ہنسا۔ "ہاں جی۔ پر وہ اور بھی چکر میں تھا۔ مالوم ہے؟ ایک دفے میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس نے ہمارے کمرے کا دروجا تھپتھپایا۔ دو بجے ہوں گے رات کے۔ پدما اکیلی تھی۔ پوچھنے لگی کیا بات ہے؟ بولا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ابھی ابھی بھوت نجر آیا تھا۔ اگر کوئی وانده نہ ہو تو مجھے اپنے کمرے میں آ جانے دو، ایک طرف پڑ رہوں گا... اور بولا، آدمی دو ہوں تو بھوت کچھ نہیں کہتا... کچھ سمجھے بھیا؟ وہ سالا کس چکر میں تھا؟"

اس آدمی کی باتیں سن کر مجھے خفت سی ہونے لگی تھی۔ کس قسم کا آدمی ہے؟ مجھے یہ سب کیوں سنا رہا ہے؟ میں "ہوں" کہہ کہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

وہ اپنے بیان کے جوش میں کہتا چلا گیا۔ بولا، "ہم نے کچھ کیس چھپا کے رکھا تھا۔ ہمارے ہی کمرے میں تھا۔ کوئی چار ہجار کے نوٹ ہوں گے۔ پدما نے سوچا یہ مسلمان بھائی پیسے ہتھیانے کے چکر میں بھوت ووت سے ڈرنے کا پاکھنڈ رچا رہا ہے۔ اصل تو کمرے میں آنا چاہتا ہے۔ کھبر ہے اس نے کیا کیا؟"

میں کچھ نہ بولا تو اس نے دوبارہ اسی لہجے میں پوچھا، "کھبر ہے کیا کیا پدما نے؟"

میں نے بےزاری سے کہا، "اس نے دروازہ نہیں کھولا ہو گا۔"

"ناں ناں جی، وہ بہت ہُسیار ہے۔ اس کو بولی تو جا اپنے کمرے میں۔ میں ادھر ہی آتی ہوں، دیکھتی ہوں کیسا بھوت ہے۔ اور جب وہ ٹل گیا تو اپنے کمرے میں تالا ڈال، پدما ترنت دوسرے

کمرے میں کُھد پہنچ گئی۔ بولی، لے، ہو گئے دو آدمی... اب تو بھوت کچھ نہیں کہے گا۔ آ جا، ادھر لیٹ جا... یہ لے اپنا تکیہ... ہاہاہا... دیکھا؟ اس سالے کی کوئی بھی چالاکی نہیں چلنے دی پدما نے۔"

میں اس گدھے کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ یا تو یہ بالکل ہی گیا گزرا بے عقل آدمی ہے، یا اپنی پدما کی طرح بہت ہُشیار ہے اور یہ سب سنا کے مجھے کوئی پیغام دینا چاہتا ہے۔ سالا، گرا ہوا آدمی! مگر میں چپ ہی رہا۔

کچھ دیر وہ اپنی گھر والی کی چالاکی پر سر ہلا ہلا کے ہنستا رہا۔ پھر بولا، "یہ کوارٹروں کے آگے مُردہ کھانہ ہے۔"

"مردہ خانہ؟" مجھے دھچکا سا لگا تھا۔ مگر دھچکا لگنے کی کوئی بات نہیں تھی ___ اسپتالوں میں مردہ خانے ہوتے ہی ہیں۔

وہ میری صورت دیکھ کر ایک دم خوش ہو گیا۔ ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ "مردے کھانے کا سن کے ایسا چونکے کیوں؟"

میں نے کہا، "بس ایسے ہی۔ چونکنے کی کیا بات ہے۔ مُردہ خانہ تو ہو گا ہی۔"

بولا، "ہاں مردہ کھانہ بھی ہے، اس کا اسٹاف بھی ہے۔"

میں نے بے دھیانی میں کہا، "اچھا؟"

کہنے لگا، "ادھر اسٹاف میں پہلے ایک ہی آدمی تھا... اب دو ہو گئے ہیں۔"

"اچھا۔" مگر میں نے سوچا، مجھے یہ سب سنانے کی کیا ضرورت ہے؟

"سمزے؟ دو کس طرح ہو گئے؟" پھر پوچھنے لگا، "کھبر بھی ہے کون دو؟"

میں اس کی صورت تکنے لگا۔

کہنے لگا، "کیا اب بھی نہیں سمز آئی؟ ہم دو ہیں نا۔ ایک تم، ایک میں۔ پہلے مُردوں کو سیٹ کرنے کا، ادھر اُدھر پہنچانے کا کام میں اکیلا کرتا تھا۔ اب تم میرے اسٹینٹ ہو کے آ گئے ہو۔ دونوں مل کے سنبھال لیں گے ان سالوں مُردوں کو۔"

وہ چلتے چلتے یہ سب کہہ رہا تھا۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔

حد ہو گئی! مجھے نہ صرف ایک مُردہ گھر کے اٹنڈینٹ کے ساتھ ٹھہرایا جا رہا ہے بلکہ اس کا

مددگار تک بنا دیا گیا ہے۔ اس دوبے کو یہ کیا سوجھی ہے؟
اس نے ــــ پدما کے میاں نے ــــ ٹرالی دھکانا بند کر دی اور مڑ کے میری طرف دیکھنے لگا۔ بولا، "کیا بات ہے؟"
بات کیا ہو گی۔ مجھے اب طرارہ آ چلا تھا۔ میں نے پوچھا، "کیا واقعی میں تمہارا اسٹینٹ ہوں؟"
وہ بولا، "ہاں، کوئی تو ہوتا اسٹینٹ۔ کام کر کر کے میری کمر رہ گئی ہے۔ مردوں کو سلیب پر سے ٹرالی اسٹریچر اور ٹرالی سے سلیب پے چڑھانے اتارنے میں یہ جانو آدمی کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔"
مجھے بہت غصہ آیا۔ جی چاہا دوبے سالے کے کمرے میں گھس جاؤں اور اسے اچھی سنا دوں۔ مگر ہاسپٹل کی مین بلڈنگ پر نظر پڑی تو یاد آیا وہاں پورچ میں ٹُنلوں کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ غصہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔
میں خاموشی سے مڑا اور اپنے مردہ گھر کے انچارج، اس پدما کے میاں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ ٹرالی دھکاتا ہوا سیدھا مردہ خانے تک پہنچا۔ ٹرالی چھوڑ، جیب سے چابی نکال، اس نے دروازہ کھولا اور قطاروں میں بنے چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر رکھی بارہ پندرہ لاشوں سے میرا تعارف کرانے لگا۔
"یہ مرڈر کا کیس ہے۔ اسے برف ورف دے کے ابھی ادھر ہی روکنا ہے۔"
"روکنا ہے" ایسے کہہ رہا تھا جیسے نہیں روکا تو مرڈر کیس والی لاش اُٹھ کے چل دے گی۔ اور یہ "برف ورف دے کے" بھی خوب تھا۔ برف دے کے روکنا ہے، رشوت دے کے روکنا ہے۔
پھر کہنے لگا، "یہ بڑی بی رات میں آئی تھی۔ لکھ پتی لوگ کا مُردہ ہے۔ اسے لے جائیں گے تو دان پُن کرتے ہوئے، نوٹ بانٹتے ہوئے لے جائیں گے۔ تمہارے میرے حصے میں بھی ٹھیک ٹھاک کچھ ٹپ آ جائے گی۔ اور یہ... اِدھر والا بڈھا۔ یہ کنگلا ہے۔ اس کی بھلی چلائی ہے۔ اسے برف دینے کا نہیں ہے۔"
میں چپ رہا۔ مردہ گھر کے سب پنکھے گھوں گھوں کر کے چلتے رہے۔
اسی طرح ایک ایک مردے کے بارے میں خبریں دیتا وہ اس ٹھنڈی، دواؤں کی بو سے

بوجھل ہوا میں مجھے لیے لیے گھومتا پھرا — جیسے خود سیر کر رہا ہو اور مجھے سیر کرا رہا ہو۔

ایک مردے کو دکھا کے بولا، "یہ جیب کترا تھا، پولیس کی مار چڑ سے مرا ہے۔ مگر دیکھو اس کے انگوٹھے سے بندھے کارڈ پے لکھا ہے کہ نمونیے میں چل بسا... سالے جھوٹے کہیں کے! اور اسے دیکھو موٹے توندل کو۔ یہ جبھی جندہ تھا تو بڑا دھرماتما بنتا تھا۔ اس کے سینکڑوں بس مطلب چیلے، پیار کرنے والے بس آتے ہی ہوں گے اسے لے جانے... تم ڈر رہے ہو کی اتی بھاری لاس ہے، ہم کیسے کھسکائیں گے، کیسے ٹرالی پہ رکھیں گے... ناں ناں، ہمیں ہاتھ بھی نئیں لگانا پڑے گا۔ اس کے ساگرد یہ موٹے موٹے تگڑے لڑکے جے جے رام، جے سیارام کرتے گھس آئیں گے اور اسے اُٹھا لے جائیں گے جیسے چیونٹیاں نکتی دانے کو اُٹھا لے جاتی ہیں۔ نکتی دانہ سمزتے ہو؟"

میں نے کہا، "ہاں، مٹھائی ہوتی ہے۔"

وہ ہنسا۔ کہنے لگا، "اس سالے موٹے دھرماتما کے چیلے بانٹنے کو مٹھائی اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔ لاس کو لے جاتے وکھت سے مٹھائی بانٹنا سروع کر دیں گے... بس، نیم ہے ان کا۔ مٹھائی وہ سب سے پہلے تمہیں اور مجھے دیں گے۔ کھیال سے لینا، دونوں ہتھیلی جوڑ کے۔ اور جتنی بھی دیں لے لینا، گرنے مت دینا۔ جرا سی بھی گری نہیں تو حرامی مار مار کے تمہارا بھرتا بنا دیں گے۔ بھرتا سمزتے ہو؟"

وہ اسی طرح بکواس کرتا چلا۔ بارہ تیرہ میں سے ایک کسی مسلمان کی میت بھی تھی۔ مجھ سے کہنے لگا، "یہ تمہارا مسلمان بھائی ہے۔ کھبر ہے مجھے کیسے پتا لگا؟"

میں نے ویسے ہی بے خیالی میں پوچھ لیا، "کیسے؟"

وہ ہنسا۔ بولا، "کیسے پتا چلا؟ جب ٹھنڈے پانی کا ساور مارنے کو اس کا کپڑا میپڑا سب اتار کے پھینکا تو دیکھا کی..."

میں نے جلدی سے کہا، "ہاں ہاں... اچھا اچھا... ظاہر ہے۔"

پھر کہنے لگا، "یہ ٹرالی ادھر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ آؤ کوارٹر پہ چلیں، کچھ کھا پی لیں۔"

وہ کھانے پینے کا ذکر اس بے تکلفی اور شوق سے کر رہا تھا جو گھر کے باورچی خانے ہی میں اچھی لگتی ہے۔

میں نے منہ بنا کے ٹال دیا کہ ابھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔

بولا، "کوئی نئی بات نہیں ہے بھیّا ــــ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ مُردوں کی اُٹھا دھری کر کر کے بھوک تو کھل کے لگنے لگتی ہے، پر جب نوالہ توڑو تو حلق سے نہیں اترتا۔ پہلے پہل سبھی کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم تو مسلمان بھی ہو، تمہارے ساتھ تو اور بھی مُشکل ہے۔"

"اور مشکل کیسی؟"

"ارے یہی نا کی تم لوگ ماس کھاتے ہو۔ ماس سمجھتے ہو؟ ارے گوست اوست... اور ادھر کا تو تم جانو یہاں سے وہاں تک گوستی گوست..."

میں نے پھر بات کاٹ دی۔ "ہاں ہاں سمجھتا ہوں... آؤ چلو۔"

وہ ہنسا۔ چلتے چلتے رکا۔ مڑ کے لاشوں کی طرف مسکراتے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا، "او کے بے بی... سی یو! ہاہاہا... پتا ہے امریکن فلموں میں بڑی بڑی جوان لڑکیوں کو بے بی بولتے ہیں... ادھر آج ایسی کوئی جوان لڑکی تو نہیں ہے۔ ایک سنتھالی عورت ہے تھوڑی جان دار... ہاہاہا... وہ کوئی کھاس نہیں ہے کالی کلوٹی ہے۔ پر بھیا جی... ادھر تو کبھی کبھی ایسی فل فلوٹیاں آتی ہیں کہ بس سانس مارتے رہو اور دیکھتے رہو۔ ایک ڈچ عورت آئی تھی، عورت کیا لڑکی... اسے گولی مار دی تھی دوسری ڈچ عورت نے۔ بھیا جی! پہلے میں سمجھتا تھا جیسا آدمی کا سر کا بال ہوتا ہے ویسا ہی اس کا... پر یار اوئے ہوئے ہوئے..."

میں نے کندھے پہ ہاتھ مار کے اسے آگے کر لیا۔ "چلو... چابی سنبھال لو۔ میں کنڈا کھینچ کے تالا دبانے والا ہوں۔ بعد میں مت کہنا کہ چابی اندر رہ گئی ہے۔"

وہ بڑبڑا کے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ "نہیں نہیں، ٹھیک ہے ٹھیک ہے... تم دبا دو تالا، یہ رہی چابی۔"

خدا خدا کر کے اس کی بکواس بند ہوئی۔

اس کے کوارٹر پر آئے تو دیکھا باہر تالا پڑا ہے۔ تالا کھولتے ہوئے بتانے لگا کہ اس کا ناشتا بنا کے پدما سبزی ترکاری لینے بازار چلی جاتی ہے۔ وہ جب تک آئے ہمیں بریک فاسٹ کر لینا چاہیے۔ کہنے لگا، "پر یار، تم تو منے کر رہے ہو۔ پھر اکیلے بریک فاسٹ کرنے میں کیا مجا... پدما آئے

گی اسی کے پاس بیٹھ کے میں کچھ کھا پی لوں گا۔ تو پکی بات؟ تم کچھ نہیں کھاؤ گے؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ صحن میں تلسی کے پودے کا سنگھاسن تھا جس کے قدموں میں گیندے کے پھولوں سے اُبلتی ایک کیاری تھی۔ آنگن کو خوب جی لگا کے جھاڑا بُہارا گیا تھا۔

پدما کے گھر والے نے ایک کمرے کا تالا کھول دیا۔ کہنے لگا، "یہ تمہارا کمرہ ہے۔ یہاں بسترا ہے، ایک کرسی بھی پڑی ہے اور یہ دیکھو فرس پہ ستیل پاٹی ڈالی ہوئی ہے۔ چٹائی، چٹائی... تنکوں کی چٹائی سمزتے ہو؟ بس تو مرجی ہے بستر پہ لیٹو، مرجی ہے سیتل پاٹی پہ بیٹھو لیٹو، یوگا کرو... تم یوگا کرتے ہو؟ نہیں کرتے ہو گے۔ مسلمان بھائیوں میں یوگا کی چرچا نہیں ہے، وہ تو ایک ہی کام جانتے ہیں... بلکی دو کام... ماس کھاتے ہیں اور ماس سے ماس... ہاہاہا... برا مان گئے؟ چلو چھوڑو، میری مسکھری کی آدت ہے۔ تو اب جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔ کوئی چیج کی جرورت ہو مجھے یا پدما کو آواج دے لینا۔ چھوٹے موٹے کام کھشی سے کر دیتی ہے، برا نہیں مناتی پدما۔ بولتی ہے مہوان کی ٹہل سیوا میں ایسی کون اَڑچن ہے... اچھا!"

"اچھا" کہہ کے جیسے ہی وہ سامنے سے ہٹا، کسی نے دروازہ تھپتھپایا۔ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ "آ آ پدما رانی! اچھا ہوا دیری نہیں لگائی تو نے۔ دیکھ ڈاک صاب نے اب کی کسے ساتھ کیا ہے۔ دیکھ لے یہ بھی مسلمان بھائی ہے۔ ہاہاہا بھوت پریت سے ڈرے گا یہ بھی۔"

وہ بولی، "چل بکواس نہیں کر۔" اس نے یہ بات غصے میں نہیں اِٹھلا کے کہی تھی۔

پھر وہ سامنے آئی۔

تنگ مراٹھی کپڑوں میں خوب چمک دار سیاہ بالوں کی کسی ہوئی چوٹی اور انگوٹھے کے ناخن جتنے گھماؤ والا ناک کا کوئی دیہاتی زیور پہنے وہ مسکراتی ہوئی دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ سانولا، ہونٹ دبیز اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ وہ بازار سے آ رہی تھی مگر لگتا تھا کچی نیند سے اٹھ کر آئی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کے ہولے سے ایسے مسکرائی جیسے پرانی جان پہچان ہے۔ بولی، "پدما نام ہے میرا۔"

"پدما نام ہے میرا۔"

میں نے بھی بتا دیا کہ کون ہوں۔

وہ ہنسی۔ دانت اس کے ایک دم سفید اور ہنسی کی آواز بچوں جیسی تھی۔ مگر صرف آواز ہی بچوں جیسی تھی۔ دیکھنے میں تو اس کی ہنسی کسی بہت جانکار عورت کی ہنسی تھی ــــ گھیرتی اور اُلجھاتی ہوئی۔

وہ کمرے میں آنے کو بڑھی تو اس کا آدمی کہنے لگا، "چل چھوڑ! اسے لیٹنے بیٹھنے دے۔ یہ ابھی کچھ نہیں کھائے گا۔ بولتا ہے بھوک نہیں۔"

"اچھا اچھا۔" کچھ دیر وہ دروازے میں رکی رہی۔ پھر "ہاں" میں سر ہلاتی اور چالاکی سے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

میں بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا یہ کن لوگوں میں آ گیا ہوں۔ یہ دونوں بھلا کس چکر میں ہیں؟

بڑے شہروں کا یہی ہے۔ سب طرح کی مخلوق آ کے بس جاتی ہے۔ میرا کیا ہے، ایک آدھ روز میں نکلنے کا آسرا ہو جائے گا۔ ابھی سنبھل کے گزارا کر لوں۔ دیکھا جائے گا۔ اور یہ ہے کہ محنت سے جان چُرانے والا آدمی نہیں ہوں میں۔ پھر بھی... مُردے؟ اللہ خیر کرے۔

کچھ دیر بے چینی سے کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا رہا، پھر بستر پر جا لیٹا۔

نہ معلوم کتنی دیر سوتا رہا۔ کسی کے اٹھائے بغیر آپ ہی آپ بیدار ہو گیا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ یاد آیا میں پورے کپڑوں میں موزے پہنے پہنے سویا تھا مگر اس وقت بھاری چادر سی اوڑھے اُٹھا تھا۔ گھبرا کے میں نے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو ہاتھ لگایا۔ بدن پر میرے اپنے کپڑے نہیں تھے۔ نہ معلوم کیسے میں نے لمبا اونی انڈرویئر اور پوری آستینوں والی بنیان پہن رکھی تھی۔ موزے بھی اترے ہوئے تھے۔ یہ کیا چکر ہے؟ میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میرے اپنے کپڑے سلیقے سے تہہ کیے ہوئے سرہانے رکھے تھے اور... میں نے دیکھا فرش پر بچھی ستیل پاٹی پہ چادر اوڑھے کوئی لیٹا تھا۔

ابھی میں پوری طرح کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ ستیل پاٹی پر لیٹے ہوئے نے کسما کے کروٹ بدلی، چادر سرک گئی اور خوب گندھے ہوئے سیاہ چمکیلے بالوں کی چوٹی جیسے خود اپنی طاقت

سے اچھلی اور تنکوں کی ٹھنڈی چٹائی پر جا پڑی۔

اللہ خیر کرے، میں نے دل میں کہا۔ پھر کانسی کے کنگن بجے اور چادر پھینکتی ہوئی مردہ گھر کے انچارج کی عورت پدما تنکوں کی چٹائی پر اٹھی اور آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

مراٹھی لباس اس قابل نہیں ہوتا کہ کوئی بھی صحت مند عورت فرش پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ سکے۔ ویسے زیادتی کی بات الگ ہے ـــ کوئی دھاندلی پر ہی تل جائے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

وہ عورت پدما دھاندلی پر تلی ہوئی تھی۔ اسی جان کار چالاک طریقے سے ہنسی اور بولی، "ساری دوپہری سو کے نکال دی۔ ہاں؟"

میں نے چادر سے خود کو اور اچھی طرح لپیٹ لیا اور سرہانے تہہ کیے رکھے اپنے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، "یہ یہاں کس نے رکھے؟"

"میں نے رکھے۔ اور کون رکھے گا؟" وہ چمکتے دانتوں کے شرارے میں بولی اور میں سناٹے میں آ گیا۔

میں جو کچھ پہنے ہوئے تھا پتا نہیں وہ کہاں سے آیا ہو گا۔ اسے میں نے اپنے بدن پہ خود نہیں چڑھایا تھا۔ یہ تو میرا تھا ہی نہیں، اور سب سے بڑی بات، میرے بدن پہ یہ آخر چڑھایا کس نے؟

میں نے پوچھا، "جو میں پہنے ہوں... یہ کس نے پہنایا ہے؟"

"سمپورنا نے۔" اس عورت نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی تھی۔

"سمپورنا؟ کون سمپورنا؟"

"سمپورنا، میرا آدمی، اور کون۔"

"اس نے؟... اس نے کیوں...؟"

وہ بات کاٹ کے اٹھلا کے بولی، "وہ نہیں پہناتا تو کیا میں پہناتی؟... وا رے وا!"

اور وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے جیسے شرما کے ہنسنے لگی۔

مجھے غصہ آ رہا تھا۔ "مگر یہ کیوں کیا؟ تیرے آدمی کو آخر ایسی کیا...؟"

"لو!" وہ الٹا برا مان گئی۔ "تیرے کپڑے سوتے میں مسل رہے تھے، یہ کون برا کیا ہم

سے؟"

میں نے اسے ڈانٹا۔ "کس قسم کے لوگ ہو تم؟ کیا ضرورت تھی بھلا؟ اور یہ بنیان کچھا جو پہنایا ہے، کس کا ہے یہ؟ کہاں سے آیا ہے؟"

میرے ڈانٹنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اپنے بھرے بھرے ہونٹوں کی چونچ سی بنا کے بولی، "میرے کو کیا کھبر کس کا ہے؟"

کہاں سے آیا ہے؟"

"آئے گا کہاں سے؟ ارے وہی سمپورنا مُردے گھر سے اٹھا یالایا ہوگا۔"

"مُر...؟" میں چادر پھینک کے اُٹھا۔ پھر فوراً ہی خود کو چادر میں لپیٹ کے بیٹھ گیا۔

وہ مجھے کچھا پہنے دیکھ کے آنکھوں پہ ہاتھوں کی اوٹ کیے گھوم گئی تھی اور بے رکے ہنسے جا رہی تھی، دھیرے دھیرے کہے جا رہی تھی، "بے سرم نہیں تو... بے سرم۔"

اس سالے سمپورنا نے مجھے کسی مُردے کا انڈرویئر بنیان پہنا دیا ہے۔ میں غصے میں جیسے کانپتا لرزتا، کپڑے اٹھا کے باہر بھاگا۔ عورت کے ہنسی سے بے حال ہونے کی آوازیں رسوئی تک آتی رہیں۔ چھوٹے سے کوارٹر میں غسل خانہ کہاں سے آتا۔ میں نے رسوئی گھر میں سیمنٹ کا چبوترا بنا دیکھ لیا تھا۔ صابن تھا، پانی سے بھری ایک بالٹی بھی رکھی تھی۔ انڈرویئر بنیان پھینک جلدی جلدی میں نے صابن ملا، ڈونگے سے خود پر پانی بہا لیا اور جیسے تیسے کپڑے پہن کے سردی سے کانپتا واپس اپنے بستر پر آ گیا۔

وہ اب بستر پر بچھی چادر کی سلوٹیں درست کرنے کے بعد پٹی پر بیٹھی مزے سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔

مجھے بھیگا ہوا اور سردی سے کانپتا دیکھ کے بولی، "دیکھا؟ کیسا چلایا تجھے۔ ارے بدھو! تو نے دیکھا بھی نہیں۔ بالکل نیا نکور کچھا بنیان ہے۔ سمپورنا کے لیے لائی تھی۔ ابھی پیکن بھی نہیں کھولی تھی اس کی... کیسا چلایا تجھے... دیکھا!" پھر ہنستے ہوئے بولی، "سردی کے ٹیم تجھ سے سنان کرنے کو بولتی تو صاف منے کر دیتا۔ اب آیا نا جھٹ پانی ڈال کے... صابن کی مست کھس بو آ رہی ہے تیرے پاس سے۔"

بکواس عورت تھی۔ میں نے چادر کھینچ کے خود کو سردی سے بچانے کے لیے لپیٹنا شروع کر دیا تو ہاتھ بڑھا کے وہ میری مدد کرنے لگی۔ میں نے ہاتھ جھٹک دیا تو جھوٹ موٹ کے غصے میں بڑبڑانے لگی، "دیکھو رے کیسا ناکدرا موان ہے۔ ہم سیوا کرتے ہیں، یہ سُسرا گھُنہ ہوتا ہے۔"

میں ایسا کون گل فام ہوں کہ کہیں جاؤں تو عورتیں لڑکیاں جان کو آ جائیں ___ مگر جو ہو رہا تھا سامنے تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اس سرجن سے مل کے درخواست کروں کہ میرا پیچھا چھڑاؤ اس مردہ گھر اسٹاف سے۔ بے شک جب تک میرا ٹرک نہیں آ جاتا، رہائش کی اجرت میں وہ مجھ سے کام لے لے۔ میں ہر طرح کی محنت مشقت کر لوں گا۔ ہاسپٹل کے کچن میں برتن دھونے، سبزی ترکاری صاف کرنے، کاٹنے تیار کرنے تک پہ راضی ہوں۔ وہ مالی کا کام دے دے یا کچھ نہیں تو وارڈ بوائے کا اسسٹینٹ بنا دے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

ابھی میں پوری طرح اپنی درخواست سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ عورت بڑی سی تھالی میں کچھ کھانے کو لے آئی۔ بولی، "کھانے کا ٹیم نکال دیا۔ چھوٹا بریک فاس کر لے۔ پھر بڑا کام کرنا ہے۔"

میں نے پوچھا، "کیسا کام؟"

بولی، "کتنے ہی دن کے رکے ہوئے کام ہیں۔"

"رکے ہوئے؟" میں نے پوچھا تو اس نے "ہاں" میں سر ہلایا؛ یہ نہ بتایا کہ کس طرح کے کام ہوں گے۔

ناشتے میں سوجی سے بنا نمکین حلوہ تھا جسے ساؤتھ میں اُپما کہتے ہیں۔ ایک بڑا سا خوشبودار قلمی آم اور دو میٹھی چیوڑا تھا کھٹ مٹھا۔

میں نے خاموشی سے جا کے کُلی کی، ہاتھ دھوئے اور شوق سے یہ انوکھا مزے دار ناشتا کیا۔ وہ تھال واپس لے گئی اور دو گلاس بھر کے چائے لے آئی ___ ایک خود اس کے لیے تھا جسے وہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے آلتی پالتی مار کے میرے سامنے چٹائی پر بیٹھ کر پینے لگی۔

مگر وہ جس طرح بیٹھی تھی اس سے کوئی بھی اُلجھن میں پڑ سکتا تھا۔

کیسری، کستوری چاے۔"

مجھے معلوم نہیں تھا کیسری کستوری چاے کیا ہوتی ہے۔ میں نے پوچھ لیا۔

بولی، "جافران اور جڑی بوٹی ملاتے ہیں چاے میں۔"

میں نے سوچا ہو گی کچھ، تفصیل کیا پوچھنی۔ وہ ٹکٹکی باندھے میری صورت دیکھتی رہی۔ دیر تک میں کچھ نہ بولا تو کہنے لگی، "تو نے پوچھا نہیں کستوری چاے ابھی کیوں نہیں بنائی میں نے تیرے لیے؟"

میں نے کہا، "اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟"

بولی۔ "ہے ایک بات۔ پر میں تجھے بتاؤں گی نہیں۔ تو سمجھے گا بالکل کھیال نہیں ہے، لاج سرم بیچ کھائی ہے پدمانے۔"

"چاے بنانے نہ بنانے میں لاج شرم کیسی؟"

بولی، "جب بتاؤں گی نا تو تیری سمز میں آ جائے گی سب بات۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی اپنے میاں کی طرح بکواسی ہے اس لیے چپ رہا۔

اچانک پوچھنے لگی، "تو نے کبھی عورت رکھی ہے؟"

ابے تے! یہ کس قسم کا سوال ہے؟ میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ اپنی زبان رخسار میں لگائے، چھوٹا سا ایک شریر ٹیلا بنائے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔

میں نے کچھ الجھن، تھوڑی جھونجل کے ساتھ اسے دیکھا تو خود ہی بولی، "نہیں رے، لگتا ہے بالکل کورا ہے۔ پھر تو کیسری کستوری تجھے نہیں بچے گی۔ ابھی نہیں پلاؤں گی۔ جب سمپورنا کدھری سے کوئی جنانی تیرے لیے گھیر کے لائے گا اسی ٹیم کیسری چاے دوں گی تیرے کو... اور کیا! دوسری جنانی نہیں ہوئی تو مجھے کوئی اپنے لیے مصیبت بلانی ہے؟ چاے پی کے تو تُو نے بے ناتھ کا بجار ہی بن جانا ہے۔ میری تو سامت آ جائے گی... میرا سمپورنا بےچارہ! اور جو اس نے کوئی بات کہہ دینی، روک ٹوک کرنی، تو تم دوئی جنے سانڈوں کی طرح پل پڑو گے ایک دوسرے پہ۔ ناں رے ناں... ہی ہی ہی۔"

وہ ہنستی رہی۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ ابھی دو بے جی سر جن سے مل کے

یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔ ایسے گزارا نہیں ہو سکتا بھائی ـــــ انسان کا بچہ ہوں، فرشتہ نہیں ہوں، ہاں۔

میں ہاتھ دھو کے آیا تو وہ پلاسٹک کی ایک بالٹی میں صابن اور اسپنج کا ٹکڑا ڈالے صحن میں آ کھڑی ہوئی۔ صورت سے لگتا تھا کہ کام کا موڈ بنا کے آئی ہے۔ اب وہ چھیڑ چھاڑ، کھلواڑ کے موڈ میں نہیں تھی۔

میں نے پوچھا، "کیا کرنا ہے؟"

بولی، "کام۔ یہ ایک بالٹی پونچھا تیرے باسطے اُٹھا لیا ہے۔ آ جا میرے ساتھ۔"

"جانا کہاں ہے؟"

بولی، "سب کھبر لگ جائے گی۔ آ جا۔"

کوارٹر میں تالا ڈال کے وہ مردہ گھر کی طرف چلی۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ اب کیا وہ مجھے مردے نہلوانے کے لیے لے جا رہی ہے؟ مگر وہ برابر کے کھلے شیڈ کی طرف مڑ گئی۔ کھلے شیڈ میں اسٹیل کے ریک کھڑے تھے جن میں ایک ہی سائز کے پلاسٹک کے ٹب جیسے اوپر تلے جمے ہوئے تھے۔ ٹبوں سے دواؤں کی ناگوار بُو اٹھ رہی تھی۔ خاصے موٹے پلاسٹک سے بنے یہ ٹب اتنے بھاری تھے کہ اکیلی پدما ریک سے ایک اتارنا چاہتی تھی تو اس سے اتارا نہ گیا۔ میں نے مدد کی تب کام بنا۔

وہ ریکوں کے پیچھے جا کر ایک اور بالٹی اسپنج اور صابن کا ٹکڑا اُٹھا لائی اور نل میں لگا ربر پائپ سنبھال کے ٹب کو تر کرنے لگی۔ پھر اس نے چکنے پلاسٹک پر اسپنج سے جھاگ بنا بنا کے خوب صابن ملا اور مجھے دکھا دکھا کے بہت دیر تک اسے اندر سے صاف کرتی رہی۔ میں نے اور اس نے ٹب اُلٹ دیا تو پدما نے بتایا کہ باہر کی سطح کس طرح صاف کی جاتی ہے۔ کچھ دیر میں وہ جگمگانے لگا۔ اس کے اشارے پر میں نے وہ صاف کیا ہوا ٹب خالی ریک پر سوکھنے کو رکھ دیا۔

میں اور پدما دو سوا دو گھنٹے اسی طرح مصروف رہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ اگر مجھے ٹب صاف کرنے سنبھالنے کا طریقہ آ گیا ہے تو اب وہ جائے گی؛ اسے اور بہت کام ہیں۔

میں نے کہا، "ہاں تم جاؤ، میں سمجھ گیا ہوں۔"

کافی رات تک میں اسی شیڈ میں پلاسٹک کے ٹبوں کو صاف کر کر کے ریکوں پر رکھتا رہا۔

کافی رات تک میں اسی شیڈ میں پلاسٹک کے ٹبوں کو صاف کر کر کے ریکوں پر رکھتا رہا۔ رات میں کسی وقت سمپورنا آیا۔ کہنے لگا، "چل کوارٹر میں نہادھو کے کچھ کھا پی لے۔"

میں نے کہا، "بہتر!"

سمپورنا اور اس کی عورت کس چکر میں تھے، یہ تو ابھی کہا نہیں جا سکتا تھا۔ مگر عام سوجھ بوجھ کا آدمی بھی جان سکتا تھا کہ یہ جوڑا کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔ پہلے میاں نے اپنے مہمان، کسی مسلمان بھائی کا قصہ سنا کے مجھے بتانا چاہا تھا کہ اس کی پدما کتنی "چالاک" ہے، پھر خود پدما نے اپنی اٹھک بیٹھک، اپنے انداز اور صاف صاف باتوں سے مجھے مائل کرنے اور ڈھب پر لانے کی کوشش کی تھی۔ ان لوگوں سے دور رہنا ضروری تھا۔ ٹھیک ہے، دیکھ لوں گا ــــ صبح تک تو میرے جانے کا کچھ ہو ہی جائے گا۔

ہم دونوں کوارٹر میں پہنچے تو کسی انتظام کے تحت سرجن دوبے وہاں پہلے سے بیٹھا تھا۔ اسٹول کھینچ کے اس نے مجھے بھی بٹھا لیا۔ کہنے لگا، "ٹھیک سے سنو۔ پولیس تمہاری تلاش میں کئی گھنٹے سے ادھر ہاسپٹل میں سرچ کر رہی ہے۔ شام کو آ گئے تھے ہاسٹر ڈ اور اسٹاف سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔"

یہ پریشانی کی بات تھی۔ میں نے تشویش ظاہر کی تو سرجن نے تسلی دی۔ اصل میں وہ احسان جتانا چاہتا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ میری وجہ سے خود وہ خطرے میں آ گیا ہے۔

میں نے کہا، "مجھے پورا پورا خیال ہے کہ میری وجہ سے آپ کی پوزیشن خراب ہو سکتی ہے۔"

اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ پھر بولا، "سمجھ دار آدمی ہو۔ میں پولیس سے بچا تو لوں گا۔ اس میں کھطرہ بھی ہے اور کھد میری اپنی جیب سے کھرچا بھی بہت ہو رہا ہے۔ تو اب بتاؤ بدلے میں تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا، "جو آپ کہیں۔ میں رقم کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ ٹرک آ جائے، آپ جو رقم مانگیں گے ادا کر دوں گا۔ مجھے بس وقت دے دیجیے۔"

دوبے بولا، "کیش رکم مجھے نہیں چیئے۔ میرے پاس بہت پیسا ہے۔ تم سے تھوڑا

کو آپریشن مانگتا ہوں۔ ایسا کرو کی جو آفر اس ٹائم دے رہا ہوں اس میں کھوب سوچو سمجھو، پیچھے مجھے جواب دینا۔"

میں نے کہا، "آپ اپنی شرط یا آفر جو بھی ہے بتاؤ۔"

کہنے لگا، "ایک ساتھ میرے بہت سے آدمی نوکری چھوڑ کے چلے گئے ہیں۔ دبئی میں کوئی ہاسپٹل کھلا ہے اس کی بھرتی سبھی جگے ہو رہی ہے۔ تو لمبی لمبی پے کی لالچ میں سبھی اسکاؤنڈرل چلے گئے۔ ادھر کے کام چور بے ڈھنگے ورکر میں بھرتی نہیں کر سکتا ___ سارا کچھ برباد کر دیں گے۔ اسی لیے چاہتا ہوں کہ جبھی تک میں تمھارے جیسے سمجھ دار اور مجبوط باڈی والے ورکر نہیں بھرتی کر لوں اُس وقت تک تم میرے ہاسپٹل میں کام کرتے رہو۔ پر بھائی جی! یہ جان لو، بدلے میں ٹھہرنے کی جگہ اور کھانا ہی ملے گا۔"

میں نے کہا، "ٹھیک ہے، میں کام کر رہا ہوں۔ کرتا رہوں گا۔ پر پتا تو چلے کہ کتنے دن رہنا، کام کرنا ہوگا؟"

سرجن بولا، "ویسے تو پوزیشن سنبھالنے میں پانچ ویک لگے گا۔ پر میں چار ویک میں چھٹی دے دوں گا کیوں کی تمھارے لیے اگلا ٹرک چار ویک میں آنے کا ہے۔"

میں نے کہا، "یہ تو بہت ٹائم ہے۔"

بولا، "سوچ لو، ایسا ہی ہے... اگلے ٹرک کی ٹائمنگ ایسے ہی سیٹ ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا، "ٹھیک ہے... میرے رہنے کا کوئی اور بندوبست کر دو۔"

پوچھنے لگا، "کیوں؟ سمپورنا کے گھر کوئی تکلیف ہے؟"

میں نے کہا، "میاں بیوی کے بیچ ایک اجنبی آدمی کا رہنا جو نوجوان بھی ہو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔"

سرجن ہنسنے لگا۔ "یہ تمھیں کس نے بتایا کی دونوں میاں بیوی ہیں؟"

میں نے کہا، "کون بتاتا؟ یہی دونوں کہہ رہے تھے۔ پھر رہتے جو ایک ساتھ ہیں۔" میں نے سمپورنا کی طرف دیکھا، وہ دانت نکالے مسکرا رہا تھا۔

"ارے یہ دوست دوست ہیں، میاں بیوی نہیں ہیں۔ ہاں، یہ الگ بات ہے کی بستر

سرجن نے یہ بات سمپورنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی — اس نے پھر دانت نکال دیے تھے۔

میں ان کی صورتیں دیکھتا رہ گیا — یہاں کیسی کیسی باتیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔

"خیر، جو بھی ہو۔ کسی کے ساتھ بھی... چاہے میاں بیوی ہوں یا نہ ہوں... میرا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں تو چھڑے چھانٹ مردوں کے ساتھ بھی رہنے سے پریشان ہوتا ہوں۔ کوئی اکیلا کوارٹر، الگ تھلگ کمرہ ہی دے دو مجھے۔ میں اپنا ٹائم نکال لوں گا۔"

سرجن بولا، "ٹھیک ہے۔ ایک دو دن گجارا کر لو۔ کچھ کر دوں گا۔"

پھر وہ کہنے لگا کہ کام کی ڈیٹیلز تو مجھے پدما اور سمپورنا ہی بتائیں گے، چاہے میں ان کے ساتھ رہوں نہ رہوں۔

"اور کام..." کہنے لگا، "کام سبھی طرح کے آتے رہتے ہیں۔ چنتا نہ کرو، سیکھنے میں کوئی اڑچن نہیں آئے گی۔"

وہ رات ایک بجے تک کوارٹر میں بیٹھا بک بک کرتا رہا۔ اس کے جاتے ہی نہا دھو کے سردی سے لرزتے کانپتے کچھ زہر مار کر کے میں اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا میرے بستر پر میرے کمبل میں پدما لپٹی پڑی ہے۔

یہ کس طرح کا پریشر ڈالا جا رہا ہے؟ لگتا ہے کہ کسی طے شدہ منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔

"کیا چکر ہے؟ جاؤ یہاں سے، جاؤ اپنے کمرے میں۔"

میں نے شور کیا تو وہ اُٹھ بیٹھی۔ اس کے آدمی... مطلب سمپورنا نے میری آواز سن کے پرشور طریقے سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ گویا اپنی طرف سے اس نے اس سارے معاملے سے ہاتھ جھاڑ لیے تھے۔

وہ اسی طرح بستر پر بیٹھی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملے جا رہی تھی جیسے رات کی شفٹ سے گھر لوٹتے میاں کے آنے پر بیوی کچھ آسودہ کہ آ گیا ہے اور نیند خراب ہونے پر کچھ ناراض ناراض سی بیٹھی بستر پر آنکھیں ملتی ہے۔

میں نے دوبارہ اسے بستر خالی کرنے کا اشارہ کیا تو پوچھنے لگی، "ڈاک صاب سے بات ہو گئی تیری؟"

میں بہت چڑ گیا تھا۔ "تجھے میری بات ہونے نہ ہونے کی کیا فکر ہے؟ جا اپنے کمرے میں... سونے دے مجھے۔ تھکا ہوا ہوں اور دیکھ نہیں رہی، کپکی چھوٹ رہی ہے۔"

بولی، "میں تو سب دیکھ رہی ہوں پر تیری سمز میں جرا نہیں آتا۔ لے۔" اس نے آدھا کمبل کھینچ کے جیسے میرے لیے فالتو کر دیا، آدھے بستر پہ میرے لیے جگہ بنا دی۔ "جھگڑنا کیوں ہے۔ آ جا۔"

یہ ڈھٹائی میرے لیے نئی چیز تھی۔ میں نے کہا، "دیکھو، مجھے غلط سمجھ رہی ہو تم۔ اس کوارٹر میں مجھے ایک دو روز گزارنا ہیں۔ تم اگر مجھے اکیلا چھوڑ دو گی تو مہربانی ہو گی تمھاری۔"

کہنے لگی، "میں تجھے کیا کہتی ہوں؟ کوئی کچھ تو نہیں جاؤں گی۔ مرا جا رہا ہے ڈر کے مارے۔ ارے ایک با جو آ کے پڑ جا۔ میری طرف سے تو اکیلا ہی ہے۔ چل تو کہے تو اب بات بھی نہیں کروں گی۔"

مجھے طرارہ آ گیا۔ "ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ اس سمپورنا سالے کو دو ہاتھ مار کے اس کمرے سے نکالتا ہوں۔ یہ ہے تو یہی سہی۔"

وہ اُٹھی، میرے برابر آ کھڑی ہوئی۔ میرے ہاتھ تھام کے (اس کے ہاتھ خوب گرم ہو رہے تھے) خوشامد سے کہنے لگی، "ناں ناں، تو سمپورنا کو ماریٹ مت کرنا۔ میری اس کی لڑائی ہے، بول چال بند ہے۔ میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ نہیں اسے اِدھر آنے دوں گی۔ ارے ایک ہی بار کی تو بات ہے۔ مجھے اِدھر پڑا رہنے دے۔ سبیرے کا مجھے پتا ہے سمپورنا مجھے منا لے گا۔"

میں نے فرش پر بچھی سیتل پاٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "بستر خالی کر دے۔ جا سوتی ہے تو اُدھر جا کے سو جا۔ اِدھر نہیں ٹکنے دوں گا تجھے۔"

وہ جیسے مجبوری میں اُٹھی، میرا کمبل سمیٹتی سیتل پاٹی پہ جا کے خوب اوڑھ لپیٹ کے پڑ گئی۔ بستر پر بس تکیہ اور گدا چادر رہ گئے۔

بستر پر بس تکیہ اور گدا چادر رہ گئے۔

پہلے میں سمجھا یہ اس کی کوئی نئی عیاری ہے۔ مجھے ستانے کو کمبل کھینچ کے چل دی ہے، مگر دو ہی تین منٹ میں وہ سکون سے خراٹے لینے لگی۔

میرے لیے سردی میں نچلا بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ کسی لحاف کے بغیر لیٹتا کیسے۔ نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس کو اُٹھانا یا دوبارہ یہ مسئلہ چھیڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے دیکھا گدّے کے نیچے دری بچھی تھی۔ تو بستر کی دری پر لیٹ میں نے چادر اوڑھی اور جیسے تیسے اپنے اوپر گدا لے لیا۔ کچھ دیر بے چین رہا، آخر میں گرم اور پرسکون ہوتا گیا۔

سویرے کے ساڑھے آٹھ، پونے نو بجے ہوں گے جو اس عورت نے آواز دے کے مجھے اُٹھا دیا۔ نہ معلوم کس وقت اس نے اوپر سے گدا ہٹا کے مجھے کمبل اُڑھا دیا تھا۔

رات کی باتوں کا اثر نہ تو سمپورنا کے نہ پدما کے چہرے پر تھا۔ معمول کے مطابق ناشتے کی اور کام پر جانے کی تیاری کرتے ہوے وہ مجھ سے اِدھراُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔

آج پھر شیڈ میں لے جا کے انھوں نے مجھے پلاسٹک کے ٹب دھونے مانجھنے کی ڈیوٹی دی۔

پدما بولی، "دھلائی سے تجھے لنچ کے ٹیم تک پھُرصت مل جائے گی۔ کوارٹر پے آ جانا، تجھے اور سمپورنا کو چاول دال بنا دوں گی۔"

میں نے سر ہلا دیا۔ کوئی زیادہ بات اس نے بھی نہ کی۔ میں سمجھ گیا اس سے زیادہ بات کرنے میں میرا ہی نقصان ہے۔

لنچ کے وقت تک میں پلاسٹک کے وہ انوکھے ٹب دھوتا سکھاتا رہا۔ کوارٹر پہ آیا تو سمپورنا پدما مجھ سے پہلے آئے ہوے تھے۔ انھیں دیکھ کے لگتا تھا کہ لڑائی کے بعد میل ملاپ ہو گیا ہے، کیوں کہ دونوں بہت پاس پاس بیٹھے تھے۔ دوپہر تھی، پھر بھی پدما نے لپ اسٹک روژ لگائی ہوئی تھی جو اس سالے سمپورنا کے چوکھٹے پر جگہ جگہ اتر آئی تھی۔ عورت نے ہمیں دال چاول اور آم کا اچار دیا۔ کھانا اچھا بنا تھا۔ مجھے اس میں ہینگ کی مہک بھی آئی جو اچھی لگی۔

کھانے کے بعد سمپورنا میرے ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا، "ٹب پورے دھل گئے۔ اب آؤان کی فنِسنگ کر لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا، "کیسی فنشنگ؟"

بولا، "چل تو رہے ہیں۔ دیکھ لینا۔"

کوارٹر سے نکل کے ہم سیدھے مردہ خانے کی طرف چلے۔ سمپورنا نے چابی نکالی، تالا کھولا، اندر کی لائٹیں جلائیں اور دروازہ اندر سے مقفل کرنے لگا۔

میں نے پوچھا، "تالا کیوں ڈال رہے ہو؟"

ہنس کے کہنے لگا، "اس لیے کی تم بھاگ نہیں جاوَ۔"

ایسی کوئی ہنسی کی بات نہیں تھی۔ میں نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا۔ اب وہ بھی سنجیدہ تھا۔ اسی وقت میری نظر سامنے مُردے رکھنے والے سیمنٹ کے سلیبوں پر پڑی۔ وہاں کوئی دو درجن ننگ دھڑنگ، دھلی دھلائی تیار کی ہوئی لاشیں رکھی تھیں۔

مردوں، عورتوں، بوڑھوں، نوجوانوں کی لاشیں، جنھیں دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ پیٹ چاک کر کے ہر لاش کی آلائش نکال دی گئی ہے۔ پلاسٹک اور اسٹیل کے بڑے بڑے ڈرم ایک قطار میں رکھے تھے۔ ان میں وہی دوا ہو گی جس کی ناگوار بُو میں نے دو روز تک ٹب دھوتے ہوئے محسوس کی تھی۔ یہ کسی طرح کی گوشت محفوظ کرنے والی دوا تھی یا کچھ اور... اللہ جانے۔ ڈرموں کے برابر اوپر تلے پلاسٹک کے وہ ٹب رکھے تھے جنھیں میں نے دو دن کی محنت سے دھو سکھا کے جگمگا دیا تھا۔

ابھی میں مردہ گھر میں سجی ان سب چیزوں کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کسی اندرونی کھٹکے سے کوئی بغلی دروازہ کھلا اور سفید کوٹ پتلون، سفید بےداغ گاوَن اور ربڑ کے دستانے پہنے، ربڑ کے اونچے جوتوں میں فرش پر گھس گھس کرتا ہوا سرجن دوبے آیا، بالکل سامنے لاشوں سے پٹے سلیبوں کے درمیان کھڑا ہو گیا اور خوش مزاجی سے بولا، "ہیلو!"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پریشان ہو کے دوبے سے پوچھا۔

وہ بولا، "آج ہم ان ڈیڈ باڈیز کو پیک کریں گے۔"

"کیوں؟" میں لاحول پڑھنا چاہتا تھا، مگر نہ معلوم کیوں میں نے سوال کیا تھا۔

سرجن دوبے سمپورنا کی طرف مڑا۔ "تم نے سمپورنا... اسے کچھ نہیں بتایا؟"

وہ بولا، "ڈاک صاب! میں نے سوچا پہلے سے بتانا کیا جروری ہے۔ ہم جبھی کام کرنے بیٹھیں گے اسے سب کھبر ہو جائے گی۔"

"نہیں نہیں، یہ برا ہے۔ سچی بات یہ ہے کی مجھے چھپانا جھوٹ بولنا اچھا نہیں لگتا۔ ارے بھئی جس کسی کو بھی ہمارے لیے کام کرنا ہے اسے کھبر ہونی چہیئے کی ہم کیا کام کر رہے ہیں... مطلب اس کو کیا کام کرنے کا ہے ہمارے باسطے۔ ہاں۔"

پھر وہ اپنے ربڑ کے دستانوں سے کھیلتا ہوا بولا، "ہم واستو میں... مطلب اِن فیکٹ... ہم لاشیں جمع کرتے ہیں۔"

"جمع کرتے ہیں؟"

"ہاں، مطلب collect کرتے ہیں ڈیڈ باڈیز۔"

"پر کیوں؟"

"اسٹور کرنے کے لیے۔"

"اسٹور کس لیے...؟"

"اسٹور نہیں کرو تو لاشیں rot ہونے لگتی ہیں اور میموری میں اور ساہتیہ میں اور ہسٹری، مطلب اِتہاس میں نکل نکل کے آتی ہیں بار بار... کئی کئی ہجار برس کی لاش پانی سے اور شمشان بھومی سے اور کبرستان سے نکل کے آتی ہے اور کنور ہیملٹ کے پتا کی طرح گڑھیوں کی بُرجیوں پے ٹہل لگاتی ہے۔"

باپ رے باپ! یہ کیا بدمعاشی ہو رہی ہے؟ میں نے سوچا۔

وہ میرا خیال پڑھ رہا تھا۔ بولا، "بدمعاشی نہیں ہے... راج نیتی، مطلب politics میں اور کسی بھی طرحے کی چودھراٹ میں اس پرکار کا disposal جروری ہے۔ نہیں تو گدی نہیں سنبھالی جا سکتی ــــ اُون ہنک۔"

پر اس کیمیکل سے اور ٹبوں سے ہمیشہ کے لیے لاشوں کو کیسے کوئی ڈسپوز آف کر سکتا ہے؟ جب آگ اور مٹی اور پانی ہزار برس بعد بھی ناپسندیدہ کے ڈے ورز (cadavers) کو اپنا rot پھیلانے سے نہیں روک سکتے، تو یہ سب کیمیکل کیا کر پائیں گے؟

وہ میرا اعتراض سمجھ گیا تھا۔ تو اس نے مجھے بتایا کہ کیمیکل اسپرے کر کے پلاسٹک کے ایک ٹب میں لاش رکھ دی جاتی ہے اور دوسرے ٹب کو، جو اصل میں ڈھکنے کی طرح کا ہے، سیٹ کر کے لاش کو ایئر ٹائٹ وغیرہ کر دیا جاتا ہے۔ پھر اندر لاش پر فراموش گاری کا عمل شروع ہوتا ہے۔ لاش کا سب رکارڈ، نام، پتا، زمانہ، اس کے خیالات اور نظریات، اس کی شبیہیں، اس کے لیے کہی گئی نظمیں، اس کے لیے نکالے ہوئے جلوس سب liquidate ہوتے رہتے ہیں۔ باہر بھی کوئی اس کا نام نہیں لیتا۔ اس کا نام، پتا، زمانہ، خیالات، نظریات، شبیہیں اور اس کے لیے کہی گئی نظمیں، نکالے ہوئے جلوس ایک huge غیر متعلق information junk میں اچھی طرح پینٹ دیے جاتے ہیں کہ کوئی انھیں salvage نہ کر سکے۔ پھر وہ سب کچھ ignore کیا جاتا ہے اور کبھی کسی بات کی تردید نہیں کی جاتی کیوں کہ تردید ایک طرح کی negative موجودگی ہے۔

مجھے متلی آ رہی تھی — یہ حرام زادہ کس اطمینان سے اتنے بڑے فراڈ، تاریخ کی ایسی بھیانک tempering کا سرسری ساذکر کر رہا ہے، بالکل نہیں شرماتا، اور سمجھ رہا ہے کہ میں اس حرم زدگی میں اس کا ساتھ دوں گا۔ ہرگز نہیں۔ میں نے پرزور احتجاج کرنے کے لیے حلق سے کوئی آواز نکالی جس کا کچھ مطلب نہیں تھا — اس لیے آواز میں جان نہیں تھی۔

دوبے کہنے لگا، "سنو! پہلے سپمورنا ٹب میں دوا کا اسپرے کرے گا۔ اب تم چاہو تو اپنی کسی دعا سے کام شروع کر سکتے ہو۔ (تم لوگ کو دعا وگیرہ کا بڑا شوق ہے۔)"

میں نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا، "میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

وہ نرمی سے بولا، "جانے کی بات مت کرو۔ اُدھر بھی یہی ہے، بائی گاڈ، کوئی ڈفرنس نہیں ہے۔ ایسا ہے کی تم کو دیکھنے کا چانس نہیں ملا ہوگا۔ اِدھر چانس مل گیا ہے۔ اچھا تو اب سمپورنا اور تم اسپرے کیے پلاسٹک کے ان آدھے تابوتوں میں لاشیں رکھتے جاؤ۔ میں اوپر سے ڈھکنے اور لائننگ پٹیاں فٹ کرتا جاتا ہوں۔ کم آن get set اینڈ گو!"

تواب کیا عرض کروں، برس ہو گئے ہیں، ایسا ہے کہ نہ میرا ٹرک آیا ہے، نہ کوارٹر بدلا گیا ہے۔ اسی کوارٹر کے دو کمروں کے بیچ پدما کی اتھل پتھل ہوتی رہتی ہے۔
مجھے کوئی زیادہ پریشانی بھی نہیں ہے۔ ہم دونوں ہی وقائع نگار، مطلب اس کے ونجرز (scavengers)، ہیں جو اپنی mindless محنت سے ناپسندیدہ میٹریل کو غتربود کرنے کے عمل میں کسی ڈوبے وغیرہ کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ سمپورنا اور میں... ہم پلاسٹک کے تابوتوں میں لاشیں رکھتے جاتے ہیں، اور اوپر سے ڈھکنے فٹ کرتے جاتے ہیں۔ کام صحیح چل رہا ہے۔

قارئین! زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ قصہ یہاں بیٹھ کے سنا رہا ہوں اس لیے یوں سنایا ہے۔ اگر وہاں ہوتا تو دوسری طرح سناتا۔ (نام بدل دیتا اور کہیں کہیں نچ اَپ کر دیتا۔) ویسے آپ جان گئے ہوں گے کہ اِدھر اُدھر میں فرق کوئی نہیں ہے۔

دونوں سَسُرے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

جشن کی ایک رات

"کہتے ہیں ہُما جس کے سر پر سایہ ڈال دے اسے بادشاہی مل جاتی ہے۔"

واواوا

"سب مرشد پیر گواہ رہیں میرا سلطان شہباز ہے۔"

وا

"شہباز ہے کہ جس پر سایہ ڈال دے اسے شیر جیسا جری بنا دیتا ہے۔"

واواوا قربان

سرمست خان سربینی، سلطانِ ہند شیر شاہ سوری کا دودھ شریک بھائی، سامنے قالین پر بیٹھا تنبور بجا رہا تھا۔ ایک نوجوان روہیلہ دوزانو بیٹھا، آنکھیں بند کیے، اپنا ایک کان ہتھیلی کی اوٹ میں لیے کمال استغراق میں خوش الحانی سے پشتو بیت پڑھتا تھا۔ سب جانتے تھے یہ بیت صدر الصدور، دبیرِ دولت حسن علی خان لکھتے ہیں مگر صدرِ جہاں نے آج تک نہیں قبولا تھا کہ وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ بر سرِ محفل وہ اس نوجوان رسالے دار کی تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے خدا نے تجھے اچھی آواز کے ساتھ شعر کہنے کی صلاحیت بھی خوب دی ہے۔ بس تُو اتنا خیال رکھنا، اسے اپنی روزی کا وسیلہ نہ بنانا۔ تُو رسالے دار ہے، تُو نے اپنی روٹی گھوڑے کے پسینے میں گوندھی ہے۔

رسالے دار نے تان اٹھائی...

"سنتے ہیں تختِ اسکندر کا پایہ بلند تھا۔"

وا

"بلند تھا۔۔۔ اور مشرق و مغرب اس کے باج گزار تھے۔"

واواوا

"مگر میرے سلطان کا تخت اصیل گھوڑے کی پشت ہے۔"

وا سبحان اللہ

"اور مشرق و مغرب اس کی ٹاپوں کی دھمک سے لرزاُٹھے ہیں۔"

اب نوجوان رسالے دار نے بزرگ تنبور نواز کو اپنا کمالِ فن دکھانے کا موقع دیا۔ خود ادب سے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے سر جھکا لیا اور جھومنے لگا۔

رسالے دار کے لیے تنبور نواز سرمست خان چار حوالوں سے محترم تھا۔ ایک تو یہ کہ عمر میں بہت بڑا تھا، نوجوان روہیلہ جانتا تھا کہ اسے بزرگوں کا احترام کرنا ہے ورنہ تلوار اس کے ہاتھ میں کند اور مرکب اس کی ران تلے سرکش ہو جائے گا۔ دوسرے سرمست خان قیامت کا شمشیرزَن تھا، خود سلطان شیر شاہ کے سربراہی پرچم تلے قنوج کے معرکے میں اس نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے تھے۔ تیسری بات یہ کہ سرمست خان بادشاہ کا دودھ شریک بھائی تھا۔ اور آخری بات یہ کہ ظالم غضب کا تنبور بجاتا تھا۔ اس فن کو سمجھنے والے کہتے ہیں کہ سرمست کے ہاتھ میں بےجان تنبور کسی جان دار کی طرح کلام کرتا ہے۔

سرمست نے کچھ دیر ساز پر اپنی گرفت اور قدرت کا مظاہرہ کیا، پھر مسکرا کر سر کے اشارے سے نوجوان روہیلے سے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ رسالے دار سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیماً جھکا اور اب کے اس نے شہر جائس کے ملک محمد کا ہندوی کلام پڑھنا شروع کیا جس میں شیر شاہ کے عدل وانصاف کا بیان پُراثر انداز میں کیا گیا تھا۔ حاضرین واقربان، وا سبحان، واواوا، قربانت شوم، سبحان اللہ کی آوازیں دے دے کر کلام اور گائیکی کی تعریف کرتے تھے۔ رسالے دار ابھی پورے دو بیت بھی نہ سنا پایا ہوگا کہ دور دالانوں میں یساولوں کی آواز کڑکی۔

ایک یساول تسلسل میں پکارتا تھا، "نگہ داراں نگاہ داشت! نگہ داراں نگاہ داشت!"

دوسرے نے کڑک کر کہا، "صاحبِ ظلِّ ہُما۔۔۔ مشیّت اللہ فی الارض۔۔۔ خلیفۂ زماں۔۔۔

سلطانِ عادل!"

پہلا نقیب تیوَر سُر میں پکارا، "المعدَل!"

دوسرے کا آوازہ، "المعروف والمعزز!" ابھی باز گشت کرتا تھا کہ پہلے کی گرج سنائی دی:

"بادشاہِ اقلیمِ ہند بہ تائیدِ ایزدی، حضرت شیر شاہ سُوری!"

پھر دونوں یساول ایک آواز ہو کر دعائیہ انداز میں پکارے، "خلد اللہ ملکہ و سلطانہ!"

حاضرین میں کھلبلی مچ گئی۔ صدر الصدور حسن علی خان، جن کی فرمائش پر "شیر بھوَن" کی ڈھنڈار عمارت میں تنبور نوازی اور بیت خوانی کی یہ محفل ہو رہی تھی، محفل کے صدر سے اٹھ کر برہنہ پا دالان میں نکل آئے۔ سرمست خان نے تنبور اپنے خادمِ خاص کے حوالے کیا جو اسے دوشالے میں لپیٹ کر ستون کی آڑ میں جا کھڑا ہوا اور خود سرمست، صدر الصدور حسن علی خان کے ساتھ قدم بڑھاتا سلطان کی پیشوائی کو چلا۔ نوجوان رسالے دار، جس نے بیت خوانی کی سرخوشی میں اپنی دستار کو ذرا سا کج اور بے ترتیب ہو جانے دیا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور ستون کی اوٹ میں جا کر نئے سرے سے دستار باندھنے لگا۔ صدرِ جہاں نے سوچا، "کسے خبر تھی سلطان اس طرح اچانک رات کے وقت شیر بھوَن میں نزولِ اجلال فرمائیں گے۔ میں نے تذکرہ بھی نہیں کیا تھا کہ حضور کی صحت یابی کی خوشی میں اِس اِس طرح شیر بھون میں محفل کرنے کا خیال ہے۔ واللہ، میں تو پریشان ہو جاؤں گا اگر سلطان نے اس بات کو پسندیدہ خیال نہ فرمایا۔"

سرمست خان کو یہ اطمینان تو تھا کہ سلطان اس وقت اپنی ناپسندیدگی ظاہر نہ ہونے دیں گے — وہ اپنے کوکہ سرمست کا بہت خیال رکھتے ہیں، کسی دوسرے کے سامنے اسے خفیف نہیں کریں گے۔ اصل فکر اس کو یہ تھی کہ ہفتے عشرے میں کبھی جب تنہائی میں سرمست ہاتھ آ گیا تو سلطانِ والاجاہ تبسم فرماتے ہوئے وہی بات پھر نہ کہہ دیں جو پہلے کسی موقعے پر انھوں نے کہی تھی۔ کہتے تھے: سرمست! ابلیس کا سفر بلندی سے پستی کی طرف تھا۔ پروردگار کا کرم ہے کہ تُو پستی سے بلندی کی طرف آیا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ تُو کتے اور کنیزیں بیچ کر اپنی روزی کماتا تھا، آج مملکت کے عمائد میں شامل ہے۔ بے شک اس میں تیرے ارادے اور تیری محنت کا بھی دخل ہے، لیکن اصل اور بنیاد کی بات میں جانتا ہوں۔ تو نے ایک نیک بخت پاک طینت ماں کا دودھ پیا

ہے، اور میں نے بھی۔ ہم دونوں ایک بلندی سے آشنا ہوے ہیں، گر نہیں سکتے۔

مگر سرمست خان نے دالان میں تیز قدم بڑھاتے ہوے انکار میں سر کو جھٹکا دیا، "نا نا نا۔ سلطان کو میری تنبور نوازی پر اعتراض نہیں ہے۔ یاد پڑتا ہے تین چار مرتبہ انھوں نے خود فرمائش کر کے تنبور سنا ہے۔ نہیں، وہ ناپسند نہیں کریں گے۔"

صدرِجہاں حسن علی خان، سرمست خان سربینی، جلال خان بن جلو، رائےرایان ٹوڈرمل، زین خان نیازی، سمانہ کا ملک بدرالدین مرل، بھیم چند کوٹھی والا، سرِخاصہ خیل برمازید کور اور دریاخان سروانی جیسے عمائدِ سلطنت اور سلطان کے دیرینہ رفیق، پھر دو تین وہ امرا جنھیں پچھلی دفعہ بنگالے آنے پر سلطان نے "امیرِ آسماں شکوہ" کا خطاب دیا تھا، لکھنوتی کا قلعہ دار، رسالے کے دس بیس اعلیٰ عہدے دار، گوروبنگالے کے بارہ پندرہ زمیں دارانِ عُمدہ اور ستونوں اور پردوں کی اوٹ میں کھڑے درجنوں معتمد اہل کار اور خدّامِ خاص اپنے مرتبے کے اعتبار سے یا تو قالین بچھے دالان میں سلطانِ والاجاہ کی پیشوائی کے لیے بڑھے یا اپنی اپنی جگہوں پر ایک ضابطے میں دھڑکتے دل کے ساتھ سروقد کھڑے ہو گئے اور دیوان میں سلطانِ والاجاہ کے ورود اور اپنی اپنی کورنش کا انتظار کرنے لگے۔ پھر بیسیوں ایسے بھی تھے جو ستونوں اور بھاری پردوں کی اوٹ میں یا دالانوں کے نیم تاریک خُنکے میں چلے گئے۔

دالان کا موڑ مڑ کر سلطان شیر شاہ سوری، خاصہ داروں کی مشعلوں، چھت سے لٹکتے فانوسوں اور دیوارگیر بانڈیوں سے روشن دیوان کے دالانِ کبیر میں آئے تو حسن علی خان نے دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔ دل سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

حسن علی خان، سرمست خان، راجا ٹوڈرمل، برمازید کور، اور دو چار اَور جو پیشوائی کو بڑھے تھے انھوں نے سب سے پہلے کورنش دی۔ سلطان شیر شاہ کی مسکراہٹ اور حوصلہ افزا ہو گئی تھی۔ وہ دالان ہی میں رک گئے۔ خادمِ خاص شناور خان غِلزئی جو چاندی کا خاصدان اٹھائے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، مناسب فاصلے سے ٹھہر گیا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے مسیح الملک تھے۔ وہ بھی رک گئے۔ سب کے پیچھے خاصے کے جوان بتوں کی طرح بے حرکت ہو گئے۔ حسن علی خان نے سب کی نمائندگی کی، مسکراتے ہوے کہا، "آے آمدنت باعثِ آبادیِ ما!"

سلطان نے اپنی بھاری گو نجیلی آواز کو وقت اور موقعے کی مناسب سے عمداً نرم کیا اور کہا، "حسن بابا! تم نے میرے سب دوستوں کو یہاں تنبور سنانے کو بلا بھیجا اور مجھے اقامت گاہ میں اکیلا چھوڑ دیا۔۔ مگر میں کہاں رکنے والا تھا۔۔ دیکھو آ گیا۔"

صدرِجہاں نے شگفتگی کے ساتھ اس دوستانہ شکوے کا مناسب جواب دیا، شکر گزاری کے الفاظ کہے اور عرض کیا کہ عالم پناہ کی تشریف آوری سے شکرانے کی اس محفل کا اصل مقصد پورا ہو گیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جلال بن جلّو دو دن پہلے لکھنوتی پہنچا تھا؛ وہ سلطان کو بہت دن بعد دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا ایسی شدید بیماری بھی اس پھولوں ڈھکی چٹان کو بہت زیادہ نہ بدل سکی۔ وہی سرخ و سپید رنگت، دور تک اتر جانے والی خدنگ آنکھیں، عقاب کی چونچ کی طرح ناک، ہر وقت جیسے مسکراتے بھرے بھرے ہونٹ، نیشِ عقرب کی طرح چڑھی ہوئی مونچھیں جن سے ہیبت و دبدبہ ظاہر ہوتا تھا، ساتھ ہی دارالعلوم کے نرم خُو عالموں جیسی ڈاڑھی جو مزاج کے تحمل اور خداداد بصیرت کی غمازی کرتی۔ ایک کم ستر سال کی عمر کے باوجود لگتا ہے پینتالیس اڑتالیس برس کا پختہ کار مرد ہے جس نے سہولت کے ساتھ زندگی کرنے کا کوئی نسخہ معلوم کر لیا ہے اور ابھی پچاس برس اور اسی ڈھب سے زندہ رہنے کی لگن رکھتا ہے۔

سلطان حسبِ معمول دائیں ہاتھ پر بلکی سیف باندھے تھے جو کسی زمانے میں غزنی اور خراسان کے اسلحہ کاروں کا کارنامہ سمجھی جاتی تھی۔ دائیں رخ پر اکثر تلوار باندھنے سے اس خیال کو تقویت پہنچتی تھی کہ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلانے کے باوجود سلطان شیرشاہ کو بائیں ہاتھ میں تلوار لینا اچھا لگتا ہو گا۔ وہ اس وقت ہلکے جامے پر مخمل کی سادہ نیم آستین پہنے تھے۔ دستار کی جگہ ایک درمیانے طول و عرض کا ریشمی رومال غیر رسمی طریق پر سر سے باندھ رکھا تھا جس پر سبک سا جیغہ بہار دے رہا تھا۔ لباس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ سلطان دربار میں تشریف نہیں لائے بلکہ دوستوں میں بیٹھ کر دکھ سکھ کی سادہ باتیں کہنے اور سننے کی نیت لے کر آئے ہیں۔

سلطان نے سرمست خان سربینی کی طرف جیسے مصنوعی بیزاری سے دیکھا اور کہا، "کوکلتاش! کیا تم نے میرے اور اپنے سخت کوش دوستوں کو ساز بجا بجا کر نرم کرنے کا تہیہ کر لیا

ہے؟"

سرمست خان نے مسکرا کر جواب دیا، "خدا نے سلطانِ والاجاہ کو صحت کاملہ سے نوازا ہے ـــــ یہ ایک شب یقیناً سلطان اپنے کوکلتاش کو عطا کریں گے تاکہ ایک بار تو عقابوں کے مسکن میں بلبل کو بولتے سنا جاسکے۔"

"واللہ! سرمست خان تو لکھنوتی آ کر شاعروں کی طرح کلام کرنا سیکھ گیا ہے ـــــ حسن بابا! کیوں نہ تم اسے علم عروض اور شعر گوئی کے نکات بھی سمجھا دو۔"

حسن علی خان نے مسکراتے ہوئے کہا، "سلطانِ عادل ہمیشہ سے جانتے ہیں کہ خاکسار حسن فنِ شعر گوئی سے نابلد ہے۔"

"ہاں ہاں، بے شک، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا،" شیر شاہ نے یہ بات ایک غماز مسکراہٹ کے ساتھ کہی تھی۔ راجا ٹوڈرمل، سربینی، شناور غلزئی اور دوسرے اکابر جو واقفِ حال تھے اور سلطان کے رُوبرو مسکرانے کی جسارت کر سکتے تھے، مسکرائے۔ حسن علی خان نے معصوم صورت بنالی جس سے سلطان کے مزاج کی شگفتگی میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے سربینی کو مخاطب کیا، "میں نے دُور سے سنا تھا کوئی خوش الحان تمھارے تنبور کی آواز سے آواز ملا کر کچھ پڑھتا تھا ـــــ کیا پڑھ رہا تھا؟ کون تھا؟"

سرمست خان نے عرض کیا، "ایک رسالے دار ہے۔ ملک محمد جائسی کے بیت پڑھتا تھا جو اس نے سلطانِ والاجاہ کی شان میں ہندوی زبان میں تحریر کیے ہیں۔"

شیر شاہ اب دیوان میں داخل ہو چکے تھے۔ حاضرین نے کورنش گزاری اور اسی طرح سروقد کھڑے رہے۔ روہیلوں کے دستور کے مطابق سازونغمے کی محفل میں درباری آداب کو کچھ نرم کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے دیوان کے صدر میں پہلے سے بچھے قالینوں پر ایک قالین اور گاؤتکیہ جو سلطان کے پسندیدہ آتشی رنگ کا تھا، فوری طور پر بچھا دیا گیا۔ سلطان شیر شاہ پاپوشیں اتار کر تکیے سے جا ٹکے۔ خادمِ خاص پاپوشیں سنبھال کر عقب میں جا بیٹھا۔ سلطانِ ہند نے حاضرینِ محفل کو اشارہ کیا۔ دستور کے مطابق وہ بھی جنھیں دربارِ عام میں کھڑے رہنا ہوتا تھا، بیٹھ گئے۔

شیر شاہ نے پوچھا، "ہمارا خوش آواز رسالے دار کہاں ہے؟"

افسرانِ دربار نے اشارہ کیا، نوجوان رسالےدار، عالی مسند کے رُوبرو آیا، کورنش ادا کی۔ سلطان نے فرمایا، "رسالےدار! تمھیں کوئی قدیم رَجَز یاد ہو تو سناؤ۔ میں اس مجلس کو سپاہیوں کی مجلس ہی دیکھنا چاہوں گا۔"

نوجوان روہیلہ سینے پر ہاتھ باندھ کر خم ہوا۔ سربینی نے اپنے خادمِ خاص کو اشارہ کیا۔ اس نے دوشالے میں لپٹا تنبور اپنے آقا کو پیش کر دیا۔ سرمست نے اجازت لے کر تنبور کے تار ملانا شروع کیے۔ پھر جب سلطان نے اپنے اس رضاعی بھائی کی طرف مہرومروّت سے دیکھا تو اس نے رَجَز کی کوئی شعلہ فشاں دُھن چھیڑ دی۔

صحت یابی کے بعد سلطان شیرشاہ نے خود کو جشن کی یہ ایک رات دینا منظور کیا تھا۔

مگر اس ایک رات کے آگے پیچھے حرب و جدال کی جاں کاہ مشقتوں اور مشکل فیصلوں کے کرب سے پسینہ پسینہ بےشمار راتیں تھیں جن کا حساب کسی وقائع نگار نے اس طرح نہ رکھا جیسا کہ حساب رکھنے کا حق ہوتا ہے اور جب دیکھتے ہی دیکھتے معاصر تاریخ کا آگ برساتا سورج سوا نیزے پر آ پہنچا تو بہت سی چیزیں اپنے معنی کھو بیٹھیں اور مٹی ہو گئیں۔

بس پتھر کی ایک سفید سِل کہیں پڑی رہ گئی جس پر ادھیڑ عمر کے ایک آدمی کو شیر سے پنجہ کرتے دکھایا گیا تھا۔

بُرجیاں اور مور

لاجی بائی اسیر گڑھ والی نے تقسیم کے فوراً بعد یہاں آ کر نیپیئر روڈ کا یہ فلیٹ بسا لیا تھا۔

لاجی بائی اپنی ایک نوچی اور ایک لے پالک لڑکے کے ساتھ بمبئی کے بیلارڈ پیئر سے جہاز پر سوار ہوئی تھی اور جہاز سے اُتر کے یہاں کیماڑی کے میول مینشن میں موتی سیٹھ شکارپوری کے فلیٹ میں پندرہ روز ٹھہری تھی۔

وہ ایسے ہی نہیں چل پڑی تھی، بڑا مال لائی تھی۔ اسی لیے موتی سیٹھ کے مشورے سے اس نے نیپیئر روڈ پر چوراہے کا یہ فلیٹ خرید لیا۔ پھر ایک شاگرد سے چار شاگردیں ہو گئیں اور وہ جم کے اپنی بیٹھک چلانے لگی۔ گلابی شیڈ والی یہ لائٹیں، پنکھے، صوفہ سیٹ، قالین، مخمل والے گاؤ تکیے ـــ جو اَب کجلائے ہوئے، میلے میلے سے لگتے ہیں ـــ لاجی نے اُسی زمانے میں خریدے تھے۔

رنڈیوں، ڈیرے دارنیوں کے بارے میں افواہیں نہیں اُڑا کرتیں۔ اسکینڈل، افواہیں تو شریف زادیوں کا کھیدا ڈالنے کے لیے پھیلائی جاتی ہیں، مگر عجیب بات تھی، لاجی بائی کے بارے میں جاپانی روڈ پر اور شہر میں طرح طرح کی باتیں اُڑی ہوئی تھیں۔

کوئی کہتا تھا اس کا اصل نام لیلا ہے، کوئی کہتا تھا نہیں، لیلیٰ ہے اور یہ اسیر گڑھ کے مہاراج کی درباری گایکا تھی۔ کوئی کہتا تھا ناں جی ناں، مہاراج نے بس ڈال رکھا تھا؛ اسے گانا وانا تو آتا نہیں، پنڈت کوکا کاشمیری کے سب شاستر پڑھے بیٹھی تھی، سمجھو علمِ مہری کی مُنتہی تھی یہ لیلا بائی، اسی لیے تو مہاراج نے...

یہ آخری بات دل کو لگتی تھی، کیوں کہ گانے والی آواز تو لاجی کی کبھی کسی نے سنی نہ تھی۔ خیر خواہوں نے مشہور کر دیا تھا کہ نوعمری میں کویل کی طرح کوکتی تھی لاجی بائی، مگر دشمنوں نے سیندور کھلا دیا، بس بیٹھ گئی ہمیشہ کے لیے۔ خود لاجی بائی نے یہ بات کبھی مان کے نہ دی کہ اسے سیندور کھلایا گیا تھا؛ نہ کبھی اس نے یہ کہا کہ اسے سیندور نہیں کھلایا گیا تھا۔

پتا نہیں کس سَن میں ایک بہت قریب کے آدمی نے، جو اَب زندہ بھی نہیں، لاجی بائی سے گانے کی فرمائش کی تھی تو لاجی نے کہا تھا کہ ڈپٹی صاحب (قریب کا آدمی ڈی ایس پی ریٹائر ہوا تھا)، تو لاجی نے کہا تھا، "ڈپٹی صاحب، ہم ایک کے لیے گاتے تھے یا ایک لاکھ کے لیے۔ اب نہ وہ ایک رہا نہ ایک لاکھ۔ اب کیا گائیں۔ ہمارے تو بول بھی یہاں سمجھ نہ آن گے کسی کو۔"

مگر یہ سب چالاکی کی باتیں تھیں۔

لاجی بائی کو گانے بجانے سے کیا ملتا جو چار مسہریاں چلانے میں یافت ہو جاتی تھی۔

گل بدن، لاجو، بیلا اور یاسمین ـــــ دو چار برس بعد لڑکیاں بدل جاتی ہوں گی، مگر چاروں نام یہی رہتے تھے۔ اُنھیں واجبی سا گانا سکھا دیا جاتا ہو گا تا کہ مُجروں کی آڑ میں سب چلتا رہے۔

مختصر یہ کہ لاجی بائی کی چار "شاگردیں" تھیں اور وہ لمڈا جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ سب اُسے "لاجی والا" کہتے تھے۔

***

سب مجھے لاجی والا جاوید کہتے تھے۔

ہم لوگ جب یہاں آئے تھے اور لاجی صاحب نے یہ فلیٹ خریدا تھا، اُس وقت بہت ہوا تو میں سولھا سال کا ہوں گا۔

فلیٹ پر آنے والوں سے مَیں بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی مجھ سے کام کے لیے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ نہ ہی مجھے کسی سے کچھ لینے کی اجازت تھی۔ لاجی صاحب اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔

پھر مجھے لوگوں میں بیٹھنے کا ڈھنگ آیا، بات کرنے کی تمیز آ گئی۔ ویسے میل جول مَیں نے کم ہی رکھا۔

بس ایک مظہر علی خاں تھے، بینک افسر، جن سے میری دوستی سی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی میں اُن کے دفتر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مظہر علی خاں کوٹھے پر آتے ضرور تھے مگر تماش بین نہیں تھے۔ لاجی صاحب کے "پرستار" تھے وہ۔ اُن کی عمر اُس وقت چوبیس پچیس سال ہو گی ــــ سمجھو میری عمر کے ہوں گے۔

میں یہ قصہ اپنی یا لاجی صاحب کی وجہ سے نہیں، مظہر علی خاں کی وجہ سے سنا رہا ہوں۔ بڑے دلیر آدمی تھے؛ پتا نہیں کہاں ہوں گے اب۔

مجھے یاد ہے پہلی بار وہ فلیٹ میں آئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ خبر نہیں کیسے فلیٹ کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ لاجی صاحب لاؤنج میں بڑے تخت پر گاؤ تکیہ اور ٹیبل فین لگائے، ململ کی چادر گیلی کر کے پیروں پر ڈالے آرام سے پڑی کچھ گنگنا رہی تھیں کہ ایک خوب صورت جوان، سفید قمیص پر سُرخ عنابی ٹائی باندھے، سرج کی کالی پتلون اور چمچماتے ہوئے بوٹ پہنے فلیٹ کے دروازے پر طبلہ سا بجا کے ہیلو کہتا ہوا گُھس آیا۔

لاجی بولیں، "کیا وحشت ہے؟ کہاں گُھسے آ رہے ہو میاں؟"

یہ "میاں" مظہر علی خاں تھے۔ انھوں نے بڑھ کر لاجی صاحب کے پیر چُھوئے۔ لاجی نے پیر سمیٹ لیے۔ وہ آنکھیں پھاڑے خاں صاحب کو دیکھے جا رہی تھیں۔

مظہر خاں ہنستی ہوئی آواز میں بولے، "بہت دن سے آپ کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ آپ موسیقی کی تاج دار ہیں، بادشاہ ہیں اس فن کی۔"

لاجی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ بولیں، "برخوردار، غلط جگہ آ گئے ہو ــــ وہ اِدھر نہیں رہتیں۔"

خاں صاحب ہنس کر بولے، "ہمارے لیے تو آپ ہی ملکۂ موسیقی ہیں۔ اِس علاقے میں تو بس آپ ہی کا حکم چلتا ہے، باقی سب آپ کی رعایا ہیں۔"

اس خوشامدانہ جھوٹ اور ڈِھٹائی پر لاجی ایک دم ہنس پڑیں۔ وہ ہنسیں تو مظہر علی خاں خود

بھی ہنسنے لگے۔ بولے، "میڈم، اِسی مہینے سامنے بینک میں اسسٹنٹ مینیجر ہو کر آیا ہوں۔ اِس وقت آپ کا اکاؤنٹ مل جائے تو بہت اچھا ہے۔ کھاتا کھلوا لیجیے میری برانچ میں۔"

لاجی صاحب انھیں دل چسپی سے دیکھتے ہوے اب گاؤتکیے سے ٹک گئی تھیں۔ ہنس کے کہنے لگیں، "برخوردار، ایسی کیا مصیبت پڑ گئی ہے جو اکونٹ کے لیے کوٹھے جھانکنا شروع کر دیے؟"

بولے، "ایک حرام الدہر افسر ٹکر گیا ہے۔ کہتا ہے اسسٹنٹ سے پکا مینیجر اُس وقت تک نہیں بننے دوں گا جب تک اِتنی رقم کے اِتنے اِتنے کھاتے نہیں کھلواؤ گے۔"

"پھر؟ کوئی کھاتا کھولا بھی یا ایسے ہی؟"

مظہر علی خاں کہنے لگے، "میں تو آپ کے سوا یہاں کسی کو جانتا نہیں۔ اور میرا مینیجر، وہ بالکل ہی گیا گزرا دبّو آدمی ہے۔ وہ تو آپ کو بھی نہیں جانتا۔ اتنا نیک ہے، صبح پونے نو بجے گاڑی سے اتر کے بینک میں گھس جاتا ہے، پھر پونے پانچ بجے اندر سے نکل کے گاڑی میں ـــــ اور چالیس کی اسپیڈ سے اُڑتا ہوا اس علاقے سے باہر۔"

لاجی صاحب نے کہا، "اے سبحان اللہ!"

مظہر خاں بولے، "تو پھر بسم اللہ کیجیے ـــــ بچّیوں کو بھی بلوا لیجیے۔ میں کھاتوں کے بارے میں اُنھیں بھی سمجھا دوں گا۔"

چوبیس پچیس برس کے اِن خاں صاحب نے "بچّیوں" کا ذکر جس طرح کیا تھا اس سے لاجی بس نہال ہو گئیں۔ بہت دیر تک مُنھ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ایک دم ہنسی میں جیسے پھوٹ پڑیں۔

مظہر علی خاں معصوم شکل بنائے کبھی لاجی کو کبھی مجھے دیکھتے رہے۔ لاجی ہنسے جا رہی تھیں تو خاں صاحب مجھ سے بولے: "بھیا، ذرا بلا لو سب کو ـــــ ٹائم کم ہے۔"

میں نے لاجی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ہنستے ہنستے ہاں میں سر ہلا کے مجھے لڑکیوں کو بلانے کا کہہ دیا۔

مظہر علی خاں ہنستی ہوئی لاجی کو سمجھانے لگے، "میڈم، ہنسی کی بات بھی ہے اور نہیں بھی

ہے۔ دیکھیے نا، گنتی کے دن ہیں اور لاکھوں روپے کے اکاؤنٹ کھولنا ہیں۔ آپ ہی بتائیے، میں گھٹنوں اور پیروں کو ہاتھ نہ لگاؤں تو اور کیا کروں؟"

فرصت کا وقت تھا۔ لڑکیوں نے لاجی صاحب کی ہنسی کی آواز سن لی تھی۔ انھوں نے لاؤنج میں جمع ہونا شروع کر دیا تو خاں صاحب ایک ایک کو سمجھا کر بچت اور بینکاری کے فائدے بتانے لگے کہ دیکھیے، انسان کتنا غیر محفوظ ہوتا ہے، اور عورتیں تو آپ جانتی ہیں بہت ہی زیادہ غیر محفوظ ہوتی ہیں ـــــ خاص طور پر وہ خواتین جنھیں اپنے پیشے میں چمکنے کے لیے بہت کم ٹائم ملتا ہے، جیسے آپ لوگ...

"خواتین" اور "پیشے" کے لفظ سن کے تو لاجی کے ساتھ سبھی نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

خاں صاحب کی تقریر چل رہی تھی۔ کہہ رہے تھے، "آپ لوگوں کے لیے تو بینک اکاؤنٹ رکھنا اور پیسے بچانا بہت ضروری ہے۔ تاکہ برسات کے دنوں میں جب ـــــ جبکہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے ـــــ سمجھ رہی ہیں نا آپ؟ جب قدردان، نیازمند، پیسا کوڑی خرچ کرنے والے، ناز اٹھانے والے نہیں رہتے تو ایک بینک اکاؤنٹ ہی ہوتا ہے جو سہارا بنتا ہے..."

لڑکیوں میں سے کچھ ابھی تک منھ پر ہاتھ رکھے ہنسے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب ذرا دیر کو رکے ہوں گے کہ گل بدن ایسے شروع ہو گئی جیسے مشاعرے میں داد دے رہی ہو، "واہ بھائی جان! واہ سبحان اللہ! بہت اچھی تقریر کرتے ہو!"

خاں صاحب نے بھی مشاعرے کے شاعر کی طرح چار انگلیاں سیدھی کر کے اُن پر انگوٹھا ٹکایا، پیشانی سے لگا کر آداب عرض کیا اور اُسی رفتار میں پھر چل پڑے۔

گل بدن پیچھا چھوڑنے والی کب تھی، سب سے کہنے لگی، "یہ بہت ڈھیٹ، بہت پکا ہے۔ کوٹھوں پہ بہت آنا جانا رہا ہے اس کا ـــــ سارنگی بجاتا تھا پہلے۔"

لاجی صاحب کی ہنسی رک گئی تھی، انھوں نے گل بدن کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔

مگر مظہر علی خاں نے گل بدن کے فقرے کے جواب میں خود اپنے گالوں پر طمانچے لگائے۔ بولے، "توبہ کرو بائی توبہ ـــــ سارنگی بڑا مشکل ساز ہے۔ گنی، گن وان لوگوں کا کام ہے سارنگی بجانا..."

گل بدن بے سُرا بول گئی۔ لڑکیوں کی طرف دیکھ کے کہنے لگی، "تو پھر کوٹھوں کے لیے گاہک گھیر کے لاتا ہوگا۔"

لڑکیاں سب سُٹ ہوگئیں۔ ہر ایک کو احساس تھا کہ گل بدن اوچھا بول گئی ہے۔ لاجی صاحب تو جیسے پیلی پڑ گئیں۔ مظہر علی خاں کا گورا چٹا رنگ ایک دم سُرخ ہو گیا تھا۔ مگر انھوں نے کھنکھار کر سر جھٹکا، ہونٹوں پر زبان پھرا کر اور گل بدن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے، "نہیں بائی جی! اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں ہم ___ قصہ یہ ہے کہ بزرگوں نے اپنے وقتوں میں، اللہ بخشے، بڑی رنڈی بازیاں کی تھیں، تو وہ بے خوفی ہے خون میں۔"

گل بدن کھسیا کے لاجواب ہو گئی۔ لاجی صاحب نے ہاتھ بڑھا کر مظہر علی خاں کا شانہ تھپک دیا، "برخوردار، کچھ خیال مت کرنا۔ پاگل ہے یہ سُسری!"

خاں صاحب کچھ دیر بیٹھ کے، لاجی سے وعدہ لے کے، کہ وہ اکاؤنٹ کھلوانے کا سوچیں گی، چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد لاجی نے دھیرے سے کہا تھا، "کیا لڑکا ہے بھئی ___ مالک خوش رکھے!"

دو چار بار مظہر میاں پھر آئے۔ لاجی صاحب نے کشمیرِ ملک اینڈ لسّی شاپ کے مالک کو کہلوا دیا تھا، اُس نے اور بالٹی فلٹر بیچنے والے ٹین ماسٹر نے سب سے پہلے خاں صاحب کے حساب میں کھاتا کھلوایا، پھر سگریٹ کا ہول سیل والا گجراتی بھائی بھی دھیرے دھیرے لائن پر آ گیا۔

مظہر علی خاں ان سب اکاؤنٹوں کے لیے لاجی صاحب کا شکریہ ادا کرنے آئے تو کرسی پر بیٹھتے ہی انھوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور چپٹا سا ایک ڈبّا نکالا۔ وہ شہر کی سب سے بڑھیا دکان سے لاجی کی پسند کی مٹھائی لائے تھے۔ یہ ڈبّا انھوں نے ہاتھوں پر رکھ کر لاجی کی طرف بڑھا دیا۔

لاجی نے پوچھا، "یہ کس واسطے؟"

کہنے لگے، "سوچ لیا تھا لیلاجی کا منہ میٹھا کراؤں گا۔"

"مگر کیوں برخوردار؟ ٹین ماسٹر اور کشمیرِ ملک والے نے کھاتا کھول لیا، کیا اس واسطے؟"

خاں صاحب بولے: "نہیں لیلاجی، کھاتے واتے تو کھلتے رہتے ہیں ___ وہ سب نہیں۔"

"تو پھر؟" لاجی نے کہا، "پہیلیاں کیوں بُجھواتا ہے برخوردار؟ ہاں بھلا؟"

"دیکھیے، اس طرح ہے،" مظہر میاں نے مٹھائی کا ڈبّا کرسی پر رکھ دیا، خود تخت پر لاجی صاحب کے برابر آ بیٹھے، "اس طرح ہے میڈم، کہ میں... اُس روز جو میں آپ کے فلیٹ میں گھُس آیا تھا اور چپڑ چپڑ باتیں کرتا تھا تو یہ مت سمجھیے کہ بونگی مارتا تھا۔ مجھے اُس روز بھی خبر تھی کہ آپ کون ہیں۔ صرف خبر ہی نہیں، اُس وقت تک میرے پاس آپ کے پانچ گراموفون رکارڈ آ چکے تھے۔ چھٹا، جس کی بہت دن سے تلاش تھی، کل ملا ہے۔ لیلاجی! میں نے سوچ لیا تھا، وہ رکارڈ جس دن میرے ہاتھ لگ جائے گا تو آپ کا منہ میٹھا کراؤں گا۔ وہ آپ کے آنے کے بعد نکالا تھا کمپنی نے۔ آپ کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ وہی الہیا بلاول کہ ـــــ دیاری کہاں گئے وہ لوگ..."

لاجی بس مظہر علی خاں کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب نے ابھی بولنا ختم بھی نہ کیا تھا کہ لاجی نے جیسے نیند میں دُہرایا، "دیاری کہاں گئے..." پھر وہ جیسے پوچھنے لگیں، "الہیا بلاول؟ نایک صمدُو کی الہیا؟"

مظہر میاں نے سر ہلایا، "جی، وہی۔"

لاجی صاحب نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر آہستہ سے پوچھا، "کون ہو تم؟ کیسے جانتے ہو مجھے؟"

"میں؟ میں نے بتایا تو تھا، بینک میں نوکر ہوں، آپ کی اسی سڑک پر جو بینک ہے ـــــ اور میڈم، آپ کو کیسے جانتا ہوں؟ تو آپ کو لیلاجی، آپ کو تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ہزاروں، شاید لاکھوں... سن بتّیس کے بعد کجریاں کس نے گائی ہیں آپ کے سوا؟ کون ہے؟ کس نے گائی ہوں گی؟ لیلابائی اسیر گڑھ والی کی طرح کون گا سکتا تھا؟ ... میڈم، ہر اتوار کو صبح سے شام تک سنتا ہوں آپ کے رکارڈ۔ اسیر گڑھ کے نئے نویلے جنگل ہَونکتے ہیں آپ کے سُروں میں، اور مور، لیلاجی، اسیر گڑھ کے قلعے کی بُرجیوں پر بیٹھے ہوئے مور اور مورنیاں بولتی ہیں۔ میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں... مگر ایک جانکار نے، ایک خوب سُنے ہوئے نے مجھے سب آوازیں پہچنوا دی ہیں۔ لیلابائی، میڈم، خدا جانتا ہے، مجھے موسیقی کی سمجھ اتنی نہیں ہے، مگر آپ کی گائی کجریوں کے ایک ایک نوٹ کی شکل کاغذ پر بنا کے دکھا سکتا ہوں۔"

لاجی صاحب سختی سے اپنے مُنہ پر ہاتھ جمائے بیٹھی مظہر میاں کی باتیں سن رہی تھیں۔ انھوں نے لِیلابائی اسیر گڑھ والی کہا تو لاجی نے چہرے پر ایک بار ہاتھ پھیر کر بے آواز دُہرایا، "لی لا!"

فلیٹ میں سناٹا تھا۔ میں دیوار سے ٹکا سب سن رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے لاؤنج میں، سامنے، کسی گزرے زمانے کی میت رکھی ہے۔

مظہر علی خاں نے لاجی صاحب کے آنسو دیکھ لیے تھے۔ وہ اٹھے۔ انھوں نے بریف کیس اٹھالیا۔

لاجی صاحب زانو پر کہنی ٹکائے، مہندی لگی اپنی گول مٹول ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے بُت بنی بیٹھی تھیں۔

اپنا بریف کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جُھلاتے ہوئے خاں صاحب نے اشارے سے لاجی صاحب کے بُت کو سلام کیا اور فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھے۔

لاجی صاحب نے دھیرے سے کہا، "ٹھیرو!" خاں صاحب رک گئے۔ لاجی نے کہا، "پھر آنا!"

مظہر علی خاں نے کہا، "جی میڈم، آؤں گا۔ رِکارڈ اور باجا بھی لاؤں گا۔"

"نہیں! وہ مت لانا۔"

"جی اچھا۔" اور مظہر میاں اُس روز پنجوں کے بل چلتے ہوئے فلیٹ کی دہلیز پار کر گئے۔ جیسے اپنے پیارے کی موت پر خاموشی سے پُرسا دے کے کوئی نکل جاتا ہے، بالکل اسی طرح۔

ہٹلر، شیر کا بچہ

یہ ایک حوالاتی کی کہانی ہے۔

فیلڈ مارشل کا زمانہ تھا، ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی لگی تو چھوٹی بڑی مزدور پارٹیوں کے دفتروں پر چھاپے پڑنے لگے۔ پولیس والے آتے، دفتری رکارڈ، فرنیچر، ٹائپ رائٹر اور تنخواہ دار اور رضاکار سب قسم کے کارکنوں کو ٹرکوں میں ڈال کے لے جاتے۔ سرسری سماعتیں ہوتیں، کسی کو ماہ چھ ماہ کی سزا سنائی جاتی، کسی کو پانچ دس کوڑے مارے جاتے، بعضوں کو قید اور کوڑے دونوں ملتے۔ یہی سب چل رہا تھا۔

میں ان دنوں کھوسہ کی ٹریڈ یونین میں رضاکارانہ کام کر رہا تھا۔ اکیلا تھا۔ گزارے کے لیے ایک کوچنگ سینٹر میں انٹر کی انگریزی پڑھاتا تھا۔ خدا معلوم ڈیڑھ سو کہ دو سو ملتے ہوں گے ــــ میرے لیے بہت تھے۔ کھوسہ کو میرا کوچنگ سینٹر میں پڑھانا بُرا لگتا تھا۔ کہتا تھا اول تو وہ پیسے بہت کم دے رہے ہیں، ایک طرح سے "پھوکٹ" میں کام لے رہے ہیں، دوسرے کوچنگ سینٹر چلانا علم کا "پروسٹی ٹیوشن" ہے۔ کھوسہ چاہتا تھا میں کل وقتی ٹریڈ یونینسٹ بن جاؤں، اسی کے ساتھ رہوں، کھاؤں، پیوں، فاقے کروں۔

ٹریڈ یونین آفس میں میرے علاوہ رکارڈ کیپر، ٹائپسٹ اکبری خاتون، رشید خاں پیون اور خود کھوسہ، گویا ہم چار آدمی بیٹھتے تھے۔

پولیس آئی تو ہم تینوں کو لے گئی۔ رشید اس وقت چائے لینے گیا ہوا تھا، بچ گیا۔

اکبری کا گرفتاری کا پہلا موقع تھا، میں پہلے بھی جا چکا تھا، اور کھوسہ تو ایک طرح سے عادی تھا۔

کھوسہ لحیم شحیم، بات بات پر مشتعل ہونے والا، ماں بہن عزت آپ کرنے والا قبائلی جوان تھا۔ گاؤں کے با اثر لوگوں اور بڑے بوڑھوں سے اس کی بن نہ سکی تو وہ کراچی چلا آیا۔ ماسکو کی چھپی ہوئی اردو انگریزی کتابیں پڑھ پڑھ کے انقلابی ہو گیا۔ بے خوف اور کھرا آدمی تھا، بات کرنا بھی جانتا تھا۔ اس نے کارنر میٹنگیں کیں، پوسٹر لگائے، اپنے آس پاس آدمی اکٹھا کر لیے، ایک مزدور پارٹی بنالی اور بار بار بند کیا جانے لگا۔

اکبری خاتون میری ہم عمر ہو گی، یعنی کوئی اٹھائیس تیس برس کی۔ پہلے کہیں اس کی شادی ہوئی تھی جو چل نہ سکی۔ وہ اپنے بیمار باپ اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کسی مضافاتی بستی میں رہتی تھی۔ تھوڑا بہت ٹائپ کرنا جانتی تھی، پاکستان کے سوشیو اکونومک نظام سے خفا تھی اور ضرورت مند تھی۔ فارغ وقت میں مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ کھوسہ کو یقین تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں تھا ـــــ اکبری اور میں دوست تھے اور بس۔

خیر، تو ہمارے اعزازی لیگل ایڈوائزر کو ہماری گرفتاری کی خبر لگی، اس نے درخواستیں وغیرہ ٹائپ کیں اور رہائی کی کوششیں کرنے لگا۔

ایک دو روز میں شاید رہائی کی کوئی صورت نکل آتی، مگر کھوسہ نے سب گڑبڑ کر دیا۔

ابتدائی سماعت کے لیے کسی نئے نویلے ڈی سی کے سامنے ہمیں پیش کیا گیا۔ وہ ڈی سی میری بدقسمتی سے کھوسہ کا ہم علاقہ نوجوان نکلا۔ اس کے سادہ سے سوال کے جواب میں کھوسہ نے اس کی، یعنی اپنی، مادری زبان میں خدا معلوم کتنی دیر تک کیا کچھ کہا اور غیرت، بے غیرتی کے کیسے کیسے بھیانک طعنے کھوسہ نے اسے دیے کہ آدھے گھنٹے میں کوئی تیس سنگین قسم کے مقدمے قائم کر دیے گئے اور ہمیں بڑے بھاری گارڈ کے ساتھ لے جا کر کراچی سے میلوں دور کسی بدنام پولیس لائنز کی حوالات میں بھیڑ دیا گیا۔

میں نے موجودہ حالات سے فوری طور پر سمجھوتا کر لیا۔ ٹریڈ یونین کی اوکھلی میں سر دیا تھا اور

وہ بھی کھوسہ کی انقلابی مزدور یونین میں، دھمکوں سے پھر کیا ڈرنا! کھوسہ کی طرح میں بھی گنگناتا ہوا لاک اَپ میں داخل ہو گیا کہ ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ۔

یہ لاک اپ بھی سب حوالاتوں کی طرح منحوس در و دیوار والی تھی۔ فرش سے پانچ ساڑھے پانچ فیٹ بلندی تک دیوار پر کالا رنگ پھرا ہوا تھا۔ پتھر جڑے ننگے فرش پر دو جگہ ملیشیا کے پرانے کمبل تہہ کیے پڑے تھے۔ کونے میں ایک طرف کمبلوں کا ایک ڈھیر اور تھا۔ دوسرے کونے میں، نالی کے سامنے، سیمنٹ کی بالشت بھر اونچی حد بندی سی تھی۔ اس پر بھی کالا پینٹ لگایا گیا تھا۔ پینٹ تازہ تھا یا شاید ادھر فینائل ڈالی گئی ہو گی تو اس کی بو پھیلی تھی۔ حوالاتیوں کو چھوٹی موٹی ضرورت کے لیے بار بار غسل خانے کون لے جاتا، یہ کونا ان کے لیے تیار کر دیا گیا تھا۔

ہم دونوں ایک ایک کمبل پر جا ٹکے۔ پولیس والوں نے پُرشور انداز میں حوالات کا دروازہ بند کیا تو کمبلوں کے تیسرے ڈھیر میں حرکت ہوئی۔ ڈھیر سے ایک سر برآمد ہوا۔ کوئی حوالاتی خوب ہی اوڑھے لپیٹے سویا پڑا تھا اور اب اٹھ رہا تھا۔

بڑھے ہوئے شیو اور بکھرے ہوئے بالوں والے اس سوکھے سڑے آدمی نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔ میں نے دیکھا اس کے اوپری ہونٹ پر بالکل بیچوں بیچ بڑی سی مکھی بنی تھی، یہ اس کی ہٹلر کٹ مونچھ تھی۔ گلا صاف کرکے اس نے لجلجی خوشامدانہ آواز میں پولیس والوں سے کہا، "عالی جاہ! حضور، اتنا شور کیوں کرتے ہو؟" اور دوبارہ کمبل کی گولی مار کر وہ اس میں غائب ہو گیا۔

ہم دونوں بھوکے تھے۔ اپنے جثے کے حساب سے کھوسہ تو کچھ زیادہ ہی بھوکا ہو جاتا تھا مگر اس پرانے حوالاتی کو دیکھ کر کھوسہ ایک دم کھل اٹھا۔ ہنس کے کمبلوں کے ڈھیر سے کہنے لگا، "ہٹلر صاب، او عالی جاہ! ذرا کمبل سے بہار تشریف لاؤ۔"

ڈھیر والا اب کے پورا کا پورا باہر آ گیا۔ پہلے اس نے بہت غور سے کھوسہ کو دیکھا۔ ایسے لمبے چوڑے آدمی اس نے کم ہی دیکھے ہوں گے، بہت متاثر ہوا۔ مجھے بھی بڑی توجہ سے دیکھنے کے بعد وہ بولا، "بندہ نواز! آپ لوگ کس جرم کی پاداش میں یہاں آئے ہو؟"

کھوسہ نے خوش ہو کے پوچھا، "پاداش کیا ہوتا ہے عالی جاہ صاب؟"

ہٹلر ہنسا اور پہلو بدل کر آلتی پالتی مار اپنے کمبل کے دائرے میں مزے سے بیٹھ گیا، کہنے

لگا، "آدمی شان دار ہو۔ پُرلطف اور باذوق بھی معلوم ہوتے ہو۔ بندہ پرور! کام کیا کرتے ہو آپ؟"

کھوسہ کو اس سے باتیں کرنے میں مزہ آ رہا تھا، اپنی آواز میں روکھا پن ڈال کر کہنے لگا، "ہم نقب لگاتاؤں۔ چوری چماری کرنے والا بدمعاش لوگ سے اور اسمگلر لوگ سے ہم بھتا لیتاؤں۔ کوئی مرڈر کا امیدوار مل جاوے، مطلب جس کا جینا ضروری نئیں ہووے اور ہم لوگ کو پیسے کا تنگی بھی ہووے تو کبھی چھ آٹھ مہینے میں کوئی قتل مَتل بھی کر لیتاؤں۔ بس!"

"ماشاءاللہ!" ہٹلر نے تھوک نگل کے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ہم کیا ہیں، تاہم اس کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ پھر بھی اس نے حوصلے سے میری طرف سر گھمایا، پوچھا، "صاحب زادے! اپنا کیا مشغلہ ہے؟"

میرے جواب دینے سے پہلے کھوسہ بول پڑا، "یہ کسی کوٹھے پہ پھوکٹ میں انگریزی پڑھاتا ہے۔"

"قیق ــــ قا!" ہٹلر نے حلق سے بطخ جیسی آواز نکالی جیسے یہ بات اسے بہت مزے کی لگی ہو۔ کہنے لگا، "مگر کوٹھوں پہ حضور والا! کچھ بھی پھوکٹ کا، مطلب مفت کا کچھ بھی نہیں ہوتا واں ــــ بس مفت کی بدنامی اور رسوائی نصیب ہوتی ہے بالاخانوں پر ــــ ہہ ہہ ہا ہاں ــــ اور واں انگریزی کون پڑھتا ہو گا سرکار؟ یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں ــــ سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا ــــ نوجوان ہیں ابھی یہ صاحب زادے، ابھی تو ان کے شباب، ان کی رعنائی کے دام لگیں گے بالاخانے پر، آگے آگے دے..."

"چپ کرو چٹنی!" کھوسہ پر اچانک بھوک کا غلبہ ہوا تھا، ایک دم بپھر گیا۔ کہنے لگا، "لمبا لمبا الفاظ بول کے ہمارا دماغ خراب نئیں کرو۔ نئیں ادھر تمھارا کمبل میں ہی پارسل بنا دے گا ہم لوگ ــــ ہٹلر، سالا، بکواسی!"

میں نے سمجھایا، "کھوسہ! اوں ہوں ــــ کھوسہ! کیوں بلاوجہ! پہلے تو خود ہی تم نے مذاق کیا، اب بگڑ رہے ہو۔"

میں نے دیکھا، ہٹلر نے میرے ساتھی کے بھڑکنے کا برا نہیں منایا تھا۔ چپ ہو جانے کا حکم سن کر دھیرے سے کہا تھا، "جو مرضی بندہ پرور!" اور اس نے احتیاط سے خود کو کمبل میں لپیٹنا

شروع کر دیا تھا۔

کھوسہ کا غصہ اس وقت تک جیسے ختم ہو چکا تھا۔ ہٹلر سے وہ کہنے لگا، "اے اے، سن بئی سن۔ اُوں ہنک۔ تم جاتا کدھر ہے بئی کچھوے؟ کمبل میں واپس نئیں جاؤ۔ ہم جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دیو ___ اور ابھی زیادہ بات نئیں کرنا۔ ہاں؟"

ہٹلر پھر دھیرے سے بولا، "جو حکم بندہ نواز!" اور کمبل اس نے آہستہ سے گرا دیا۔

"تم ادھر کیسے آیا بئی؟" کھوسہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

ہٹلر کو حوصلہ ہوا، وہ کمبلوں کے درمیان لہرایا، بولا، "بس عالی جاہ! یہی مت پوچھیے ___ کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے ___" اسے پھر فوراً ہی میرے دوست کی دھمکی یاد آ گئی، جلدی سے کہنے لگا، "یعنی یہ نہ پوچھیے تو بہتر ہے سرکار!"

"کیوں بئی؟"

"رسوائیاں بھی ساتھ چلیں دم بہ دم کے ساتھ ___ کوچے میں آ کے بیٹھ رہے ہر قدم کے ساتھ ___ حضورِ والا! محض بےوجہ بدنام کرنے کو مجھے یاں پہنچا دیا گیا ہے۔"

مجھے یقین تھا یہ شعر جو ہٹلر نے سنایا خود اسی کا ہوگا ___ اتنے ہی پاگل پن کا شعر تھا۔ میں نے سوچا یہ باز نہیں آ سکتا۔ لچھے دار باتیں کرنا اس کی معذوری ہے۔ کھوسہ بھی منہ پھیر کے مسکرا رہا تھا۔ بولا، "کس نے بدنام کیا ہے بئی تم کو؟"

کہنے لگا، "مجھ پر الزام بےوفائی ہے ___ جھوٹا الزام لگایا ہے خود میرے محبوب نے مجھ پر ___ بلا وجہ ایک ناکردہ گناہ کی پاداش کے جرم میں بند کر دیا گیا ہے مجھے۔" ہٹلر اب بالکل ہی بےقابو زبان بولنے لگا تھا۔

میں نے پوچھا، "کیا جرم کیا ہے آپ نے؟ مطلب کیا جرم نہیں کیا جو وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے کیا ہے؟"

"زنا بالجبر!"

"کھوسہ ایک دم ہنس پڑا، بولا، "اڑے بئی بڑا استاد، خرکوزیہ خبیث ہے ڑے مچھر ___ بھلا تم زور زبردستی کا مجرم ہے بئی؟ ہاہاہا۔"

"اوہو۔ اوہ، ہوں ـــ آپ سمجھے نہیں عالی جاہ! زنا بالجبر کا ارتکاب نہیں کیا ـــ ناں ـــ بالکل نہیں حضورِ والا! میں اور میرا محبوب بہ رضاو رغبت ملتے رہے ہیں ایک زمانے سے، چناں چہ اس روز بھی ہماری ملاقات میں وہی سرشاریاں، سرمستیاں..."

"چل اے! خرمستی پہ مٹی ڈال۔ اصل بات بول۔"

"اصل بات یہ ہے بندہ پرور کہ دشمنوں نے محبوب سے جھوٹا بیان دلوا کے مقدمہ قائم کرا دیا۔ پولیس کو کثیر رقم چڑھادی گئی ـــ اور اب، ناکردہ گناہ ہیں آزردگی سے ہم۔"

ہٹلر کی صورت، اس کی مضحکہ خیز باتیں، اس کی عجیب طرح کی بے بسی دیکھ کے مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ شکایت کے انداز میں میری طرف مڑا۔ کہنے لگا، "ہنسو میاں! ہنس لو برخوردار! کہ ہم وہ ہیں جن کو عہدِ جوانی نہیں ملا۔"

کھوسہ بولا، "جھوٹ نئیں بولو ہٹلر! تم کو تو قسم سے ایسا جنگی جوانی ملا ہے کہ لاک اپ میں پہنچا دیا ئے اسی جوانی مُردار نے۔"

ہٹلر اب خود بھی رازداری سے مسکرانے لگا تھا۔ بولا، "مگر جوانی کیا ہوئی عالی جاہ! اک رات کی کہانی ہوئی۔"

اس پر تینوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ لاک اپ کے باہر سے ڈیوٹی والے سپاہی نے خبردار کیا، "شور نہیں کرواوئے۔"

اس آدمی ہٹلر سے ہماری اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ چاے بیچنے والا بڑی بھاری کیتلی پر بورے چیتھڑے لپیٹے، ٹونٹی میں کارک لگائے حوالاتیوں، سپاہیوں کو چاے دیتا ہوا آیا تو ہٹلر نے ہم دونوں کو اور ڈیوٹی والے سپاہی کو چاے پلوائی۔ ہم نے منع کیا تو کہنے لگا، "بندہ پرور! ناچیز کی یاں گیس بتیوں، سائیکلوں کی دکان ہے، خوب چلتی ہے آپ کی دعا سے، پیسے کوڑی کی کمی نہیں۔ وہ تو مقدر ہی کھوٹا ہے نسیاں کا۔"

کھوسہ نے گھبرا کے پوچھا، "نسیان کون ہئی؟"

بولا، "نسیاں اس خاکسار، ہیچ مدان کا تخلص ہے۔ پورا نام ہے مرزا وحید الرشید بیگ نسیاں ننگال پوری۔"

میرے دوست نے انکار میں سر ہلایا، "نئیں بئی اتنا لمبا نام نئیں ہوتا۔۔۔ تیرا نام ہٹلر ہے۔ ہٹلر حوالاتی۔ کیسا؟"

ہٹلر نے دھیرے سے کہا، "جو مرضی عالی جاہ!"

جب تک حوالات میں روشنی رہی، ہٹلر نے اپنے ہاتھوں کی حرکات اور چہرے کا تاثرات سے حسین حسین عورتوں کے دلاویز سراپے اور لفظی تصویریں بنا بنا کر، ان کے ساتھ گزارے ہوئے "دل پذیر" وقت کی تفصیل سنا سنا کر ہمیں الجھائے رکھا۔ ہر عورت جو اس کے تصرّف میں آئی "ناکتخدا" تھی۔ ہٹلر ہی وہ پہلا آدمی تھا جس نے اسے "راہِ عشق میں سفر آشنا" کیا تھا۔ ہر عورت کم سے کم لکھ پتی کی بیٹی تو ضرور تھی اور ہٹلر کو لے کر قبرص، موریشس یا سرنگاپٹم فرار ہونا چاہتی تھی۔ مگر ہٹلر کے اپنے "اصولاتِ عشق" ایسے تھے کہ وہ کسی بھی محبوب کو "کانٹوں کے سفر کی رہ نوردی" پر لگانا نہیں چاہتا تھا اس لیے چند راتیں "سرخوشی، مدہوشی و سرشاری" کی ساتھ گزار کے ہٹلر ہر دفعہ بھاگ جاتا تھا اور اب ان میں سے ہر عورت کو یاد کر کر کے غزلیں کہہ رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر ایک بار سنجیدگی سے کہنے لگا، "کیا خیال ہے بندگاں عالی! کیا یہی شریفانہ طریقہ نہیں ہے؟"

میں نے پوچھا، "کیا مطلب؟ کیا غزلیں وزلیں کہنا؟ ہاں جناب، بہت شریفانہ بات ہے۔" تو مزے میں سر ہلا ہلا کے ہنسنے لگا۔

مگر ہم پکنک پر نہیں آئے تھے۔ اس وقت صوبے کی بہت بدنام پولیس لائنز میں تھے۔

دو گھنٹے بعد ہی گارڈ آئے اور کھوسہ کو لے گئے۔

میں اپنے دوست کے تیور دیکھ کر ڈر رہا تھا۔ الٰہی خیر کرنا۔ شعلہ مزاج آدمی ہے، کسی اور مشکل میں نہ پڑ جائے۔

آدھے گھنٹے بعد کھوسہ کو واپس حوالات میں لایا گیا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا، "وہی بے غیرت نے اپنا آدمی بھیجا تھا۔"

معلوم ہوا، ڈپٹی سی کا پیش کار آیا تھا جو کھوسہ ہی کے قبیلے کا تھا، کہہ رہا تھا صاحب سے معافی مانگ لو، نہیں بڑے چکر میں پڑ جاؤ گے۔

میں نے کھوسہ سے پوچھا، "پھر؟ تم نے کیا کہا؟"

کہنے لگا کہ اپنی زبان کی ایک بیت کھلا بھیجی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ادھر بے غیرت نہیں ہوتے، پھر بھی کوئی نظر آ جائے تو سمجھ لینا اپنا نہیں کوئی غیر ہے اور جھوٹ بولتا ہے یا پھر اس کی ماں نے اس کے باپ سے جھوٹ بولا تھا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اپنے انقلابی جوش اور باولے پن میں کھوسہ بہت ہی گہرے پانی میں اتر گیا تھا۔ ڈی سی کے پیش کار سے اگر وہ صرف ایک لفظ "نہیں" کھلا بھیجتا تو زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی سزا سنا دی جاتی، قصہ ختم ہو جاتا۔ مگر اب جو یہ بیت کھلا بھیجی ہے تو معلوم نہیں کیا حشر کریں گے اس پاگل کا۔ میں منہ لٹکا کے ایک طرف بیٹھ گیا ـــ اب کیا ہو سکتا تھا۔

ہٹلر اپنی یک طرفہ بکواس کرتا رہا۔ میں چپ رہا۔ اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

اندھیرا ہو گیا تو دو کانسٹیبل ہتھکڑیاں لے کے آئے اور ہٹلر کو اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ کانسٹبلوں کو دیکھتے ہی ہٹلر کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

جاتے جاتے وہ آہستہ سے کہنے لگا، "حضور! اب یہ مجھے تشدید کے لیے لے جا رہے ہیں۔"

شاید تشدّد کہنا چاہتا تھا، پولیس والے اسے پوچھ گچھ کے لیے لے جا رہے ہوں گے۔

ہٹلر کے جانے کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے کمبلوں پر جا لیٹے۔ اس مرزا وحید الرشید بیگ نسیاں خان پوری نے اپنی مسلسل باتوں سے اتنا تھکا دیا تھا کہ خبر بھی نہ ہوئی اور ہم گہری نیند سو گئے۔

رات میں کسی وقت حوالات کا دروازہ بڑی آواز سے کھولا گیا۔ سپاہیوں نے خوب ڈپٹ کر گالی بھی دی جس سے میری آنکھ کھل گئی۔ کانسٹبل اندر لاک اپ میں آ کر ہٹلر کی ہتھکڑیاں کھول رہے تھے۔ وہ بلاضرورت اسے گالی بھی دیتے جاتے تھے۔ ہٹلر بے چارہ آواز نکالنا تو کجا ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد وہ کمزوری سے کھڑا کچھ دیر ڈگمگاتا، لہراتا رہا پھر دیوار کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بستر کی طرف گیا اور کراہتے ہوئے دراز ہو گیا۔

یقیناً پولیس والوں نے اسے بہت پیٹا تھا۔

کھوسہ لیٹے سے فوراً اٹھ بیٹھا۔ مجھ سے کہنے لگا، "یار کامریڈ! پہرے والے کو بولو پینے کا پانی لاوے۔"

میں نے سلاخیں بجا کر پہرے والے کو متوجہ کیا، وہ جب قریب آیا تو اسے مگا تھما دیا۔ پانی آ گیا تو مجھ سے مگا لے کر کھوسہ ہٹلر کے سرہانے نے جا بیٹھا، تھوڑا پانی چلو میں لیا، اس کے منہ پر چھینٹے مارے، ہاتھ پھیر کر چہرہ گیلا کیا، پھر سہارا دے کر اسے اٹھایا، پانی پلایا۔ میں بھی برابر بیٹھ گیا تھا۔ پانی پی کر ہٹلر نے آنکھیں کھول دیں۔ کھوسہ نے پوچھا، "کیسا ہے تم؟"

ہٹلر کے چہرے پر جیسے کسی لہر کے ساتھ ایک دم چالاکی آ گئی۔ اس نے پہلے لاک اپ کے دروازے کی طرف سر گھمایا، پھر ہمیں دیکھ کر آنکھ ماری اور سر گوشی میں بولا، "بندہ نواز! ناچیز ٹھیک ہے ـــ بس خاموشی سے دیکھتے رہو، بے مثال اداکاری کر رہا ہے یہ خادم۔"

"اداکاری؟ واڑے وا!" کھوسہ پریشان ہو گیا۔

ہٹلر نے مسکراتے ہوئے کراہ کے کروٹ بدلی اور بولا، "جی جناب!"

ہم دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ اگر سامنے سے کوئی کھڑا دیکھ رہا ہوتا تو بھی ہٹلر کی حرکات وسکنات اسے نظر نہ آتیں۔ اب وہ کہنی ٹکا کر نیم دراز ہو گیا اور ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔ مجھے بے چینی ہوئی۔ میں نے پوچھا، "کیا بات ہے؟ کیوں لے گئے تھے تمھیں؟"

کہنے لگا، "بڑے افسران کو ہمارے دشمنوں نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور چھوٹے عملے ـــ نائب صوبے دار، حوالدار، نائک، لیس نائک ـــ کو مال پانی خرچ کر کے ہم نے قابو کر لیا ہے۔ سمجھے جناب؟ اوپر سے حکم آتا ہے کہ بھئی مرزا وحید الرشید بیگ نسیاں کو بلاؤ جلاؤ، مارو پیٹو، پوچھ گچھ کرو، نچلا عملہ کہتا ہے جو حکم سرکار اور ہمیں رات میں لے جا کے وہ ایک کمرے میں بٹھا دیتے ہیں۔ چائے پلاتے ہیں، بسکٹ کھلاتے ہیں ـــ نائب صوبے دار تو اخبار بھی پڑھ کر سناتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم ہائے وائے کا شور اور واویلا کرتے رہتے ہیں تاکہ سب یہ سمجھیں ہم پر تشدید کی جا رہی ہے۔ تو میاں! دوسرے تیسرے دن یہ ناٹک ہوتا ہے۔ ابھی تک مجال ہے جو پولیس نے ہمیں انگلی بھی چھوائی ہو۔ گویا بس زنداں میں بھی مزے آ رہے ہیں بندہ نوازیوں کے۔"

کھوسہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا، وہ بے آواز ہنس رہا تھا۔ ہٹلر نے بھی منہ بھینچ کر کندھے اچکاتے ہوئے ہنسنا شروع کر دیا۔

عجیب طرح کا فتنہ آدمی تھا!

ہم دونوں نے اس کی عیاری پر اسے داد دی تو ہٹلر کھل اٹھا، کہنے لگا، "آپ ہمدرد لوگ ہو۔ اگرچہ یہ بڑے کام ریڈ صاحب..." اس نے کھوسہ کی طرف اشارہ کیا، "یہ... خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" پھر اس نے خوشامدانہ انداز میں کھوسہ سے کہا، "برا مت ماننا سرکار! آپ نے خود ہی فرمایا تھا کہ آپ کرائے کے قاتل ہو۔ صحیح رقم ملے تو آدمی کو پار لگا دیتے ہو۔"

کھوسہ ہنسنے لگا، "اڑے ہٹلر! بَی تم مذاق مسخری کو نہیں سمجھتا؟ یار کیسا بےذوق ہے!"

ہٹلر اب مطمئن نظر آنے لگا تھا، بولا، "آپ حضرات نے ہمدردی کی ہے، اس حقیر فقیر کے ساتھ حسنِ سلوک کیا ہے اس لیے میں نچلے عملے سے آپ کی شفارش کر دوں گا۔"

"کیسی سفارش؟"

بولا "یہی جو سہولیات مجھے میسر ہیں، آپ کو بھی مل جائیں گی۔ مثلاً آپ کے لیے بھی بازار سے اول درجے کا کھانا آئے گا۔ ادھر کا راشن جو رواجاً حوالاتیوں کو ملتا ہے، وہ تو گدھے، بھینس، بکریاں بھی نہیں کھا سکتیں اور جناب بڑے کام ریڈ! آپ کے لیے بندہ پرور! سگریٹ تھری کاسل وغیرہ، اور حضور چھوٹے کام ریڈ! آپ کے لیے شکارپور کی مٹھائیاں میں خصوصیت سے لکھوا دوں گا کہ تقاضائے مہماں نوازی ہے۔"

کھوسہ نے کہا، "اتنا خرچا نئیں کرو یار ہٹلر۔"

"خرچا؟ ہُنہ! دوستوں کے لیے نسیاں کا دل گویا گنجِ قارون کا خزینہ ہے عالی جاہ! علاقے کی سب سے بڑی گیس بتی سائیکل شاپ ہے خاکسار کی۔ ہفتے کے سو ڈیڑھ سو الگ سے بُجار رہا ہوں پولیس والوں کو۔ اب اتنے خرچے پر ہم تین بھائی عیش نہ کریں تو تینوں پر لعنت ہے۔"

اس بات پر ہم تینوں دل کھول کر ہنسے مگر خاموشی سے کیوں کہ پہرے والے سپاہی کو اپنی ہنسی نہیں سنا سکتے تھے۔

کھوسہ کی بے ضرورت شوریدہ سری سے میرے دل پر جو بوجھ سا تھا، ہٹلر کے تماشوں سے

وہ کم تو ہوا تھا۔

آدھی رات گزار کر ہٹلر کے نیازمند پولیس والوں کا آدمی ہمارے لیے کھانا لایا۔ اچھا کھانا تھا۔ کچھ ایسا انتظام تھا کہ آس پاس جب کوئی ان کا اپنا آدمی ہوتا تھا تو وہ ہٹلر کو عیاشیاں کرا دیتے تھے، باقی وقت سختی اور ضابطے کی پابندی کا ناٹک چلاتے رہتے تھے۔

کھانے سے پہلے ہم راز پولیس والے نے ہٹلر اور کھوسہ کو بہت احتیاط سے ایک بوتل اور دو گلاس بھی لا دیے تھے۔ کھوسہ کو تھری کاسل کے سگریٹ بھی مل گئے تھے، اس کے تو مزے آ گئے۔ ہٹلر خود بوتل سے شغل کرتا تھا مگر تمباکو سے اس کا پرہیز تھا۔ کہتا تھا، بوتل سے "وفورِ شباب" میں مدد ملتی ہے جبکہ تمباکو جواں مرد کو "مرد کمتر" بناتا ہے۔ کھانے کے دوران وہ یہی سب اصول سمجھاتا رہا۔

کھوسہ اب اپنے اور میرے بارے میں زیادہ پریشان نہیں تھا۔ اس وقت اس کے پاس بوتل تھی۔

وہ اور وحید الرشید نسیاں دبے دبے قہقہے لگاتے، مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔

خالی بیٹھے بیٹھے مجھے کراچی اور ٹریڈ یونین آفس اور اکبری خاتون سب یاد آ رہے تھے۔

مجھے لے آئے، اکبری کو وہ شاید ادھر نہ لائے ہوں گے۔ کھوسہ اور ڈی سی کی زبانی جنگ سے میرا تو کوئی تعلق نہیں تھا مگر کیوں کہ میں کھوسہ کا دوست ہوں، مرد ہوں، انھوں نے مجھے بھی یہاں پہنچا دیا۔ اکبری کو شاید ادھر نہ لائے ہوں گے۔

احتیاطاً میں نے ہٹلر سے پوچھ لیا کہ کیا کسی عورت کو بھی کراچی سے ادھر لایا گیا ہے؟ ہٹلر بولا، "ہاں کہتے ہیں کوئی خاتون آئی تو ہے۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ اکبری کا سن کے طبیعت پریشان ہو گئی۔ مجھے اس طرح دیکھ کر سرور میں آئے ہوئے کھوسہ نے بھی نوٹ کیا۔ پوچھنے لگا تو میں نے کہا، "خبر نہیں یار اکبری کو کیوں لائے ہیں؟ یہاں کہاں رکھا ہے؟ کھانے پینے کو بھی کچھ دیا ہے یا...؟"

کھوسہ اس وقت ہر چیز کو ہلکے پھلکے لے رہا تھا۔ تسلی دینے لگا کہ بس ٹھیک ہی ہو گی، تو فکر نہ کر۔

ہٹلر نے پوچھا کہ کیا بات ہے "یہ کام ریڈ برخوردار" کس لیے پریشان ہے؟ کھوسہ نے بتا دیا ــــ ہٹلر سے کہنے لگا، "بئی وہ خاتون جس کو پولیس ادھر لائی ہے وہ اپنے کامریڈ کا دلبر ہے۔ اسے فکر پڑ گئی ہے۔ بس یہ بات ہے۔"

ہٹلر نے کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا، تشویش سے بولا، "اوہو! تو وہ ان برخوردار کا محبوبِ مجازی ہے جس کے ساتھ ضلعی حکام اپنا منہ کالا کر رہے ہیں؟"

یہ بات سن کے تو جیسے میرا دم ہی نکل گیا۔ ہٹلر میرا چہرہ دیکھ رہا تھا، معذرت کرنے لگا۔ بولا، "میری مراد وہ نہیں تھی جو تم سمجھے ہو میاں۔ دراصل سینیئر پولیس حکام نے اُس خاتون کو یہاں کسی لاک اپ میں نہیں رکھا ہے بلکہ صرّافے میں ایک جوہری ہے، اُس خبیث نے کوئی جگہ ان امور کو سرانجام دینے کے لیے بنا رکھی ہے، وہاں چوکی پہرے میں رکھا ہے اسے۔ آج تو خیر نہیں، مگر کل سے ضلعے کے شوقین مزاج حکام جوہری کے اس ٹھکانے پر آنا شروع ہوں گے ــــ یعنی کل سے آبروریزی کا پروگرام ہے۔"

میں نے دیکھا کھوسہ اس کیفیت میں داخل ہو چکا تھا کہ کسی بات کی بھی اب اسے کوئی زیادہ فکر نہیں تھی۔

ہٹلر میری ہمدردی میں کچھ دیر سر جھکائے، کھانے سے ہاتھ روکے بیٹھا رہا۔ پھر میری پیٹھ تھپک کر بولا، "تم کھانا کھاؤ کامریڈ! کچھ سوچ لیں گے۔ مرزا وحید الرشید بیگ نسیاں اب اتنا عاجز بھی نہیں ہے کہ غلط کار حکام سے آپ کی عفت مآب..."

میں نے جلدی سے کہا، "کھوسہ جو کچھ کہہ رہا ہے ایسا بالکل نہیں ہے۔ ویسے وہ ہمت والی عورت ہے۔ ہم لوگوں کی ساتھی ہے۔ یونین آفس میں کام کرتی ہے۔"

کھوسہ کچھ دیر کو جیسے ہی بیدار ہوا، ہٹلر سے کہنے لگا، "ہاں بئی ــــ اکبری کو تکلیف نہیں پہنچنا چاہیے۔ مزدور تحریک کے لیے ڈوب مرنے کا بات ہوئیں گی۔"

ہٹلر نے مستعدی سے کہا، "نہیں پہنچے گی تکلیف۔ آپ دونوں بھائی بے فکر رہو ــــ بس! یہ میرا وعدہ ہے۔"

کھوسہ، بوتل کی عطا کی ہوئی بے فکری میں سو رہا تھا۔ ہٹلر پڑیا کھول کر پان کھانے لگا۔ مجھ

سے پوچھتا تھا کہ اگر کھاؤ تو تمہارے لیے میٹھا پان منگا دیتے ہیں۔ میں نے کہا، نہیں۔

میں پان کا پھینکا ہوا کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگا تو ہٹلر کو یاد آیا کھمیں کھیں کچھ پڑھاتا بھی ہوں۔ اس نے خوش ہو کر جیب سے ایک پنسل اور کاغذوں کا چھوٹا سا رول نکال کر مجھے تھما دیا۔ کہنے لگا، "یہ میری غزلیں ہیں۔ ایک پولیس والے سے لکھوا لی تھیں۔ کیا کرتا، کوئی اور میسر ہی نہ تھا۔ میاں ذرا پڑھ کے سناؤ، میں چیک تو کر لوں، ایسا نہیں اس حرام الدہر نے لکھتے ہوئے کچھ کمی بیشی کر دی ہو۔"

مجھے بڑی حیرت ہوئی ـــــ یہ نسیاں خان پوری پڑھالکھا نہیں تھا!

مجھے حیران دیکھ کر وہ ہنسا۔ بولا، "جناب والا! نسیاں تخلص اسی لیے رکھا ہے فدوی نے کہ سائیکلوں، گیس بتیوں کی مصروفیات میں پڑھا لکھا سب بھول چکا ہے یہ ناچیز... یاد تھیں مجھ کو بھی رنگارنگ بزم افروزیاں ـــــ جو کہ اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں۔"

اکبری کی وجہ سے ذہن پریشان تھا مگر رات دیر تک میں ہٹلر کی منحوس غزلیں بلند آواز سے پڑھتا رہا۔ وہ کہیں کہیں "تصحیح" کراتا رہا۔ آخر میں خود بھی اونگھ گیا۔

دوسرے دن پولیس والے ہٹلر کو سویرے ہی لے گئے۔ وہ اسی طرح خوف کی اداکاری کرتا ہوا گیا تھا۔

ادھر یوں لگتا تھا کہ پولیس والے جیسے ہمیں بھول گئے ہیں۔ پہرے کے سپاہی اور آتے جاتے کانسٹیبل یا افسران ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔

دھوپ چڑھے چائے بیچنے والا آیا تو پہرے والے نے چار چار پاپے بسکٹ اور گلاس بھر بھر کے چائے ہمیں دلادی۔ کھوسہ کو رات کی سب باتیں یاد آ گئی تھیں۔ وہ اس وقت بہت غصے میں تھا اور گم سم بیٹھا تھا۔ بسکٹوں پاپوں کو اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ چائے پی کر ایک طرف خاموش بیٹھ گیا۔

جب تک کھوسہ اپنا غصہ اپنے اندر اتارتا رہا میرے لیے اسے سنبھالنا آسان رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں تسلی اور حوصلے کا کوئی فقرہ کہہ دیتا اور وہ ہوں ہاں کر دیتا۔ لاک اپ کے ماحول میں اداسی مگر ظاہری سکون تھا۔ لیکن پولیس والوں کو دیکھ دیکھ کے کھوسہ کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے

کچھ کچھ بولنا شروع کر دیا تھا۔ وہ لمحۂ موجود کے جبر اور پچھلی ایک صدی کی ناانصافی پر بلند آواز میں گالیاں بکنے لگا اور اردو، انگریزی اور اپنی مادری زبان میں چھوٹی چھوٹی تقریریں کرنے لگا۔

میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، کیوں کہ بار بار وہ کہہ رہا تھا کہ اکبری کو ان درندوں سے چھڑانے کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا ــــ یہ ضروری ہے۔ پھر جو بھی ہو پروا نئیں ــــ جان تو ایک روز ویسے بھی جانی ہے۔

میں نے کہا، ٹھیر جاؤ یار، یہ ہٹلر کام کا آدمی ہے، اسے آلینے دو، کچھ کرتے ہیں، اس کے رابطے استعمال کر کے یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوئی ترکیب سوچتے ہیں۔ (آدمی خود کو کیسے کیسے بہلاوے دیتا ہے!)

دوپہر کے قریب شہر کے کسی ہوٹل سے کھانوں سے بھرے ناشتےدان آگئے۔ تھوڑی دیر بعد ہٹلر بھی آگیا۔ پہلے کی طرح اسے دو پولیس والے سہارا دے کر لائے تھے۔ لگتا تھا ہٹلر اب جو حوالات میں آئے گا تو ایسا گرے گا کہ پھر اٹھ نہیں سکے گا۔

اس کی اداکاری دن کے وقت بھی بہت کامیاب تھی۔

وہ آیا تو میں نے بتا دیا کہ کھوسہ بہت طیش میں ہے، کہیں کچھ الٹا سیدھا نہ کر بیٹھے۔ ہٹلر یہاں بھی بہت کام کا آدمی نکلا؛ اس نے کھوسہ کو سمجھایا، تسلی دی اور کھانا کھلا دیا۔ کہنے لگا، "بندہ نواز! اچھا ہی ہوا جو خاکسار کو پولیس والے سویرے ہی لے گئے تھے، کس لیے کہ نائب صوبےدار کسی کام سے نکلنے والا تھا۔ میں نے روک لیا، کہا کہ بھئی سن، اپنا دوست چھوٹا کام ریڈ اس بی بی کے عشقِ صادق میں مبتلا ہے جسے بڑے افسران خراب کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے شور مچایا، "واہ ہٹلر! بلاوجہ یہ کیا کہتے پھر رہے ہو؟"

وہ چالاکی سے مسکرایا۔ کہنے لگا، "سنو تو حضرت! عشق عاشقی کا ذکر کرو تو پولیس والے تک بات جلد سمجھ لیتے ہیں ــــ خیر، تو میں نے کہا وہ بی بی جسے حکام بالا خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں اسے ہر قیمت پر بچانا ہے، پیسے چاہے جتنے خرچ ہوں۔ کچھ ایسا کرنا ہے کہ خبیث افسرانِ بالا اپنے امورِ خبیثانہ میں دو چار روز اور کامیاب نہ ہو سکیں۔ نائب صوبےدار کہنے لگا، دو دن کا تحفظ ملے گا، زیادہ کی گارنٹی نہیں دیتا اور روپے پورے ایک ہزار خرچ ہوں گے۔ میں نے کہا، دیے! وہ امید دلا

کے چلا گیا۔ یہ خاکسار اس کے کمرے میں انتظار کرتا رہا۔ دو گھنٹے گزار کے عالی جاہ! وہ آیا تو اس نے عجیب بات کہی۔"

کھوسہ آگے جھکا ہوا پوری توجہ سے بٹلر کی باتیں سن رہا تھا۔ بے چین ہو کر بولا، "کیسا عجیب بات؟"

بٹلر کہنے لگا، "بھئی نائب صوبا یہ خبر لایا کہ حکامِ بالا نے بالا ہی بالا اس خاتون کو شہری ٹھکانے سے ہٹا کر بیرونِ شہر کسی ڈانک بنگلے میں پہنچا دیا ہے اور کل طلوعِ آفتاب کے وقت سے شوقین حکام کی سواریاں بادبہاریاں نازیبا حرکات کے لیے ڈانک بنگلے پہنچنا شروع ہو جاویں گی۔"

کھوسہ نے کہا، "تو ٹھیک ہے ہم یہ سامنے والا گارڈ کا گن چھین کے دو چار کو مار دوں گا۔ قومی پیپرز کا خبر بروبر بنیں گا۔ پھر حکامِ بالا حرام خور کا جو مرضی ہو کر لیوے ___ پروردگار کا قسم ہے ہم اس کوشش میں جان دے سکتاؤں ___ سمجھا آپ لوگ؟"

بٹلر نے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ٹھنڈا کیا۔ بولا، "سرکار! آپ کی طرح میں بھی متفکر ہوں ___ متفکر ضرور ہوں مگر عالی جاہ! دیکھیے کچھ نہ کچھ کر ہی رہا ہوں۔ فوری مسئلہ یہ ہے بندہ پرور! کہ نائب صوبے دار نے ایک ہزار کی میری آفر لوٹا دی ہے۔"

میں نے گھبرا کے پوچھا، "کیا مطلب؟ ایک ہزار کی آفر کیوں لوٹا دی؟"

بٹلر بولا، "میاں کام ریڈ بلند اقبال! سمجھا کرو۔ نائب صوبے دار کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے ___ اس کے سامنے فی الوقت ہاتھیوں کا لشکر کھڑا ہے۔ اگر میرے اس کے رابطے کا پول کھل جائے تو پانچ منٹ لگیں گے اور نائب صوبے صاحب کو بھی فنگر پرنٹ لے کر سامنے والی حوالات میں بھیڑ دیا جائے گا۔ سویرے سے سرکاری اکونٹ میں اس سالے کی بھی چاے روٹی آنے لگے گی۔"

حالات واقعی سخت پریشان کن ہو چکے تھے۔

کھوسہ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر بٹلر سے پوچھنے لگا کہ وہ ڈاک بنگلہ جس میں اکبری کو رکھا گیا ہے، شہر کے کس رخ پر ہے؟ برسوں سے یہ نسیاں خان پوری ہی کا شہر تھا اس نے جگہ سمجھا دی۔ کھوسہ کئی بار آ چکا تھا۔ جگہ اس کی دیکھی ہوئی تھی۔

مگر ہم حوالات میں بند بیٹھے تھے۔ ڈاک بنگلے کا پتا سمجھنا نہ سمجھنا برابر تھا۔ حالت تو یہ تھی کہ ہتھکڑیاں ڈلوائے بغیر ہم اپنی ضرورت سے غسل خانے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ کانسٹیبل زنجیر تھامے باہر کھڑا رہتا تھا۔

کھوسہ کی طرح میں بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ نسیاں خان پوری ہٹلر نے دھیرے دھیرے گنگناتے ہوے اپنے گھٹنے پر دو انگلیوں سے طبلہ بجانا شروع کر دیا تھا۔ وہ شاید غزل بنا رہا تھا۔

اسی پریشانی میں کچھ دیر میں سویا بھی۔ دن کے وقت بھی بُرے بُرے خواب آتے رہے۔ ہر طرف ہتھکڑیاں، بیڑیاں اور بے چاری اکبری کی خواری دیکھتا رہا۔

شام کو آدمی چائے لے کے آیا تو میں نے پہرے والے سے کہہ کے اپنے اور کھوسہ کے لیے ایسپرین کی ٹکیاں منگوائیں۔ گولی کھا کے چائے پی کے بیٹھا تو ذرا ذہن کھلا۔ ہٹلر اپنے عاشقانہ معرکوں کا بیان شروع کرنے والا تھا کہ کھوسہ نے "چپ کروڑے!" کہہ کے اس کا حوصلہ پست کر دیا۔ وہ پھر گھٹنے پر انگلیاں بجانے لگا۔ شاید خفا ہو گیا تھا۔ خود سے کوئی بات ہی شروع نہیں کر رہا تھا۔

کھوسہ نے اپنے طور پر حوالات سے نکل بھاگنے کے امکان پر اس سے مشورہ طلب کیا تو ہنسا۔ کہنے لگا، "عالی جاہ! آپ تجربے کار آدمی ہو مگر بات ایک دم لڑکوں بالوں جیسی کر رہے ہو۔ اے حضور! یہ مضافات کا تھانہ نہیں ہے، پولیس لائنز کی لاک اپ ہے۔ یہاں نقب بھی لگاؤ گے تو بندہ نواز! اگلی کسی حوالات یا اس سے اگلی میں جا نکلو گے۔ فرار ناممکن ہے کام ریڈ صاحب!"

کھوسہ لاک اپ میں ٹہل ٹہل کے بڑبڑاتا رہا کہ بس اکبری کو لے کے ایک بار ہم لوگ کھلی جگہ میں نکل جائیں، پھر نمٹ لیں گے جو بھی سامنے آئے گا۔ ہٹلر کھوسہ کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ ایک بار رک کر بولا، "اچھا کچھ ہم کرتے ہیں، کچھ آپ کیجیے۔"

"ہم کیا کرے؟ بولو؟"

"آپ عالی جاہ! دعا کیجیے۔ ایک منصوبہ ذہنِ رسا میں بن تو رہا ہے۔ کاش اس وقت رات سے پہلے نائب صوبا یا حوالدار ایک بار مجھے بلا لے۔ آپ بس دعا کیجیے کہ مجھے بلا لیا جاوے ۔۔۔ رابطہ ہو جائے میرا۔ پھر میں کچھ کرتا ہوں۔"

میں نے اپنی پریشانی میں ایک احمقانہ تجویز یہ دی کہ ہٹلر خود سے نائب صوبے دار کے پاس چلا جائے۔

وہ سن کے ہنسا، کہنے لگا، "خود سے کوئی جاتا ہے عقوبت کی طرف کو؟"

خدا کرے اس کا پولیس والا کوئی آ جائے ـــ میں دعا کرنے لگا اور ہٹلر نے ٹہل ٹہل کر، بہ قولِ خود، منصوبے کی سلوٹیں نکالنی شروع کر دیں۔ مگر اس نے بتایا نہیں کہ منصوبہ کیا ہے۔

آخر مغرب بعد ایک میلا کچیلا حوالدار لاک اپ کے سامنے سے گزرا تو ہٹلر نے "شش" کر کے اسے متوجہ کیا، پھر آنکھیں گھما پھرا کر، انگلیاں چلا چلا کر اسے کوئی پیغام دیا۔ حوالدار چلا گیا، دس منٹ بعد ہی کانسٹبل ہتھکڑیاں لے کر آئے اور لرزتے کانپتے ہٹلر کو "تفتیش خانے" لے گئے۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دل کہہ رہا تھا کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور جو ہمارے لیے بہتر ہو گا۔

انتظار جان لیوا ہوتا ہے۔ ایک پہر گزر گیا پھر کہیں جا کے پولیس والوں کے بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ تین کانسٹبل ہٹلر کے ساتھ آئے تھے۔ دو اسے سہارا دیے ہوئے تھے تیسرے نے پہرے والے کو بلا کر لاک اپ کھلوایا۔

ہٹلر حسب معمول آہ اوہ کرتا ہوا بستر تک آیا اور جس طرح شیشے کی کرچیوں سے بنی بچھات پر کوئی لیٹتا ہو گا وہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ پولیس والے چلے گئے تو ہٹلر نے زور سے کراہ کر کروٹ لی۔ اشارے سے ہمیں اپنے پاس بلایا۔ پھر ایک بار کروٹ بدلتے ہوئے ہٹلر نے اپنا نیفہ ٹٹول کر کوئی چھوٹی چمک دار سیاہ چیز نکالی اور کھوسہ کو پکڑا دی۔ سرگوشی میں اس نے کہا، "عالی جاہ! سنبھال کے رکھیے گا۔ پورا لوڈ ہے۔"

ہماری حیرت کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ کھوسہ نے ہٹلر کی اور پھر میری صورت دیکھی اور اس سیاہ چیز کو، جو جیبی قسم کا پستول تھا، اپنی بیلٹ میں لگا کر اوپر سے بش شرٹ برابر کر لی۔

ہٹلر نے مکاری کی ایک زور دار آہ کی جس پر کھوسہ نے آہستہ سے کہا، "واڑے ہٹلر! تم افلاطون ہے بئی۔"

جواب میں ہٹلر مسکرایا، بولا، "تفصیلات ابھی عرض کروں گا عالی جاہ! فی الحال اپنے کمبلوں پر تشریف لے جائیے۔"

پانچ دس منٹ تک وہ کراہنے، آہ بھرنے، غش کھا جانے کی اداکاری کرتا رہا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ پہرے والا یا کوئی اب ادھر نہیں آئے گا تو اٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا، "دو ہزار روپے نائب صوبے نے صرف پستول حوالے کرنے کے لیے ہیں۔ کارروائی کے بعد پستول واپس کرنا ہو گا اور فرار کرانے کی اجرت آٹھ ہزار روپے الگ دینا ہوں گے۔ یعنی اس طرح سمجھیے کہ مہینے بھر کے اندر دس ہزار روپے اور یہ پستول میری گیس بتی سائیکل شاپ پر پہنچوانے ہوں گے اور حضورِ والا! اگر پیسے کی اگائی میں، بہ فرضِ محال، کچھ اور وقت چاہیے تو سرکار میری شاپ پر کھلوا بھیجنا ــــ میں نائب صوبے کو سمجھا لوں گا۔ تاہم،" بٹلر نے ایک بار پھر کہا، "تاہم، ہر صورت میں ساٹھ روز کے اندر اندر پیسے اور پستول پہنچ جانے چاہییں۔"

کھوسہ نے خوشی سے جیسے چھلکتے ہوئے کہا، "ساٹھ دن کو چھوڑو یار بٹلر! ہم دس روز میں پیسا اور ہتھیار بھیج دوں گا۔"

آگے اس نے بتایا کہ فرار کی صورت یہ ہے کہ فجر سے ایک دم پہلے نائب صوبے کا خاص آدمی لاک اپ کے پہرے پر ہو گا۔ وہ کھٹکا کر کے ہم دونوں کو اٹھا دے گا۔ ظاہر یہ کیا جائے گا کہ جیسے ہم غسل خانے جانے کے لیے اٹھے ہیں۔ یہ پہرے والا بعد میں لاک اپ کے سامنے ایسے پڑا ہوا ملے گا جیسے حملہ کر کے اس پر قابو پا لیا گیا تھا۔ یہاں سے نکل کے ہم خاموشی سے لاک اپ کے پچھواڑے پہنچیں گے جہاں نائب صوبے دار کی اسکوٹر پیٹرول بھری تیار کھڑی ہو گی۔

بٹلر نے ہمیں اسکوٹر کی فالتو چابی دی۔ کہنے لگا، "اسکوٹر ٹاپ کنڈیشن میں ہے۔ بس حضور! آپ دونوں لاک اپ کے پچھواڑے سے ایم ٹی ورکشاپ کی طرف ہو لینا۔ ویسے تو بہ فضلِ تعالیٰ خطرہ نہیں ہے، تاہم، کوئی پیچھا کرے تو دو ہوائی فیر کافی ہوں گے۔ ادھر کے گیٹ پر اپنا آدمی پہرہ دیتا ہو گا۔ آپ دونوں یہ ایک ایک چادر اوپر ڈال لینا۔ غیر دیکھے گا تو سمجھے گا دودھ والے آئے تھے، کوارٹروں میں دودھ دے کے جا رہے ہیں ــــ اور سرکار! آگے کا یہ ہے کہ آگے تو آپ کا اور اکبری خاتون کا نصیب ہی کام کرے گا۔ ڈانک بنگلے پر افسرانِ بالا کے دو آدمی ہوں گے ــــ ان کے خاص الخاص بندے، انھیں پستول وستول چلا کے زیر کرنا ہو گا۔ تو یہ ہے جنابِ والا! بس، خاتون کو اپنے پیچھے اسکوٹر پر بٹھا کے آپ تینوں نکل جانا ــــ ہرچہ بادا باد!"

خوشی سے میری باچھیں کھلی جاتی ہوں گی، کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے ہٹلر سے پوچھا، "اور اسکوٹر کا کیا ہو گا؟"

ہٹلر رازداری سے ہنسا، کہنے لگا، "حضرت! ضلعے کی حدودیں پار کرتے کرتے پیٹرول پورا پڑ جائے گا۔ آپ کے پاس عالی جاہ! آتشیں اسلحہ ہے، وہ دکھا کے کوئی گاڑی ٹرک قبضے میں کر لینا، اسکوٹر وہیں چھوڑ دینا۔ پولیس والے کا مال ہے، سدھائے ہوئے قبوتر کی طرح آپی آپ نائب صوبے کے پاس پہنچ جائے گا۔ ہر چہ بادا باد!"

کھوسہ بھی بہت مگن ہو گیا تھا۔ خوب ہنس رہا تھا۔ کہنے لگا، "او بادا باد کے بچے! بھلا تیرا کیا بنے گا؟ ہم لوگ کے ساتھ تم نہیں چلیں گا؟"

ہٹلر نے مسکرا کر کہا، "فدوی کو مفرور ہونے کی کیا ضرورت ہے سرکار! ناچیز کو اس دفعے بھی کورٹ سے باعزت بری کیا جاوے گا۔"

میں نے حیران ہو کے پوچھا، "یہ آپ نے اِس دفعہ بھی کیا کہا؟ کیا پہلے بھی زور زبردستی کا کوئی کیس چلا تھا؟"

نسیاں خان پوری ہٹلر خوب صورتی سے مسکرایا، "عالی جاہ! دو برس میں بالجبر کا یہ تیسرا مقدمہ قائم کرایا ہے ناچیز کے دشمنوں نے، ہے ہے ہے۔"

"کیا مطلب؟ اسی محبوب کے ساتھ تین مرتبہ کیس کیسے بنایا؟"

ہٹلر نے اپنی چمک دار آنکھیں پھرا کر جواب دیا، "نہیں بندہ پرور! وہ جو کہتے ہیں نا کہ پرندے مختلف تھے ہر دفعے اور ہر دفعے تھی قوتِ پرواز بھی وکھری ـــــ تو وہ معاملہ ہے، ہے ہے ہے۔"

تھوڑا کچھ کھا پی کے ہم سونے لیٹ گئے۔

مجھ ایسا امن پسند آدمی بھی خیالوں میں فرار کی تیاریاں کرنے لگا اور پستولیں چلانے لگا۔ کھوسہ کا قبائلی خون تو پوری طرح جوش میں تھا۔ رات ڈیوٹی والے پہرے دار نے باتیں کرنے کو منع کیا۔ وہ الجھ گیا۔ ہٹلر نے اور میں نے مصلحتیں سمجھا کے اسے بہ مشکل قابو کیا۔

پولیس والے رات میں ہٹلر کو پھر ایک بار لے گئے۔ وہ جاتے ہوئے کہہ گیا کہ حضور سونا

مت، میں ابھی آتا ہوں۔ شاید کوئی ضروری نکتہ رہ گیا ہے جبھی اس وقت لے جا رہے ہیں۔

مگر دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے وہ لوگ ہٹلر کو نہیں لائے۔ ہم انتظار میں اونگھ چلے تھے کہ پولیس لائنز ہی میں کہیں سے دو بار گولی چلنے کی آواز آئی اور سیٹیاں بجنے لگیں۔ کوئی گڑبڑ ہو رہی تھی۔

میں ہمیشہ کا محتاط آدمی، میں نے کہا، "کھوسہ! پولیس لائنز میں کہیں گڑبڑ ہوئی ہے۔ ایسا کر پستول مجھے دے دے۔ اس وقت پاس رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں ادھر کہیں ڈبلیو سی میں چھپا کے آتا ہوں۔ نائب کا آدمی جب سویرے یہاں سے ہمیں نکالے گا تو اٹھاتے چلیں گے۔"

کھوسہ راضی نہیں ہوتا تھا۔ کہنے لگا کہ ہاتھ آیا ہتھیار میں تو نہیں چھوڑتا۔

میں نے کہا، "پاگل مت بن۔ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو وہ لوگ ادھر بھی آ کے حوالاتیوں کی تلاشی لیں گے۔ یہی طریقہ ہے۔ بیٹھے بٹھائے ہم لوگ پھنس جائیں گے۔ کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ تو پستول دے دے بھائی میرے۔ یہ ہاتھ سے نہیں جائے گا۔ سمجھو پاس ہی رہے گا۔"

بہت مشکل سے کھوسہ نے پستول میرے حوالے کیا۔ میں ہاتھ جوڑ کے سنتری کی خوشامد کر کے ہتھکڑی ڈلوا ڈبلیو سی گیا اور رومال لپیٹا ہوا پستول اور اسکوٹر کی چابی چھت کی ٹائلوں میں چھپا آیا۔

سمجھو بال بال بچے۔ کیوں کہ جیسے ہی لاک اپ میں واپس آ کے میں کمبل پر لیٹا ہوں گا کہ باہر جیپ گاڑیاں آ کر رکیں اور بہت سے پولیس والے دھڑدھڑاتے ہوئے لاک اپ کھلوا کے اندر آ گھسے۔ انھوں نے ہماری اس طرح تلاشی لی کہ کیا کبھی کسی کی تلاشی لی گئی ہو گی۔ ساتھ آنے والا نائب صوبے دار بہت پُرجوش اور خاصا پریشان تھا۔ میں نے سوچا مخالف گروپ کا ہو گا۔ شاید کسی نے ہماری مخبری کر دی ہے۔

فرار کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ ہٹلر بھی لوٹ کر نہیں آیا تھا جو کچھ معلوم ہوتا۔

صبح ہماری طرف افسروں کی بڑی آون جاون، گھما گھمی رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصہ کیا ہے اور رات کیا گڑبڑ ہوئی تھی۔

کہیں دوپہر کے بعد چائے والے سے پوچھنے کا موقع ملا۔ اس نے جو بات بتائی تو سر چکرا گیا۔ بالکل بھی عقل میں آنے والی بات نہیں تھی۔ کہنے لگا، "رات میں جو گولیاں چلی تھیں تو

عبدالوحید سائیکل گیس بتی والے کو، وہی جو ادھر تمہارے ساتھ تھا، گارڈ نے گولی ماری تھی۔"

وحید ہٹلر اگلے کسی لاک اپ کے ڈبلیو سی کی دیوار پھلانگ رہا تھا۔ دونوں گولیاں پیٹھ میں لگیں۔ اسی وقت مر گیا تھا ــــ بے چارہ!

حد ہو گئی! ہٹلر اِدھر ہمارے فرار کے لیے لین دین کر رہا تھا، اُدھر خود دیواریں پھلانگتا ہوا مارا گیا۔ کہہ رہا تھا باعزت بری ہو جاؤں گا۔ یہ قصہ کیا ہے؟ بات سمجھ میں نہ آئی۔ عجیب طرح کی الجھن اور اداسی رہی۔

مگر شام تک ہم پوری طرح مصروف ہو گئے اور یہ سب جیسے بھول گئے۔ کراچی سے وکیلوں کے ساتھ اکبری اور دو تین دوست آ گئے اور ان کے ساتھ اخبار والے بھی۔ اکبری کو دیکھ کے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہٹلر مرحوم کی اطلاع درست نہیں تھی یا وہ کسی اور عورت کا کہہ رہا ہو گا ــــ اکبری خاتون کو کراچی ہی سے رہا کر دیا گیا تھا۔

دوسرے دن سویرے مقامی عدالت سے ہم دونوں کی بھی ضمانت ہو گئی۔

پستول اور اسکوٹر اور فرار وغیرہ جیسے اب افسانوی باتیں لگ رہی تھیں۔

وکیل اور اکبری کچھ کاغذوں کی نقلیں نکلوانے پیش کار کی طرف گئے ہوئے تھے۔ ہم نے سوچا چائے خانے میں ان کا انتظار کریں گے، ایک ایک چائے بھی پی لیں گے۔

میں پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگانے ہی والا تھا کہ سامنے کی میز پر بیٹھے ہوئے آدمی نے گھوم کر ادھر دیکھا۔ پیالی میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

مڑ کر دیکھنے والا مرزا وحید الرشید ہٹلر مرحوم تھا۔ وہی مکھی مونچھ، وہی چمک دار فطین آنکھیں، وہی سوکھا سمٹا قد بت۔

مگر یہ کیسے ممکن ہے؟! ہٹلر تو بیت الخلا کی دیوار پھلانگتا ہوا پولیس کی گولی سے مارا گیا۔

کھوسہ بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔

میز پر کہنیاں ٹکا کر بیٹھے ہوئے ہٹلر آدمی نے بیرے کو آواز دی ــــ تب پتا چلا کہ یہ ہٹلر نہیں ہے اس جیسا کوئی دوسرا آدمی ہے کیوں کہ اس شخص کی آواز بہت کڑک دار تھی۔ بے چارے ہٹلر کی طرح مسمسی نہیں تھی۔

نہ معلوم کیوں اپنی کرسی چھوڑ کر میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا، "معاف کرنا بھائی۔ آپ کی صورت ہمارے ایک دوست سے بہت ملتی ہے۔"

ہٹلر کے ہمشکل نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ اداسی سے اپنی کڑک دار آواز میں بولا، "ہاں صاحب ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ سب مجھے بھائی صاحب سمجھتے ہیں۔ میں وحید صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں، عبدالحمید۔"

کھوسہ نے دھیرے سے کہا، "افسوس ہوا وحید صاحب کا سن کے۔"

ہم شکل نے اثبات میں سر ہلایا، "ہاں جی، مقدّر کی بات ہے۔"

"کیا ہوا تھا؟" کھوسہ بولا، "کیا ضرورت تھا بئی فرار ہونے کا؟ اتنا بڑا کیس تو نہیں تھا۔ ریپ کا الزام اگر وہ لوگ ثابت بھی کر دیتا..."

"ریپ؟" ہمشکل بھائی نے اپنی کڑک دار آواز میں پوچھا، "صاحب! چوری کی سائیکلیں خریدنے کا الزام تھا، وہ بھی جھوٹا۔ آپ زور زبردستی کی بات کرتے ہو؟ وحید بھائی بہت شرمیلے آدمی تھے۔ غیر عورت سامنے آجاتی تھی تو ہکلانے لگتے تھے، یہ تو حالت تھی ان کی۔"

"اوہ!" کھوسہ میری طرف دیکھنے لگا۔

"پھر بھی بھائی،" میں نے کہا، "ایسا کون سا کیس تھا۔ کوئی قتل کا مقدمہ تو تھا نہیں — کیوں فرار ہو رہے تھے۔"

"آپ کو نہیں پتا صاحب،" بھائی بولا، "آپ کو کیا پتا — انھیں ایک ساجش میں آلہ کار بنایا گیا تھا۔"

"کیسی سازش؟" میں نے کھوسہ کی طرف دیکھا۔

ہم شکل نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، "ایک ڈی سی حرامی کا دشمن کوئی مزدور لیڈر ادھر بھائی صاحب کے ساتھ حوالات میں بند تھا۔ ڈی سی کے گرگے نائب صوبے دار نے وحید بھائی کو دھوکا فریب دے کے مزدور لیڈر کو لاک اپ سے فرار ہونے کی لائن سمجھوائی۔ لوگ بولتے ہیں مزدور لیڈر کو ایک پستول بھی بھائی کے ہاتھ سے پہنچوا دیا اس ماں کے پُوت نے — ساجش یہ تھی کہ لیڈر حوالات سے فرار ہوئے گا۔ نائب صوبا کتے کا جنا اُدھر پہلے سے چھپا بیٹھا ہوگا۔ لیڈر کے پستول میں

ہوں گے بے کار کے کار توس۔ بس نائب صوبا بھون ڈالے گا اسے۔ آگے وہ لوگ کہہ دیں گے کہ جی پولیس مقابلے میں مارا گیا۔"

کھوسہ نے ہاتھ بڑھا کر سختی سے میرا بازو تھام لیا۔

"بس،" بٹلر کا بھائی بولا، "تو سمجھے جناب؟ بھائی صاحب کو اللہ بخشے رات میں عین موقعے پہ پتا چلا کہ کیا سازش، حرام پائی ہو رہی ہے۔ وہ اسی ٹیم کا کوس کا بہانہ کر کے پیٹ پکڑے پکڑے گئے۔ دیوار پر چڑھ کے لیڈر کو ہشیار کرنے وہ اُدھر کودنے ہی والے تھے کہ گارڈ لوگوں نے گولی چلا دی۔"

کھوسہ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ لگتا تھا کرسی سے گر جائے گا۔ مگر پھر وہ سنبھلا، لرزتا ہوا کرسی سے اٹھا، اس نے اپنے بازو پھیلا دیے اور بٹلر کے بھائی عبدالحمید کو سینے سے لگا لیا۔ "یار، خدا پروردگار کا قسم ہے، دل بل گیا ہے میرا۔ شیر کا بچہ تھا تیرا بھائی!"

آدمی نامہ

۱

اس وقت تک بجلی سب گھروں میں نہیں آئی تھی، اور ریڈیو تو محلّے میں کسی ایک گھر میں ہوتا ہو گا۔ بہت سے محلے تو ایسے تھے کہ وہاں ریڈیو والا گھر بھی نہ تھا۔ ہمارے محلے میں نواب صاحب کے ہاں بجلی بھی تھی اور ریڈیو بھی۔ دوسری عالمی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور ہمارے دادا کی تسلّی صرف اخبار پڑھ کر نہیں ہوتی تھی۔ پھر نواب صاحب کی ان کی دوستی بھی بہت تھی، اس لیے جب نواب صاحب نے بار بار مدعو کیا تو دادا بھی ریڈیو سننے جانے لگے۔

ہماری حیثیت دادا کے اے ڈی سی کی تھی، چناں چہ نواب صاحب کی ریڈیو والی محفل میں ہم بلاناغہ شریک ہوتے تھے۔

نواب صاحب کی ڈیوڑھی میں جہاں شام کو فرش دُھلنے کے بعد صندوق کا صندوق ریڈیو اٹھا کر لایا جاتا اور فرش میں تقریباً نصب کیا جاتا تھا، مہمانوں کی بھاری بھرکم کرسیوں کے ساتھ ہمارے لیے بھی بنا ہتھوں کی ایک چھوٹی کرسی بچھنے لگی۔ ہماری کرسی دادا والی کرسی اور نواب صاحب کی آرام کرسی کے درمیان ڈالی جاتی تھی، وہ اس لیے کہ ہم دادا کے قرب کی وجہ سے ڈسپلن میں بھی رہیں اور ریڈیو کی نیلی آنکھ کو آوازوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جھپکتے ہوئے بھی دیکھتے جائیں، کیوں کہ ریڈیو کی گھن گرج اور اس کی بھاری بھرکم موجودگی میں ایک یہی چیز ہماری دل چسپی کی

تھی۔ نواب صاحب کی آرام کرسی کے قریب اسے بچھائے جانے کا ایک فائدہ یا نقصان یہ ہوا کہ ہمیں نواب صاحب کو قریب سے دیکھنے اور محلے کے بچوں کے لیے ان کی جاسوسی کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ ان کے لباس، کنجوسی اور حد سے بڑھی ہوئی صفائی پسندی کے سوا بہ ظاہر کوئی ایسی بات نواب صاحب میں نہیں تھی جو محلے کے بچے اور افواہ پسند لوگ ان میں اتنی دل چسپی لیتے۔ ہم نے ایک خاص بات ضرور نوٹ کی تھی کہ نواب صاحب مسکراتے بہت کم تھے اور کبھی ضرورت پڑے تو یہ کام وہ بڑی خِست سے کرتے تھے، جیسے مسکرانے میں بھی کچھ خرچ ہوتا ہو۔ اسی طرح کپڑوں کا معاملہ بھی تھا۔ وہ اپنے گھر میں، یا گھر کے سامنے سڑک پر ہوتے تو چوخانے والی تہ بند اور بے داغ سفید نیم آستین پہنے رہتے۔ یہ نیم آستین واسکٹ سے بس اتنی مختلف تھی کہ واسکٹ میں کہنیوں تک آستینیں نہیں بنائی جاتیں۔ نواب صاحب یہ لباس اور کھڑاویں اپنے گھر میں اور گھر کے عین سامنے تک پہنے رہتے تھے۔ اگر انھیں دس قدم سڑک پار کرکے ہمارے گھر بھی آنا ہوتا تو وہ پورے لباس میں آتے تھے، یعنی شیروانی اور شیروانی ہی کے کپڑے کی ٹوپی، ڈھیلا پے جامہ اور سیاہ یا بادامی پیٹنٹ چمڑے کے پمپ جن پر اسی رنگ کی ریشمی تِتلی ٹکی ہوئی۔

نواب صاحب مِراق کی حد تک صفائی پسند تھے۔ گھر کا تو ذکر ہی کیا، انھیں سامنے سڑک پر بھی بے ترتیبی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ شاید یہی ان کی نامقبولیت کی اصل وجہ تھی۔

ہمارے علاقے کے لیے یہ لباس اور اتنی صفائی پسندی کچھ انوکھی سی بات تھی۔ پھر نواب صاحب، جو محلّے کے سب سے آسودہ حال آدمی تھے، اس وجہ سے بھی مقبول نہ ہو سکے ہوں گے کہ کنجوس تھے۔ ہم بچوں کو تو ان کی کنجوسی سے کوئی زیادہ سروکار نہیں تھا؛ ہاں محلے کی ذیلی گلیوں میں کچھ فاصلے پر جو لوگ رہتے تھے انھیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ نواب صاحب کے گھر کوئی تقریب کیوں نہیں ہوتی۔ ان کے گھر کبھی دیگیں نہیں کھڑکتی تھیں ــــ کوئی اولاد ہی نہیں تھی جو یہ سب پھیلاوا کیا جاتا۔ قریب و دور کے عزیز شاید اس بات پر ناراض بھی رہتے تھے کہ اس قدر مال و متاع کے باوجود نواب صاحب یا ان کی بیگم کوئی بچہ کیوں نہیں گود لے لیتے۔

ہمیں نواب صاحب سے بس اتنی شکایت تھی کہ ایک مدت سے ان کی ریڈیو محفل میں شرکت کر رہے تھے، پھر ہم بچے بھی تھے، کبھی جو ہمارے لیے اندر سے کوئی بسکٹ، ٹافی یا پھل

انھوں نے منگوایا ہو۔ نوکر ایک جہازی قسم کا پیچوان ضرور اٹھا لاتا تھا، یا بلّور کی طشتری میں پندرہ بیس الائچیاں رکھ جاتا تھا۔ پیچوان اور الائچیاں، ہمارے لیے دونوں ہی بے کار تھیں۔ پیچوان تو دادا تک کے لیے بے کار تھا۔

محلے کے لڑکوں، اور گاہے گاہے ذیلی گلیوں میں رہنے والوں نے اپنی ناپسندیدگی اور ملال کے اظہار کا ایک طریقہ یہ نکالا تھا کہ نواب صاحب کی دیوار پر یا ان کے بڑے پھاٹک پر کوئلے، گیرُو یا کالک سے لکیریں کھینچ دیتے، یا آدمی، درخت یا چڑیا کی شکلیں بنا دیتے تھے، جو اس زمانے میں بہت آسانی سے چند ہی لکیروں میں بن جاتی تھیں۔ دیواروں پر کافر وغیرہ لکھنے کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ بھی ضرور لکھا جاتا۔

یہ بدرنگ لکیریں اور شبیہیں جیسے نواب صاحب کے دل پر خراشیں ڈال دیتی تھیں۔ وہ اپنی نیم آستین، تہہ بند اور کھڑاویں پہنے، کوُچی، تَسلا یا رنگ کا ڈبا اٹھائے گھر سے نکلتے، اور لاحول پڑھ پڑھ کر انھیں مِٹانے یا ان پر پلستر کرنے کا جتن کرتے۔ اور لکیریں اور شبیہیں بنانے والے دور ذیلی راستوں اور گلیوں کے موڑ پر کھڑے نواب صاحب کو اور ان کے نوکر کو ہلکان ہو ہو کر لکیریں مٹاتے، سفیدی اور رنگ پھیرتے دیکھتے اور خوش ہوتے۔

بہت سے لوگ نواب صاحب کے خلاف افواہیں اڑا کر بھی دل کا غبار نکالا کرتے تھے۔ ایک مقبول افواہ، جو ہمارے گھر میں بھی گشت کر چکی تھی، یہ تھی کہ ان کی زمینوں، باغوں سے جو اعلیٰ قسم کے آم اور دوسرے پھل آتے ہیں، نواب صاحب وہ اپنے گھر والوں تک کو نہیں کھانے دیتے۔ شیروانی ٹوپی اور پمپ شوز پہن کر خود جاتے ہیں اور ریل کی بِلٹی چھڑا کر براہِ راست ساری پیٹیاں پھل بازار میں نیلام کر آتے ہیں۔

اس افواہ کو اس لیے تقویت پہنچتی تھی کہ نواب صاحب نے کبھی جیتے جی ہمارے گھر بھی چار آم نہیں بھیجے۔ ہاں ان کے انتقال کے بعد لوگ بتاتے ہیں کہ جب تک بیگم زندہ رہیں، موسم کے پھل پیٹیوں کے حساب سے ہمارے ہاں بھیجتی رہیں۔

دادا کے سوا سب کو امید تھی کہ ایسے نامقبول اور بےرابطہ آدمی کی زندگی تو خیر تھی ہی، موت بھی بڑی بھسبھسی ہو گی؛ مجال ہے جو گھر والوں کے سوا کوئی آنکھ نم ہو جائے۔ مگر نواب

صاحب نے تو مر کے سبھی کو حیران اور اکثر کو شرمندہ کر دیا۔

بتاتے ہیں کہ فجر سے پہلے ان کا انتقال ہوا اور کہیں عصر کے بعد جا کے دفن کرنے کی نوبت آئی۔ خدا معلوم کہاں کہاں سے، کیسی کیسی سواریوں پر اور پیدل، کس کس شکل و صورت اور حلیے کے لوگ آنا شروع ہوئے ہیں کہ سڑک کا تو ذکر ہی کیا، تمام ذیلی راستے اور گلیاں میلے کچیلے کپڑے والوں، دُھول بھرے بالوں اور پسینے میں شرابور چہرے والوں سے، اور برہنہ پا لوگوں سے بھر گئیں۔ ان میں کئی مذہبوں مسلکوں کے لوگ تھے اور سب اپنے اپنے طریق پر نواب صاحب کی نجات کی دعا کرنے آئے تھے۔ یہ سبھی پہلی بار اُجالے میں اس بڑی سڑک پر آئے تھے اور دن کی تیز روشنی میں آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے، کیوں کہ سب وہ لوگ تھے جو مکان کے پچھلے دروازے پر رات کے اندھیرے میں آتے تھے اور مہینے میں جب بھی ضرورت پڑتی تھی اپنی پنشن لے جاتے تھے۔

نواب صاحب کی اس چوری چھپے کی کارروائی میں صرف ان کی بیگم اور نوکر ان کے ہم راز تھے۔

آج ان کو گزرے کوئی پینتالیس پچاس برس ہو گئے ہیں۔ جب بھی بھولے بسرے زمانے کے اس بھلے مانس کو یاد کرتا ہوں، ذہن میں تصویر بنتی ہے تو یہی کہ مراق کی حد تک صفائی پسند نواب صاحب، گھسی ہوئی بے داغ نیم آستین، تہہ بند اور کھڑاویں پہنے بہت سے میلے کچیلے، پٹے ہوئے اور محروم لوگوں میں گھرے بیٹھے ہیں اور کنجوسی کے ساتھ مسکراتے ہوئے مٹھیاں بھر بھر کے سکے اور نوٹ اچھال رہے ہیں۔

***

۲

دیوان جی کا پورا نام لوگوں کو یاد نہیں رہتا تھا ___ شرافت، نجابت یا سخاوت علی خاں جیسا کوئی شان دار نام تھا۔ محلّے کے چند ہی لوگوں کو یہ نام یاد رہتا ہوگا، مگر وہ گنتی کے لوگ بھی انھیں دیوان جی کہہ کر پکارتے تھے۔

پولیس کے محکمے سے ریٹائر ہوئے دیوان جی کو اتنا طویل عرصہ گزر چکا تھا کہ لگتا تھا دیوان جی ہمیشہ سے ریٹائرڈ حوالدار ہیں؛ یعنی اس عہدے کا نام ہی ریٹائرڈ حوالداری ہے جس پر دیوان جی بیس تیس برس فائز رہے اور اب اتنے ہی عرصے سے پنشن وصول کر رہے ہیں۔

بہت قریب کے پڑوسیوں کو، یعنی جن سے ان کی بول چال بند نہیں ہوئی تھی، دیوان جی اپنی وردی پہنی ہوئی ایک تصویر بھی دکھایا کرتے تھے۔ حقیقی زندگی کی طرح وردی والی تصویر میں بھی دیوان جی کی ناک پر وہی غصّہ لہریں لیتا نظر آتا تھا جو وردی اترنے کے بعد برسوں سے لوگ دیکھ رہے تھے، اور امید کرتے تھے کہ ساری زندگی دیکھتے رہیں گے۔ جھنجھلاہٹ اور چڑھی ہوئی تیوریوں کے بغیر دیوان جی کو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

دیوان جی چند ہی لوگوں کا لحاظ کرتے تھے۔ لحاظ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ تلخی، چڑچڑاہٹ اور دشنام کے بغیر گنتی ہی کے لوگوں سے بات کرتے تھے۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے تھا جن سے دیوان جی درشت لہجے میں بات نہیں کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی تو کوئی فقرہ مسکرا کر بھی کہہ دیا کرتے تھے؛ ہرچند کہ یہ مسکراہٹ والا فقرہ کسی دوسرے کی شان میں ناملائم ریمارک کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔

دیوان جی بالکل تنہا آدمی تھے۔ بےاولاد تھے، اور اہلیہ انتقال کر چکی تھیں۔ رشتےداروں کو، بہ قولِ خود، وہ منھ نہیں لگاتے تھے۔ گویا نوکری اور بیوی سے فراغت نصیب ہونے کے بعد اب ان کی واحد مصروفیت کریانے کی وہ چھوٹی سی دکان تھی جو عام لوگوں میں دیوان جی کی کیبن کے نام سے مشہور تھی۔ ہماری کالونی کے آدھے میل کے دائرے میں کوئی اَور دکان ہوتی تو دیوان جی کی کیبن کبھی کی بند ہو چکی ہوتی۔ کیوں کہ دور دور تک کوئی اور دکان نہیں تھی اس لیے لوگ

بہ درجہ مجبوری دیوان جی سے سَودا خریدتے تھے۔

دیوان جی کی کیبن کے چلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہر چیز صاف ستھری، خالص بیچتے تھے۔ چیزوں کے مناسب دام مقرر کرنے کے بعد اگر کوئی کم کرنے کو کہتا تھا تو دیوان جی ذاتی طور پر مشتعل ہو جاتے تھے۔ یہ ذاتی اشتعال اس عمومی غصّے سے الگ اور شدید تر ہوتا تھا جس کا سامنا تو ہر ایک کرتا ہی رہتا تھا۔

میرے گھر کی ایک دیوار دیوان شرافت، نجابت، سخاوت علی خاں کی کیبن سے بالکل ملی ہوئی تھی، اور دن اور رات کے ان حصّوں میں جب کیبن کھلی ہوتی، میں اور میرے گھر والے دیوان جی کے غصہ ہونے کی آواز سنتے رہتے تھے۔ کسی نے کم پیسے دیے، کوئی سودا اُدھار مانگ بیٹھا یا خریدے ہوئے سودے کی برائی کر بیٹھا، تو سمجھیے ہلچل مچ جاتی تھی۔ بہت کم گاہک ایسے تھے جنھوں نے برسوں کے پھیلاؤ میں دیوان جی پر گراں فروشی کا الزام لگایا ہو۔ اگر کسی نے مغالطے میں کہہ بھی دیا ہو گا کہ دیوان جی فلاں چیز مہنگی بیچ رہے ہو تو اس نے جلد یا بہ دیر دیوان جی سے معذرت کر لی ہو گی۔

دیوان جی مہنگا بیچنے، کم تولنے یا سودے میں ملاوٹ کرنے کی طرح، معذرت کو بھی ناپسندیدہ عمل سمجھتے تھے۔ کسی نے کبھی انھیں معذرت کرتے نہ دیکھا نہ سنا۔ ان کا مشہور قول تھا کہ میاں ہم وہ کام ہی ناں کرتے جس پر شرمندہ ہونا پڑے۔ مگر مجھے، اور دور دراز کے محلّے میں رہنے والے کم سے کم دو انسانوں کو، معلوم تھا کہ دیوان جی نے زندگی میں ایک بار ضرور معذرت کی ہے۔

برساتوں کے دن تھے۔ ایک رات کوئی گیارہ کے بعد کسی نے دستک دی۔ میں نے جا کر دیکھا کہ دیوان جی چھتری تانے دروازے پر کھڑے ہیں۔ چہرہ بارش کے پانی سے دُھلا ہوا یا پسینے میں شرابور ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے، "ساتھ چلیے۔ ایک تماشا ہو گیا ہے۔"

یااللہ خیر! کوئی بات بہت ہی غیر معمولی ہوئی ہے، ورنہ یہ صاحب اس طرح کسی کو اپنا ساتھ دینے کے لیے نہیں کہتے۔ میں برساتی اوڑھ کر ساتھ ہو لیا۔ سڑک پر کچھ دور چلنے کے بعد بولے، "خفت کی بات ہے۔ میں آپ کو گواہ بنانا چاہتا ہوں، اس مارے لیے چلتا ہوں۔"

میں نے تفصیل نہیں پوچھی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے علم تھا وہ مناسب وقت پر خود بتا

دیں گے۔

تقریباً ایک میل ناہموار میدانوں، اندھیری سڑکوں، گلیوں سے گزارتے ہوئے وہ مجھے ریلوے پھاٹک کے قریب بنے کچے پکے مکانوں کے جمگھٹے کے پاس لے گئے۔ ایک درخت کی ناکافی پناہ میں مجھے ٹھہرنے کو کہا، اور ریلوے ملازمین کے ان مکانوں میں سے کسی مکان میں داخل ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اندھیرے میں کسی کے قہقہہ مار کر ہنسنے اور دیوان جی کے خفا ہونے کی آواز آئی۔ دیوان جی کے ساتھ دو آدمی آ رہے تھے۔ قریب آئے تو دیکھا ان میں ایک بارہ چودہ برس کا لڑکا ہے۔ لڑکا نیند میں تھا اور آدمی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکی آواز میں ہنس رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں دیوان جی اس وقت زیادہ غصے میں نہیں تھے، ورنہ جس انداز میں وہ شخص ہنس رہا تھا اسے دیکھتے ہوئے خدشہ تھا کہ دیوان جی کے ہاتھوں پٹ جائے گا۔

خیر، وہ آدمی ذرا سنبھلا، سنجیدہ ہوا، تو دیوان جی کہنے لگے، "شام کو یہ لڑکا سودا لینے آیا تھا۔ میں نے حساب کر کے پیسے لوٹائے تو ایک روپے کا یہ نوٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کے ڈبوں بوروں کے بیچ گر گیا۔ نہ میں نے دیکھا نہ اس نے۔ یہ بولا آپ نے ایک رُپیا کم دیا ہے دیوان جی۔ میں نے کہا بکواس کرتا ہے بے۔ خیر یہ بھی صَئی تھا، میں بھی صَئی تھا۔ تو بھائی میں نے اس کو چور بنا کے لوٹا دیا۔ ابھی شام کو دکان کا سامان سمیٹنے لگا تو نیچے پڑا ہوا یہ نوٹ مل گیا۔ لے بھئی لڑکے یہ اپنا نوٹ سنبھال۔ تو سمجھے صاحب، لڑکا چور نہیں ہے۔ میں نے ہی جھک ماری تھی۔ آؤ بھائی چلو۔"

لڑکے کا باپ پھر ہنسا۔ کہنے لگا، "کوئی بات نہیں دیوان جی، کوئی بات نہیں۔"

دیوان جی کو جیسے دورہ پڑ گیا۔ پوری طاقت سے دہاڑے، "بات کیسے نہیں ہے بے؟ میں بستر پہ لیٹا تو نیند نہیں آئی۔ گواہی کے لیے ایک بھلے آدمی کو اتنی دور بارش میں پیدل چلا کے لایا ہوں۔ خِفت الگ ہوئی۔۔۔ تُو اپنے اس لڑکے کو سمجھا دے یہ پھر میری دکان پہ ناں آوے۔ نہیں تو ٹانگیں چھانٹ دوں گا، ہاں! پیسے سنبھالنا بھی نہیں آتا باؤلے کو۔"

***

۳

ہم ادب کے طالبِ علم تھے، اور ہیں۔ اُس زمانے میں نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا، اس لیے گھوم پھر کر نظموں میں اور زندگی میں ہم کہانیوں جیسے کردار تلاش کرنے لگتے تھے۔ ہمیں، ہمارے دوستوں کو، مغرب سے آنے والی ادبی تحریکوں میں اور سیّاحوں میں بڑی دل آویزی محسوس ہوتی تھی؛ چناں چہ جب اپنے شہر کی سڑکوں پہ ہم نے پیدل ولندیزی صاحب کو دیکھا تو نہ صرف پوری طرح متوجہ ہو گئے بلکہ سب دوستوں نے چندہ کر کے انھیں کافی ہاؤس میں چاے کی دعوت بھی دے دی۔

پیدل ولندیزی کا اصل نام جان واوڈا تھا۔ پہلی ملاقات میں انھوں نے ہمیں اپنا سونے والا تھیلا یعنی سلیپنگ بیگ پہن اوڑھ کر دکھایا، اپنی زنبیل دیکھنے کو دی اور وعدہ کیا کہ اگلی ملاقات میں وہ ہمیں اپنی انگریزی نظمیں بھی سنائیں گے۔

وہ بڑی چٹک مٹک باتیں کرتے تھے، حالاں کہ اَب جتنی ہماری عمر ہے اِس سے وہ دو برس بڑے تھے، جو ظاہر ہے ہمیں اُس زمانے میں متقدّمین کی عمر لگتی ہو گی۔ ہمیں بہت حیرت ہوتی تھی کہ پیدل ولندیزی پیادہ پا دنیا کا سفر کر رہے ہیں اور گٹھیا، وجعِ مفاصل، عرق النسا اور بعض اعصابی بیماریوں کا تذکرہ کرنے کے بجاے ڈچ لوک گیت اور لطیفے سناتے ہیں اور اچھے، بلکہ کم اچھے لطیفے پر بھی دل کھول کر ہنستے ہیں۔

دوسری بار ہم نے پیدل ولندیزی کو ٹورسٹوں والے ہوٹل میں چار کورس کا باضابطہ ڈنر دیا۔ خود ہم دوستوں نے اپنے لیے مکھن لگے دو دو ٹوسٹ اور بنا کریم کی کافی منگائی۔ ولندیزی کو سمجھا دیا کہ ہم چاروں نے دوپہر کا کھانا دیر سے کھایا ہے، اِس وقت کچھ ہلکا ہی کھائیں گے؛ تم کھانا کھاؤ، ہم بس کافی اور ٹوسٹ لیں گے۔

پیدل ولندیزی ہماری وضاحت پر مسکرا کر چپ ہو گئے ـــــ انھیں ہم طالبِ علموں کی مالی

حیثیت کا اندازہ ہو گا۔ پھر یہ بھی تھا کہ پیدل ولندیزی جان واوڈا جھوٹ بولنے والوں میں خود بھی استاد کا درجہ رکھتے تھے، اتنی رعایت تو ہمیں دیتے ہی۔

اگلی چند ملاقاتوں میں انھوں نے ہمیں اتنی بہت سی فرضی اور حقیقی مہمات کے قصے سنائے کہ ہمارے لیے یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ واقعہ کہاں تک ہے اور تخیل کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ بعض واقعات تو سر تا سر افسانہ معلوم ہوتے تھے؛ مگر یہ سنانے والے کا کمال تھا کہ پلک تک نہیں جھپکنے دیتا تھا۔

ہم سے داد وصول کرنے کی نیت سے، یا اپنے جوشِ بیان میں، کبھی کبھی وہ اپنی جھوٹ اور عیاری کا کوئی اصل واقعہ بھی سنا دیتے۔ ہمارا ساتھ دینے کے لیے وہ منھ پر نیپکن رکھ کر شانے اچکاتے ہوئے دیر تک بے آواز ہنستے رہتے۔ اپنی ایک عیاری کا ذکر وہ بہت شوق سے کرتے تھے کہ کس طرح انڈونیشیا کے شہر جکارتا سے ایک سال جنوری کے مہینے میں وہ اپنے مدّاحوں اور میونسپل نمائندوں سے پھولوں کے ہار پہن کر روانہ ہوئے۔ شہر سے سترہ میل دور ایک نیک دل کسان کے گھر کافی پینے رکے۔ پھر کچھ ایسا ہو گیا کہ اگلے سال جنوری تک پیدل ولندیزی اسی کسان کے ہاں ٹھہرے رہے۔ وہ اس کے ٹرک اور ٹریکٹر کی دیکھ بھال کرتے، اسے اپنی مہمات کے قصے سناتے، اور بدلے میں تین وقت کا کھانا، اور جو بھی کسان کے اور ان کے نصیب میں ہوتا، پاتے رہے۔ دوسرے سال کی جنوری ختم ہونے سے پہلے پیدل ولندیزی نے پھر جکارتا کی طرف منھ کیا۔ سترہ میل پیدل چلتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اور اپنے پچھلے برس کے مدّاحوں سے دوبارہ ہار پھول پہن لیے۔ پھر وہ کئی ماہ تک جکارتا والوں کو اپنے جنوری سے جنوری تک کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سناتے رہے۔

ایک بار وہ ہم سے الوداعی ڈنر لے کر اور خود اپنے بیان کے مطابق ایک بحری جہاز میں لفٹ لے کر آسٹریلیا روانہ ہو گئے۔ آٹھ ماہ وہاں رہنے کے بعد لوٹے تو بہت نڈھال اور کجلائے ہوئے تھے۔ آسٹریلیا کا موسم اس بار انھیں راس نہیں آیا تھا۔ کسی نے اڑا دیا کہ پچھلے چھ ماہ میں کتنی ہی بار ہم نے اپنی آنکھوں سے پیدل ولندیزی جان واوڈا کو اِدھر اپنے ابراہیم حیدری ولیج میں مچھیروں کے ساتھ بیٹھے دیکھا ہے۔

ہم پھر چندہ کر کے پیدل ولندیزی صاحب کو استقبالیہ ڈنر دے رہے تھے۔ کسی نے ابراہیم حیدری والی بات دُہرانا چاہی۔ ہم لوگوں نے پہلے ہی جملے پر اسے روک دیا۔ ہمیں رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیوں کی، اور پیدل ولندیزی کو مناسب قوت بخش غذا کی ضرورت تھی۔ یقین کیجیے، اس پورے انتظام میں عینی شاہدوں اور حلف اٹھوانے والوں کی کہیں کھپت نہیں تھی۔

پیدل ولندیزی صاحب تو ہمارے گروپ کے میر باقر علی داستان گو تھے۔ ان میں اور خلد آشیانی میر باقر میں محض اسلوب کا فرق تھا، یعنی یہ کہ ولندیزی صاحب ہر کہانی کے ہیرو یا تو خود ہوتے تھے یا ہیرو کے دائیں ہاتھ پر ایک سونٹی لیے بہ ذاتِ خود کھڑے ہوتے تھے اور اسے مناسب مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ خدا معلوم جان واوڈا صاحب اب کہاں ہیں۔ اگر زندہ ہوں گے تو شاید بوڑھے ہوگئے ہوں گے، اور ہو سکتا ہے نہ بھی ہوے ہوں۔

طوفان کے مرکز میں

میں اور میرے ہم عصر، ہم ایک طوفان کے مرکز میں ہیں۔ اندر سے یہ دائرہ بالکل شانت دکھائی دیتا ہے۔ سب کچھ جما جمایا اور unruffled ہے یہاں۔

ہاں طوفان کا outer perimeter ایک پیس دینے والے فشار میں سنسناتا، گھمن گھیری کھاتا رہتا ہے۔ وہاں ہم رہتے ہیں، outer perimeter میں۔ مگر میں 'رہنے' کی بات نہیں کرتا ــــ وہ الگ کہانی ہے۔

میں طوفان کے مرکز، اس شانت دائرے، میں گزارے ہوئے وقت کو بیان کر رہا ہوں، جہاں ہم 'رہتے' نہیں تھے، جایا کرتے تھے۔

***

طوفان کا مرکز صدر کا زیرِزمیں راستے والا چوک ہوتا تھا (زیرِزمیں راستا ابھی نہیں بنا تھا)۔ یہیں کارنر پر ــــ جہاں اب گھڑیوں کی، فوٹوگرافی کی، بہت سی دیگر دکانیں ہیں ــــ تیس بتیس سیڑھیاں چڑھ کے ماؤنٹ اولمپس واقع تھا ــــ انڈیا کافی ہاؤس ــــ جو خداوند زیوس کی سیٹ تھی، جہاں دوسرے تمام دیوتاؤں کا جماو ہوتا تھا۔

اُس وقت تک طے نہیں ہوا تھا کہ خداوند زیوس کون ہے؛ دوسرے سبھی دیوتا طے شدہ تھے۔ یہ ہر روز اکٹھا ہوتے، لمحہ لمحہ ایک نئی دنیا تخلیق کرتے اور، کمال ربوبیت سے، جاری دنیاؤں کی پرورش فرماتے۔

یہاں muses کھُلے، چھُوٹے پھرتے تھے، خاص طور پر شاعری اور مصوّری کے میوز۔

ایک بار لاہور سے سُرخ چگی ڈاڑھی والا ظہیر کاشمیری بتّیس سیڑھیاں چڑھ کے یہاں پہنچا تو سیڑھیوں پر سے پکارتا گھُسا کہ "روحانی بچّو! میں آ گیا ہوں۔ میرا احترام کرو، میں ظہیر کاشمیری ہوں۔"

اُس کی بَری آنکھیں، سُرخ چگی ڈاڑھی اور سُرخ گھونگھریالے لمبے بال اور اُس کی aquiline ناک، اُس کا مَہنتوں کی طرح دوسروں کو "روحانی بچّو" کہنا، اُس کی لاف زنی، سبھی پسند آئیں۔ ویسے بھی نیوی بلیو قمیص، چو کلیٹی دھاری دار سوٹ اور سفید زرم ٹائی میں وہ مرّیخ کا باشندہ دکھائی دیتا تھا، جو بہت معقول بات تھی۔

سب نے اثبات میں سر ہلائے اور اتفاقِ رائے سے اُسے (ظہیر کاشمیری کو) جبلِ اولمپس پر عارضی، اعزازی زیوس مقرر کر دیا۔ تاہم اُسے جتا دیا کہ دیوتاؤں کو تمھاری کلرا سکیم پسند آئی ہے، اس لیے تمھیں عارضی، اعزازی خداوندِ اولمپس مقرر کیا جارہا ہے۔ ظہیر کاشمیری خوش ہوا! اس نے یہ مسند قبول کی، دوسروں کی نظمیں سنیں، اپنی نظمیں سنائیں۔ بہت اچھے تین گھنٹے گزارے۔ اُٹھنے سے پہلے سب دیوتاؤں نے اُسے properly معزول کیا۔

دو تین روز بعد وہ خوش خوش لاہور چلا گیا۔

***

انڈیا کافی ہاؤس (جبلِ اولمپس) کی بلندی سے نیچے فانی انسانوں کی دنیا پر نظر ڈالو تو سامنے Thomas & Thomas والا فٹ پاتھ شروع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ٹامس والے فٹ پاتھ پر چلو تو جہاں اَب الیکٹرونکس کا جنگل ہے اور کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، وہیں کہیں بائیں ہاتھ پر فریڈرِکس کیفے ٹیریا اور کیفے جارج آ جاتے تھے۔

کیفے جارج اور فریڈرِکس کیفے ٹیریا کو بالترتیب "جارج" اور "کیفے ٹیریا" کہا جاتا تھا۔ کیفے ٹیریا کا درجہ وہ تھا جو سیزروں کے روم میں "فورَم" (Forum) کا ہو گا۔ سب کچھ جو قابلِ ذکر تھا،

"شہریوں" کو یہیں عطا کیا جاتا تھا۔ سڑکوں پر اُتنے ہی کم آدمی ہوتے تھے جتنے چار ایکٹ کی کسی تمثیل میں سما سکیں۔ فٹ پاتھ پر اس سے بھی کم آدمی ہوتے ہوں گے؛ کیوں کہ جو ہوتے تھے وہ کچھ دیر بعد وقار کے ساتھ اپنی کتابیں اور تمباکو کے ٹِن اور پائپ سنبھالے کیفے ٹیریا کے صحن میں چلے جاتے تھے۔ زیادہ دیر تک باہر نظر آنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

لوگ آہستہ چلتے تھے، اور جو کوئی دوڑا ہوا آتا تھا تو اس کی کوئی پُرشکوہ، کلاسیکل، بلکہ ببلیکل (Biblical) وجہ ہوتی تھی۔ یعنی:

> ایسا ہوا کہ بستی کی سمت سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اُس نے پکار کر کہا کہ سنو، اُن بھیجے ہوؤں پر توجہ کرو جو تم سے کبھی کچھ طلب نہیں کریں گے۔ سنو کہ فلاں ابنِ فلاں کیفے ٹیریا میں وارد ہوا ہے اور وہ اپنی نظم سناتا ہے۔ وغیرہ۔

***

بسوں کے شاہ جی ٹائم کیپر لوگ کیفے ٹیریا کی کرسیوں پر اکڑوں بیٹھنے کے لیے ابھی آنا شروع نہیں ہوئے تھے؛ اُن کے آنے میں ایک دو برس، ایک دو گندھارے، باقی تھے۔ اس لیے ابھی یہ لوئر مڈل کلاس اور لوئر لوئر مڈل کلاس کے پڑھے لکھے snob لڑکوں کی دنیا تھی، اور وہ کسی قیمت پر اپنی بائی برو مفلسی (بےزری) کو تیزی سے کمائی (یا ہتھیائی) ہوئی دولت سے متصادم ہوتے دیکھنے پر تیار نہیں تھے۔

ہم سب یہاں، طوفان کے مرکز میں، موجود ہیں جہاں شانتی اور unruffled peace ہے۔ ابھی یہیں ہیں ہم، ٹامس اینڈ ٹامس کے فٹ پاتھ سے گئے نہیں۔

***

یہیں کہیں ایک پرانی (وکٹورین) ٹیلر شاپ تھی جس کا مالک فلم "پکار" کے ہیرو (پرنس آف منروا) اداکار صادق علی کا فین تھا۔ اُس نے ڈھائی فٹ بائی دو فٹ کے گولڈ فریم میں جو کلیٹی رنگ میں انلارج کی ہوئی اداکار صادق علی کی ایک huge تصویر لگا رکھی تھی جس میں وہ فیلٹ ہیٹ پہنے جھک کر سامنے دیکھتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

ٹھیک اُس وقت جب کوئی یہ تصویر دیکھ رہا ہوتا، جیتے جاگتے صادق علی (خود پرنس آف منروا مووی ٹون) ٹیلر شاپ سے پچاس گز دور کے پی ٹل والی گلی کے نکڑ پر، پان کی دکان کے برابر، ایک اونچے اسٹول پر بیٹھے اپنے سابق پرستاروں سے دو دو، پانچ پانچ، دس دس روپے نذرانہ لے لے کر کوٹ کی جیب میں رکھتے جاتے تھے۔ عام طور پر اُن کا شیو بڑھا ہوتا تھا اور فالج سے نڈھال ایک ہاتھ دوسری جیب میں پڑا رہتا تھا۔

نذرانہ دینے کا طریقہ یہ تھا کہ آنے والا صادق علی کو سلام کرتا اور ہاتھ ملانے کے بہانے مٹھی میں دبایا ہوا نوٹ اُن کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا۔

ہمارے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ پانچ پانچ دس دس کے نوٹ آتے رہتے تھے مگر کبھی ہمت نہیں پڑی کہ صادق علی کو سلام کر کے ہاتھ ملاتے اور ایک نوٹ اُن کے ہاتھ میں چھوڑ کر ہٹ جاتے ــــ شاید ہمارے حساب سے "پکار" کے ہیرو کو اس طرح نوٹ پکڑا دینا (تقریباً) sacrilegious تھا۔

***

ہم طوفان کے مرکز میں ہیں۔

صدر کے زیرزمیں راستے سے سنگر والوں کے موجودہ شوروم کی طرف چلو تو جھلمل کرتی، اُبلی پڑتی دکانوں کے بیچ کہیں پھنسی ہوئی ایک مسکین سی بیکری نظر آتی ہے ــــ پاریسیاں بیکری۔ یہ بیکری کبھی کیفے پاریسیاں کا حصّہ ہوتی تھی۔ اِس وقت اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ پہلے (ایک متواضع اور کریم النفس) کوہ ندا کی طرح یہ آپ کو خود پکار لیتی تھی۔ پاریسیاں بیکری اور کیفے پاریسیاں کو

ایک فوری طور پر مہیا analogy سے سمجھا جا سکتا ہے:

آج کی پاریسیاں بیکری اسٹول پر بیٹھے ڈھیلے ڈھالے کوٹ والے صادق علی کی طرح ہے۔

اور جو پاریسیاں بیکری مجھے، میرے ہم عصروں کو یاد ہے وہ جُوہو کی ریت پر (دو گھنٹے کے لیے! Omygod پانچ ہزار میں خریدی گئی!) فینسی بگھی چلاتے، جگمگاتے، پرنس آف منروا صادق علی جیسی تھی۔

O Mighty Caesar! Dost thou lie so low?
Are all thy conquests, glories, (etcetera etcetera)
Shrunk to this little (etcetera etcetera)?

پاریسیاں بیکری اس شہر کی (correction: اس دنیا کی) بہترین پےٹیز بہت مناسب داموں پر فراہم کرتی تھی۔ اور یوں بھی تھا کہ اگر آپ اپنی جاننےوالی لڑکی کے ساتھ پاریسیاں میں داخل ہوئے ہیں اور آپ کے لیے کوئی فیملی کیبن خالی نہیں ہے تو یہ فوری طور پر اُن دو خوش مزاج ایرانی بھائیوں کا ذاتی مسئلہ بن جاتا تھا جو پاریسیاں کے مالک تھے اور ہر گاہک کو عادتاً مسکرا کے وِش کیا کرتے تھے۔

***

ہم طوفان کے مرکز سے باہر نہیں آئے۔

موجودہ سِنگر شوروم کے سامنے ایلفنسٹن اسٹریٹ ہی پر کتاب محل تھا... کل تک تھا۔ آغا سرخوش قزلباش اور اُن کے شاپ اسسٹنٹ ہر promising شاعر ادیب مصوّر کو پہچانتے تھے اور بڑھ کر مصافحہ کرتے، احوال پوچھتے تھے۔ کتابیں دکھاتے، ان پر باتیں کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ promising ادیب شاعر مصوّر اردو کتاب خریدنے کی تو بالکل استطاعت نہیں رکھتے، مگر وہ یہ سب کچھ کرتے تھے کیوں کہ وہ خود بھی اور ہم بھی اُس وقت آغا شاعر کے اسٹیبلشمنٹ میں ہوتے تھے ـــ ساٹھ ستر برس پیچھے کے کسی ٹائم زون میں۔

***

زیرزمین راستے والے ٹریفک سگنل اور سِنگر والے چوک کے بیچ (پاریسیاں بیکری کے سامنے) ایک پروٹسٹینٹ چرچ ہے۔ چرچ کا فٹ پاتھ طوطا فال والوں اور وزن کی مشین والوں کے سوا ہمیشہ سے خالی رہتا ہے۔ ایک وقت اس فٹ پاتھ پر ایسا آیا تھا کہ یہاں درجنوں makeshift بک اسٹال قائم ہو گئے تھے۔

دراصل صدر کو آرِیٹو مارکیٹ بن رہی تھی تو وہاں کی دکانیں اور اسٹال وقتی طور پر یہاں آ گئے تھے جو بڑی یکسوئی سے چرچ والے فٹ پاتھ پر L-shape بناتے آگے اَمیریکانو والی سڑک پر چلے گئے تھے۔ کچھ دن دھیرج میں گزار کے ان بک اسٹالوں کی یونین کے عہدے داروں نے چرچ کے کرتادھرتا فادر لوگوں کو تجویز پیش کی کہ حضرات! اگر فٹ پاتھ کے ساتھ لگی چرچ کی زمین سے ایک دو قاشیں لے کر چند درجن فینسی بک شاپس بنوا دی جائیں تو ہزاروں ہزار روپے (اُس وقت بڑی رقم ہوتی تھی) چرچ کو ہر ماہ مل جایا کریں گے۔ منصوبہ یہ ہے کہ بدہیئت کیبنیں ہٹا کر ایک جیسی دکانیں تعمیر کی جائیں گی (نقشہ آپ حضرات پسند فرمائیے گا،) تو ایک جیسی جدید دکانوں سے شہر کا چہرہ improve ہو گا، پھر مطالعے کے عمل میں، کہ خیرِ کثیر ہے، چرچ کا تعاون خداوند کی خوشنودی کا باعث بھی ہو گا (N.B.: خداوند شاہد ہے کہ ان makeshift اسٹالوں پر چیپ فکشن اور 'صالح' عالمی ادب کے ساتھ ساتھ خیر سے پور نوگرافی بھی مہیا رہتی تھی۔)

چرچ والے فادروں نے کہا، آپ کا فرمانا بجا ہے۔ ہم اِس اتوار کو چرچ کمیٹی (جیسی کہ اپنی مسجد کمیٹی ہوتی ہو گی) سے مشورہ کریں گے اور پیر کو جواب دیں گے۔ پیر کو یونین کے عہدے دار گئے۔ فادروں نے کہا، پیارے ہمسایو! ہم چرچ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کونگریگیشن میں طشتری گھماتے ہیں؛ مسیحی نمازی حسبِ توفیق چرچ کے لیے طشتری میں کچھ ڈال دیتے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے چرچ کو خود کفیل بنا دیا تو اس ضمن میں اجماعِ فادراں ہے کہ ہمارے مسیحی نمازی (آخر کو بندہ بشر ہیں) رفتہ رفتہ چرچ کی کفالت میں تساہُل برتنے لگیں گے۔ کتنے ہی نمازی، جو اس معصوم خوش فہمی میں اتوار کے اتوار چلے آتے ہیں کہ اُن کی آمد سے چرچ کی امداد

ہو جاتی ہے، آنا چھوڑ دیں گے۔ آپ کی تجویز سے پیسے تو بہت مہیا ہو جائیں گے تاہم نمازی کم ہوتے جائیں گے جو نہ ہمیں خوش آئے گا نہ خداوند کو۔ اس لیے عزیزو! ہم دکانیں نہیں نکالیں گے، طشتری گھما کے گزارہ کریں گے۔ وما علینا الا البلاغ۔

***

کوآپریٹو مارکیٹ بنانے کے لیے پلاٹ سے کتابوں کی کیبنیں ہٹائی گئیں تو مہینوں تک یہ حصّہ دیہات کے شاملات کی طرح ہر ایک کے کام آتا رہا۔ موالیوں چرسیوں سے لے کر سانڈے کا تیل بیچنے والوں، "بچہ جمورا آئے گا؟ آ گیا!" کا کھیل دکھانے والوں اور بغیر تکلیف کے محض ایک رومال سے دانت نکالنے والوں تک کا جماوڑ رہنے لگا۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے۔

ایک بار ہم نے ایک متدیّن شکل و صورت کے صحت مند آدمی کو دیکھا جو بار بار جتا رہا تھا کہ وہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہے اور ابھی کینٹ اسٹیشن پر اُتر کے سیدھا چلا آ رہا ہے۔ وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ اُس کا کوئی مِشن ہے جس کی تکمیل کے لیے اس نے یہ پُرصعوبت سفر اختیار کیا ہے۔

اُس نے بڑی روانی سے ایک تقریر شروع کی جس میں علمائے سُو سے ملّت کو خبردار کیا گیا تھا اور جو تباہیاں وہ اس خاص شعبے میں لائے ہیں اُن کا بڑا گرافک بیان تھا۔ اس کا استدلال اچھا خاصا رہا ہو گا جبھی تو ہم اس خبردار کرنے والے ایلچی یاہ پوستین پوش کی چمک اور گھن گرج سے بندھے کھڑے رہے۔ Ancient Mariner کے قابو میں آئے شادی کے مہمان کی طرح ہم اُس کی وائیلڈ بلکہ قطعی مجنونانہ آنکھ کے حصار میں رُکے کھڑے تھے کہ اچانک کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ علمائے سُو کی حرَمزدگیاں گناتے گناتے اُس نے قدموں میں پڑے اپنے تھیلے سے ایک مرتبان نکالا اور (اُس متدیّن شکل و صورت والے نے) امساک کی چمک دار گولیاں بیچنی شروع کر دیں۔

اس واقعے کے بعد مہینوں تک ہم طوفان کے مرکز سے دور رہے، بیرونی محیط میں اپنا کچھ پڑھنا لکھنا، روٹی کمانا کرتے رہے۔

شاید ہمیں جلد shock لینے والے میٹھے برس لگے تھے۔

***

تقریباً اُسی زمانے میں مجوّزہ کوآپریٹو مارکیٹ کے وسط میں اچانک ایماں کی حرارت والوں نے زمین پر قبضہ کر کے شب بھر میں ایک مسجد بنا دی تھی۔

کئی سمتوں سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر اور دوسرے اہم نعرے لگائے گئے۔ اخباروں میں بڑی لے دے بھی ہوتی رہی۔ قرونِ اولیٰ کی مسجدوں کے حوالے quote کیے گئے؛ لکھا گیا کہ مسجد کی زمین کے لیے شرطِ اول اس کا مالک سے خریدا جانا ہے۔ جواب میں لکھا گیا کہ آخر فلسفۂ ہنگامی ضرورت بھی تو کوئی چیز ہے۔ کوآپریٹو مارکیٹ بنانے والوں نے گڑگڑا کر کہا کہ للہ! ہمیں مارکیٹ بنانے دو؛ ہم اندر ایک مسجد بنا کر نذر کر دیں گے۔

۱۹۵۸ یا ۱۹۵۹ کا سال تھا۔ ایوب حکومت نے (جو نہ معلوم کیا تھی، مگر کسی نظریاتی کُمک کا سہارا لیے بغیر تھی اور کہیں کہیں ڈاؤن ٹو آرتھ ہو سکتی تھی،) کچھ پکڑ دھکڑ بھی کی۔ اس سر تا سر ٹرانسپیرنٹ کارروائی میں صدر کے ایک مشہور کیفے کا سرسیّدی حلیے کا (تاہم ملّاں ٹائپ) مالک پیش پیش تھا۔ اُس نے حکومت کے مسجد دشمن (یا شاید اسلام دشمن) رویّے کے خلاف جہاد کی تلقین بھی کی تھی اور کچھ دن کے لیے وہ بند بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر شاید کہیں کوئی مصالحت ہو گئی۔ اُسی سال، یا شاید بہت برسوں بعد، (what difference does it make?) سرسیّدی حلیے کا وہ ملّاں ٹائپ خوش خوش راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ مسجد وہیں ہے اور سنا ہے آباد ہے۔

***

موجودہ صدر پوسٹ آفس سے (جو آج کے زیرِزمین راستے کے دہانے پر واقع ہے،) پیراڈائز چوک تک کئی درجن (اگر یہ مبالغہ ہے تو سمجھیے ایک درجن) بک اسٹال تھے جن پر زیادہ تر گوانی ــــ ڈمی سوزے، ڈی کاسٹے ــــ سیلزمین یا مالک ہوتے تھے۔ آدھی آستینوں والی قمیصیں (جن کی آستینوں کو اور بھی دو بار فولڈ کر کے اور بائی سپس، فور سپس دکھا دکھا کے پہنا جاتا تھا)، کرُو کٹ بال، اونچی پتلونیں (جن کے پائنچوں اور کریپ کے سول والے جوتوں کے بیچ سے شوخ رنگوں والے سَوکس کے چیک ڈزائن لشکارے مارتے تھے) اور کوئی کوئی ڈینم کا فیلٹ ہیٹ بھی پہنے ہوتا تھا ــــ اصل نسل، برانڈ نیو، امپورٹ کیا ہوا ڈینم پورے دس روپے کا ملتا تھا، یا پندرہ کا۔

شام ہوتے ہی یہ ڈمی سوزے، ڈی کاسٹے بہت مستعدی سے اسٹالوں پر آ کھڑے ہوتے۔ یہ رہ گیروں کو کبھی "ہیلو" کہتے کبھی مسکرا کر "ہاوڈی" کرتے۔ کوئی دوسرے شہر سے آتا ہو گا تو سمجھتا ہو گا کہ یہ گھر سے کتابیں بیچنے نہیں Howdy Man! کہنے اور مسکرانے کے لیے آتے ہیں۔

اور کتابیں؟ ــــ O my god! پیلی کن، پینگوئن وغیرہ کی کوئی بھی اوسط درجے کی کتاب، پرنٹنگ انک کی مسحور کرنے والی سُگندھ کے ساتھ اور ٹائیٹل پر (WOW!) پیپر بیک بائنڈنگ مشین کی داب سے پڑی کسی جادو بھری ہلکی سِلوٹ کے ساتھ، almost aphrodisiac، پانچ سات روپے میں مل سکتی تھی۔

یہ اسٹال والے اپنے مستقل گاہکوں کو پہچانتے تھے (جیسے گاؤں قصبے کے دکان دار پہچانتے ہیں) اور یہ راہ چلتے ٹوکتے بھی تھے، "ہے ــــ ینگ مین! ہومر کی 'اوڈیسی' گرم کیک کے مافک سَیل ہو رہی ہے۔ ٹیک کیئر مَین! ففٹین بکس بارگین پرائس ہے ــــ ابھی بھی مِس کیا تو you know فیر نہیں ملیں گا۔ کم آن، ٹیک وَن!"

ہم مسکرا کے ڈمی سوزے، ڈی کاسٹے کی صورت دیکھنے لگتے۔

وہ سمجھ جاتا۔ مسکرا کے وِنک کرتا۔ "او کے، باوَچ؟ ابھی کِٹلا پَیں سا ہے؟ وہ میرے کو دیو، کتاب اٹھاؤ اینڈ رَن۔ Run for your life! ہہ ہہ ہا ہا! بیلینس نیکسٹ ٹائم دینا۔ Bye۔"

گریز: اور اَب کھوڑی گارڈن کا بازارِ ردّی فروشاں- یہ فی الاصل کتاب دوستوں کا کنزِ مخفی تھا- یہاں سے ایک بار ہمیں Complete Works of Shakespeare تول سے ساڑھے چودہ آنے میں ملی تھی- ڈھائی روپے دے کر ہم نے اُس کی جلد بنوائی اور گولڈلیٹرز سے اُس پر اپنے ممدوح کا نام چھپوایا- تاہم ساڑھے چودہ آنے ادا کر دینے کے بعد اُس دن ہمیں (بوجوہ) بازارِ ردّی فروشاں سے پی آئی بی کالونی تک کا راستا پیدل طے کرنا پڑا-

***

ہم پھر لوٹتے ہیں- اور ہم کے پی ٹل والی گلی سے زیادہ دور نہیں جائیں گے-

یہ سنیما ـــ کے پی ٹل ـــ کسی شیکسپیئر پسند (یا طالبِ علم دوست) ستار ایدھی کی ملکیت میں ہو گا- یقیناً ایسا ہی ہو گا کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیوں وہ ہم (اُس وقت کے انٹر، بی اے کے طالب علموں) کو اتنے مزے کراتا-

دونوں ڈرامے The Twelfth Night اور Julius Caesar بالترتیب انٹر اور بی اے کے لازمی انگریزی کے کورسوں میں شامل تھے؛ تو امتحانوں کے قریب آتے آتے کے پی ٹل میں دونوں فلمیں میٹنی شو میں دکھائی جاتی تھیں- دونوں بلیک اینڈ وائٹ تھیں، جب کہ "جولیئس سیزر" ـــ جیمز میسَن، مارلن برانڈو والی ـــ تو کلاسکس میں گنی جاتی ہے-

ایک روپے میں "چاہے کہیں بھی بیٹھو" کے اصول پر دس پندرہ دن تک یہ فلمیں یہیں رہتی تھیں- مشہور تھا کہ چار شو دیکھ لے تو بیس میں سے بارہ نمبر تو بونگے سے بونگا اسٹوڈنٹ بھی پیٹ لے گا-

جب تک شیکسپیئر چلتا پورا ہال ـــ پہلی صف سے آخری صف تک ـــ بھرا رہتا- فرصت پائے ہوئے کچھ گوانی، کچھ پارسی مرد عورتیں، اور باقی بانوے ترانوے فی صد طالبِ علم

— لڑکے لڑکیاں — وِنگز میں بھی کھڑے ہوئے، بالکنی کی دیوار پر بھی ٹکے ہوئے، لڑکے لڑکیاں ملے جلے، behave کرتے ہوئے، ایک استاذالاساتذہ کی مجلس میں سمجھو دوزانو بیٹھے — یہ کسی دوسرے منطقے، دوسری صدی کی بات لگتی ہے — مگر سب جانتے ہیں کہ سب کچھ ایسا ہی تھا۔

گمبھیر کاسیئس اپنی جھُلسن میں ایک اُداس بُروٹس کو سیزر کے خلاف بھڑکا رہا ہے:

لڑکے لڑکیاں سخت غصے میں کاسیئس کے ساتھ ساتھ بلکہ آگے، کئی جگہ اُس سے آگے آگے کھنچے جاتے ہیں (سیزر اُس وقت سخت نامقبول آدمی ہے)؛ اسّی نوے آوازیں ایک ساتھ اپنا venom صَرف کر رہی ہیں:

Why, Man, He doth bestride the narrow world
Like a Colossus, and we petty men
Walk under His huge legs, and peep about
To find ourselves dishonourable graves.

رات کا آخری پہر ہے۔ بروٹس اپنی حویلی کے چمن میں ٹہل رہا ہے۔ سناٹے میں دور کہیں کسی بےچین پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ بروٹس (جیمز میسن — فلسفیوں جیسا دھیما، اُداس آدمی) اپنے کلپرڈ لہجے میں خادم کو پکارتا ہے:

What Lucius, Ho!

اور کہتا ہے: "ستاروں کو دیکھ کر تو نہیں کہہ سکتا، دن ہونے میں کتنی دیر ہے..." پھر حسرت سے: "لوسیئس جیسی نیندیں کاش! مجھے مل سکتیں۔"

یہ سب باتیں وہ جاتی ہوئی رات کے احترام میں سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے۔ سینکڑوں چلبلے نوجوانوں سے بھرے ہال میں سناٹا ہے۔ وہ اپنے خادم لوسیئس کو پھر آواز دیتا ہے۔ اسکرین پر لوسیئس نظر آتا ہے مگر اُس (اداکار) کے بولنے سے پہلے، برابر کی تیسری چوتھی سیٹ سے پی آئی بی کالونی، ناظم آباد کی چمک لیے ہوئے ایک جونیئر آواز بہت احترام سے پوچھتی ہے:

Call'd you, my Lord?

لڑکے لڑکیوں کی بےساختہ کھلکھلاہٹ سے کے پی ٹل جیسے چھلک پڑتا ہے۔

کوئی تک وَرم جھنجھلاہٹ میں حکم دیتا ہے: !Silence اور پورا بال پھر دَم سادھ لیتا ہے۔ فلم چلتی رہتی ہے۔ فلم چل رہی ہے...

میاری! کہاں گئے وہ لوگ؟

***

کے پی ٹل والی گلی کتابیں پڑھنے، کتابیں سوچنے، کتابیں لکھنے والوں کی گلی تھی۔ یہ عزیز حامد مدنی صاحب کی گلی تھی۔ یہ سفید شیروانی اور سُرخ مخملی ٹوپی والے بلگرامی صاحب کی گلی تھی جنھوں نے مدنی صاحب کی طرح کتابیں نہیں لکھیں اور جن کے بارے میں مَیں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ سنا ہے محمد حسن عسکری کے بعد انگریزی کے جید استادوں میں اُس وقت اُنھی کا نام لیا جاسکتا تھا۔

اور یہ گلی بُجھے ہوے، فالج زدہ پرنس صادق علی کی گلی تھی۔

اس کوچے میں "کیفے گلوریا" بھی تھا جہاں مناسب پیسوں میں نئے گندم کی مہک والے نرم، دبیز سلائسوں پر لائل پور کا بہت سا خالص مکھن لگا کر گاہکوں کے حوالے کیا جاتا تھا، جہاں سکھاشاہی کپوں میں اُسی وقت دَم کی ہوئی چاے ملتی تھی جس کی مہک پچاس قدم دور سے بےچین کر دیتی تھی۔

کے پی ٹل والی گلی کے ایک یا دوسرے سِرے پر کامریڈ ڈانگے کی شکل کے، ذہین چہرے اور درمیانہ قد کاٹھ کے ایک صاحب کھڑے نظر آتے تھے۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ ذہن پرست (؟) ہیں اور میرامَن کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اوپر کافی ہاؤس میں بھی وہ ایک طرف بیٹھے نوٹس لیتے دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے پندرہ برس اُنھیں اسی طرح دیکھا۔ نہ معلوم کس نے اُڑا دیا تھا کہ وہ میرامَن کا ترجمہ کر رہے ہیں؛ آج تک تو کوئی ترجمہ سامنے نہیں آیا۔ برسوں ہم کامریڈ ڈانگے کے اُن ہم شکل کو ڈھونڈتے رہے؛ نہ وہ نظر آئے نہ میرامَن۔

کے پی ٹل والی گلی اَب کہیں نہیں ہے۔ اُس کی جگہ آواز اور حرکت کی ایک furious tunnel ہے جس میں بے حیثیت فضول چیزیں بیچنے اور خریدنے والوں کے ہجوم کسی نیند کے عالم میں بلتے اور آپس میں چخ چخ کرتے رہتے ہیں۔

***

اب یاد آتا ہے کہ ہم جب تک طوفان کے مرکز میں رہتے، بے غم رہتے تھے۔ بھوک، ضرورتیں، تنہائی، ناکامیاں، فرسٹریشن، حکمرانوں کی دھاندلیاں ـــــ سب طرح کا کذب و دغل اس دائرے کے باہر سنسناتا ہوا گھمّن گھیریاں کھاتا رہتا تھا۔ بیرونی محیط ایک پیس دینے والے فشار میں تھا جس میں سروائیو کرنے کے لیے ہم سب، اولمپس کے سبھی دیوتے، اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ جتن کر رہے تھے۔ باہر عافیت نہیں تھی؛ کبھی نہیں رہی ـــــ یہ ہم سے زیادہ کون جانتا ہو گا! تاہم دوسرے باہمت لوگوں کی طرح ہم نے سروائیو کیا ـــــ یا نہیں کیا۔ اب یاد آ رہا ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ جاں بر نہ ہو سکے۔

قمر زیدی نام کا ایک لڑکا تھا۔ شعبۂ انگریزی میں میرے ساتھ داخل ہوا تھا۔ "تِھنک" (think) کو ہمارے اتر گئے ساتھیوں کی طرح nasal تلفظ میں "فِنک" کی طرح ادا کرتا تھا جو شعبۂ انگریزی کے ایک سال پُرانوں کا مینرزم ہوتا تھا (یا اَب بھی ہے؛ پتا نہیں)۔ وہ پرانے، پھر نئے کیمپس میں باربار کی دُھلی ہوئی اپنی نائیلون کی قمیصوں، زین کی پتلونوں میں ملبوس قہقہے مارتا آتا جاتا رہا۔ وہ میرے ہی محکمے میں کلرکی کرتا اور کسی انقلاب کے خواب دیکھتا تھا کہ حکمرانوں کی جھپیٹ میں آ گیا۔ شاید اُس نے کوئی پوسٹر لکھا تھا۔

(کامریڈ؟) قمر زیدی کو (عمر بیس سال یا اُس سے کم) کسی سمری کورٹ نے اتنے اتنے ماہ کی سزا سنائی ہو گی یا کوڑے لگوائے ہوں گے؛ یا ابھی سزا سنانے، کوڑے لگوانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، پوچھ گچھ کے مرحلے ہی میں تھا کہ اس کے باپ کی موت واقع ہو گئی اور حکّام نے اُسے جنازے میں شریک ہونے کے لیے خصوصی اجازت نامہ دے کر گھر بھیج دیا۔ یا شاید اُسے اس لیے

چھوڑ دیا کہ پوچھ گچھ میں کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی اور، آج کے برخلاف، اُس وقت قید و بند میں کسی کا واصل بہ حق ہونا حکمرانوں کے لیے بدشگونی سمجھا جاتا تھا۔ (Human rights violation and all the relevant shit.) تو وہ خصوصی اجازت پر (انسانی ہم دردی اور ترحم کی بنیاد پر؟) گھر آیا ہوا تھا جو اُس نے خون کی قے کی اور مر گیا۔ شاید دوسرے دن، یا اُسی دن باپ کی تدفین کے بعد، اُسے بھی گاڑ داب دیا گیا۔ دوسرے کامریڈوں نے قمر زیدی کی قبر پر بھی "ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ" والے مشہور شعر کی تختی لگا دی۔

میں ایک بار مجروح سلطان پوری کی فرمائش پر کیمرا لے کے اُس کی قبر ڈھونڈتا ہوا میوہ شاہ گیا بھی تھا ــــ وہ جگہ ہی نہ مل سکی۔

وہ جگہ ملتی بھی کیسے۔ وہ طوفان کے مرکز کے باہر تھی، براہِ راست تمام سَنسَناہٹوں کی زد میں تھی۔

***

طوفان کے مرکز کے باہر جو بہت سی casualties ہوئیں اُن میں سے ایک میرے لیے (یہ یقیناً ایک پِٹا ہوا استعارہ ہے) نسے گھاو کی طرح آج بھی رِس رہی ہے۔

یہ کراچی یونی ورسٹی سے فلسفے میں فاضل، سعیدالدین احمد (اور اگر اس کے کوئی معنی ہیں تو گولڈ میڈلسٹ) کی کیجولٹی ہے۔ میں نے یہاں پولیس محرروں کا پسندیدہ تلفظ "کیج وَلٹی" لکھا ہے؛ اس لیے نہیں کہ مجھے پولیس محرر پسند ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ تلفظ بزنس لائیک، اِنفارمل، کولڈ بلڈڈ، جابلانہ اور تقریباً اِن ہیومن لگتا ہے، اور اس تمام صورتِ حال میں ایک نحوست آثار سنگِ مزار کی طرح جڑا ہوا ہے۔

مجھے سعیدالدین احمد کے سانحۂ ارتحال کی کوئی اطلاع نہیں۔ خدا معلوم وہ ابھی تک وِیجی ٹیبل کی طرح زندہ ہے یا اس کی مشکل آسان ہو گئی۔

سعیدالدین احمد نے مجھے جَون ڈَن (John Donne) پڑھایا تھا۔

وہ تھا تو میرا ہم مکتب ہی، مگر فلسفے کا فارغ التحصیل ہونے اور بھیانک حد تک ذہین ہونے

کے ناتے وہ میرا ایٹافز کس کا آن آفیشل استاد بن بیٹھا تھا۔

مگر مجھے یہ واقعہ شروع ہی سے سنا دینا چاہیے۔

سعید الدین احمد اپنی looks میں پچاس فی صد دراوڑی، پچاس فی صد نیگرو اور سو فی صد دکھنی تھا۔ نرسمہاراؤ کی طرح چوڑے نتھنوں اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے سے افریقی سر والے اس فٹ بالر کے چہرے پر کنگ جیسی نرمی اور ذہانت تھی اور موٹے چشمے کے پیچھے سے جھانکتی، "I have a dream" کہتی اُس کی آنکھیں اسے ایک دم ساؤتھ انڈیا سے آیا ہوا کنگ جونیئر بنا دیتی تھیں۔

پان منڈی جونامارکیٹ سے ملحق کراچی یونی ورسٹی (اولڈ کیمپس) کے شعبۂ انگریزی میں مَیں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہاں پہنچنے کے لیے شعبے کے آدھے کمپاؤنڈ پر قابض لکڑیوں کی ٹال سے اور woodlanders کے بیچ سے لہراتے ہوئے گزرنا ہوتا تھا۔ (وہ لیکچروں کے دوران بھی ٹھا ٹھا کرکے کلہاڑے چلاتے رہتے تھے)۔ ٹال سے گزر کر اور ایک سکڑا سمٹا، گھماودار زینہ چڑھ کے شعبے کا سیمینار آجاتا تھا (جو L-4 روٹ کی کسی بھی بس کے برابر لمبائی چوڑائی رکھتا تھا)۔

میں پہنچا تو وہاں سیمینار روم کے دفتری خلیل بھائی کے ساتھ ایک بنچ پر وہ بیٹھا تھا — سعید الدین احمد!

وہ خلیل بھائی کے بچوں کے نام پوچھ رہا تھا اور ہر نام پر واہ واہ کر کے داد دے رہا تھا: مُزَمِّل، واہ! اور مُس تَن صِر اور مُد دَث ثِر، سبحان اللہ! پھر کہنے لگا، "خلیل بھائی! اپنے اگلے بیٹے کا نام میکسی ملین رکھنا۔" خلیل بھائی یہ سُن کر سر ہلا ہلا کر ہنسنے لگا۔ بولا، "سعید الدین، تم باز نہیں آؤ گے! میں جب فلسفے کے سیمینار میں تھا تو اُس وقت بھی میرے کو ایسے ہی چلایا کرتے تھے۔ اب یہاں بھی آ گئے۔"

میں نے اپنا تعارف کرایا، سامنے دوسری بنچ پر بیٹھ گیا، تو اس نے خلیل بھائی سے میرے لیے چائے بنانے کو کہا اور مسکرا کر مجھ سے بولا، "آئی فنک یو آر رادر آرلی۔

"An early bird? Haanh? Out to get a worm... that's me! Ha! Ha! Ha!

کڑک چائے کے گلاسوں پر ہم دوست بن گئے۔

ہم دونوں اپنی چلت پھرت سے سمجھو پہلے ہی دن اگلی ڈیسکوں پر، استادوں کے بالکل سامنے پہنچ گئے تھے۔ سن اُنسٹھ ساٹھ کے طاقت ور بیورو کریٹس کے بچوں بچیوں اور مستقبل کے ڈپٹی اور ہوم اور ایڈیشنل سیکریٹریوں اور مستقبل کے سکتے ہوئے انگلش ٹیچروں اور آنے والے دنوں کے عادی مے خواروں اور compulsive زانیوں کے درمیان ہم دو آدمی پٹیوں چڑھے انگوٹھوں کی طرح دھڑکتے ہوئے بالکل الگ نظر آنے لگے: پہلے اپنے کم حیثیت کپڑوں اور اپنے سوراخ والے خرّچ خرّچ کرتے جوتوں کی وجہ سے، پھر اپنے ٹیوٹوریلز کی "اے پلس"، "اے" اور "بی پلس" گریڈنگ کی وجہ سے۔

ہمارے استادوں، پروفیسر نقوی، پروفیسر مسز مایا جمیل اور صدرِ شعبہ پروفیسر (اب ڈاکٹر) علی اشرف، نے سعید کو رفتہ رفتہ سوالوں کے جواب دینے سے روک دیا۔ علی اشرف صاحب نے کہا، "سعیدالدین احمد! تم ڈیلفی کے موٹے چشمے والے Oracle ہو۔ ہر سوال کا جواب تمہارے پاس ہوتا ہے۔ تو دوسروں کو بھی بولنے دو۔ Now behave yourself and keep quiet"

رفتہ رفتہ ہم دونوں صبح کا ناشتا بھی ساتھ کرنے لگے جو گندم کے بنیادی مزے والی سادہ کڑک روٹی ہوتی تھی جسے (لب ایانی) چائے کے گلاسوں میں ڈبو ڈبو کے بھگویا اور Basic Realities پر مکالمہ کرتے ہوئے کھایا جاتا تھا۔ مگر یہ سعید کی چالاکی تھی جو اس نے میرے ساتھ ناشتے کا پاکھنڈ رچایا تھا۔ وہ بال بچوں والا آدمی تھا، گھر سے کھا پی کے چلتا ہو گا۔ میرا گھر تو تھا نہیں؛ کسی بھی کزن، کسی بھی خالہ پھوپھی کے ہاں میں سو جاتا تھا اور سویرے ہی سویرے چل پڑتا تھا، تو مجھے پان منڈی کے چائے خانوں میں ناشتا کرنا ہوتا تھا۔ اور کیوں کہ بالکل اکیلا تھا اور پیسے کی میکانکس کو سمجھتا نہیں تھا، تو کبھی میری مالیات سیٹ ہوتی تھی اور کبھی اَپ سیٹ — اور اَپ سیٹ کا مطلب تھا کہ پھر مجھے صبح کا ناشتا ایک بجے اپنے دفتر جا کر کرنا پڑتا تھا جہاں ایمرجنسی میں اُدھار دینے والے میرے ساتھی موجود رہتے۔ (کیرو بینو انٹونی گومز مجھے اُدھار دینے والوں کا سَر خیل تھا۔ ماشاءاللہ وہ ابھی زندہ اور خوب صحت مند اور خوش حال ہے اور روز شراب پیتا ہے۔ میں اُس کے لیے دعا کرتا ہوں کہ طویل برسوں تک وہ ایسا ہی چونچال رہے، اور دعا کرتا ہوں کہ جب وہاں پہنچے

جہاں اُسے پہنچنا ہے تو اسے کسی محترم رومن کیتھلک سینٹ کی ہمسائیگی نصیب ہو۔ Amen! تو یہ ٹونی گومز میرا کفیلِ اِنجیف تھا اور بیس تاریخ کے بعد سے مجھے دو روپے روز اُدھار دینے لگتا تھا۔)

لیکن میں سعیدالدین احمد کی بات کر رہا تھا۔

سعید نے اپنی ساؤتھ انڈین دانش میں اس "سیٹ، اَپ سیٹ" مالیات اور "ناشتاحاضر، ناشتاغائب" مسئلے کا حل یہ نکالا کہ وہ میرے ساتھ کڑک روٹی کھانے اور چاے پینے لگا۔ اکثرو بیشتر وہ بِل ادا کرنے کی کوشش کرتا جو ساڑھے پانچ چھ آنے ہوتا تھا۔ ہم ساتھ ہی بس پکڑتے تھے۔

ایک روز بس میں بیٹھے بیٹھے میں نے کہا، "سعیدالدین احمد! جون ڈن مجھ پر نہیں کھُل رہا۔ اُس کی مابعدالطبیعیات میری گرفت میں نہیں آتی۔ پٹھان بھائی ہوں، شاید اس لیے۔ کُروڈ، کھُرَی، رَف، فزیکل چیزیں میری پکڑمیں جلد آجاتی ہوں گی۔ میٹافزکس شاید بھاری پتھر ہے۔" وہ اپنی ساؤتھ انڈین ہنسی ہنسا جو کسی بھی تامل ٹائیگر کی طرح بے خوف بلکہ تقریباً violent تھی۔ پھر بولا، "Is that so?" اور اس نے کھڑے ہو کر بس کی وہ ڈوری کھینچ دی جس سے گھنٹی بجتی اور بس رک جاتی تھی۔ ہم ابھی بہ مشکل برنس روڈ تک ہی پہنچے تھے کہ وہ مجھے لے کے اُتر گیا۔

بس سے اُتر کے آہستہ آہستہ بندر روڈ پر آتے اور رتن تلاؤ کے بعد فٹ پاتھ سنبھالتے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ پی آئی بی کالونی تک ہم شام ہوتے پہنچے۔ کالونی تک ڈن میرے لیے اتنے اندھیرے میں نہ رہا جتنا رتن تلاؤ کے فٹ پاتھ پر تھا۔ اب ایک مکرچاندنی میں اُس کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ سعید نے اُس کا وہ مختصر مجموعہ نہیں کھُلوایا جو مسز مایاجمیل نے recommend کیا تھا۔ دوسری کتابوں کے ساتھ وہ کتاب میری گرفت میں پسینے پسینے ہوتی رہی اور سعید اپنی یادداشت سے ڈن کے اسٹانزا پہ اسٹانزا quote کرتا اور اپنی دھاردار intellect سے اُسے آبِ رواں بناتا چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے کہا، "سعید! مجھے لگتا ہے تم ڈاکٹر جونسن ہو اور میں تمھارا بوسویل جو سوال کر کر کے تمھارا ٹیپا کر دے گا۔ میں بہت دن ضائع کروں گا تمھارے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ پھر ہنسا۔ پھر آب دیدہ ہو کے بولا، "تم بوسویل سے زیادہ ذہین ہو۔ اور

جونسن کا کیا کہتے ہو؟ وہ تو دیوزاد تھا، مجھے اُس کے مماثل مت کرو... میں ایک کم مایہ، مسکین بہتدی ہوں جو بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہے مگر خود میں اتنا بُوتا نہیں پا رہا۔"

یہ بُوتے والی بات اُس نے عجیب کہی تھی ــــ شاید کسی طرح کی premonition تھی۔

ایک بار میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر جا چکا تھا۔ گولی مار کی امام بارگاہ کے پیچھے کہیں کسی گراؤنڈ کے پاس اس کا بے پلستر کا، ٹین چڑھا مکان تھا۔ اُس کی بیگم کہیں پڑھاتی تھیں۔ بچے سبھی پڑھ رہے تھے۔ گھر میں ایک نستعلیق غربت کا راج تھا۔ تاہم بیگم سعید نے وضع داری نباہی تھی؛ چاے کے ساتھ پلیٹ میں پاپے رکھ کے پیش کیے تھے۔

پھر دوسری بار میں اکیلا گیا جب اُس کی بیماری کا سنا۔ کوئی گمبھیر بات تھی۔

مجھے اُس کے گھر میں گھستے دیکھ کر محلے کے لڑکوں نے کہا: ابے پاگل پروفیسر کے گھر کوئی آیا ہے۔

اِس بار اس کے بچے کچھ سہمے ہوے، کچھ شرمندہ سے لگے۔ بیگم اُداس مگر باہمت دکھائی دیں۔

وہ اپنے ہی استغراق میں تھا۔ چھت کی ٹِن شیٹس ایک جگہ سے سرک گئی تھیں تو روشنی کا ایک shaft اس کے نیم تاریک کمرے میں در آیا تھا جس میں غور سے دیکھنے پر بے شمار روشن ڈسٹ پارٹیکلز گردش کرتے دکھائی دیتے تھے۔ سعیدالدین نے خوش ہو کے مجھے وہ دکھایا۔ کہنے لگا:

Worlds on worlds are rolling ever
From creation to decay;
Like the bubbles in th' river
Sparkling, bursting etc. etc.

کچھ دیر بیٹھ کر میں تقریباً روہانسا اور scandalized وہاں سے چلا آیا۔

اس پورے پھیلاوے پر کہ جس میں لوگ پیدا ہوتے، ضائع کیے جاتے، مار دیے جاتے ہیں، مجھے بڑا غصہ تھا۔

پھر کسی نے بتایا وہ دُھول بھرے پیروں میں ہوائین چپلیاں ڈالے، غیر معمولی رنگوں کا پھٹا ہوا اکیڈیمک گاؤن اپنے شانوں پر پھیلائے، چورنگی میں ملّا حلوائی کے فٹ پاتھ پر کھڑا رہتا ہے۔ لوگ اُس سے بچ بچ کے گزرتے ہیں مگر وہ اُن کی طرف دیکھتا بھی نہیں، اپنی (تامل ٹائیگر والی) ہنسی ہنستا ہوا خود سے طویل مکالمے کرتا ہے جو کبھی انگریزی میں ہوتے ہیں، کبھی اردو اور کبھی فارسی میں:

"بشنو از نے چوں حکایت می کند، وز جدائی با شکایت می کند، سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق، تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق، کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند، اور کیا اور کیا کہ مردوزن نالیدہ اند... یعنی کہ بانسری سے سنو وہ کیا کہتی ہے اور فراقوں جدائیوں سے (رنجور ہو) شکایت کرتی ہے تو کہتی ہے کہ مجھے تو بِرہ میں کھول دیے گئے گھایل سینے چاہییں تاکہ میں اپنے عشق کے درد کی شرح کر سکوں کیوں کہ جب سے مجھے اپنے نَیستاں، اپنے بانسوں کے بَن سے اکھاڑ دیا گیا ہے، اور کیا اور کیا ہوا ہے، اُس وقت سے میں روتی ہوں تو سب جَن روتے ہیں..."

وہ نوبیل لاریئٹ فزی سسٹ ڈاکٹر سر سی وی رَمن کا گرائیں تھا۔ جیتا اور باہوش رہتا تو اِس بھاگوں بھرے شہر کا ایک luminary ہوتا۔ مَیں عاجز اُس کا گرائیں کہلاتا۔

میں نئے کیمپس میں جانے لگا تھا جہاں ابھی سیمنٹ کی کاٹتی ہوئی بُو اور چونے قلعی ڈسٹمپر کی نئی چمک سانسوں کو اور آنکھوں کو بھلی لگتی تھی۔

ایک بار خبر ملی کہ وہ بھی کیمپس آنے لگا ہے ـــ سعیدالدین احمد!

پتا چلا ایک روز پروفیسر مایا جمیل کی کلاس میں اُنھیں اپنی ماں کہتا گھُس گیا تو اُنھوں نے اسے تسلی دی۔ کرسی منگا کے اُسے اپنے پاس بٹھالیا اور لیکچر جاری رکھا۔ پھر وہ اُسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ چائے منگائی، اپنے ہاتھ سے بنا کے پلائی۔ ایک لڑکے کو بُلا کے بہت سے نوٹ اُسے دیے اور کہا، "رکشا کر لو۔ انھیں ان کے گھر چھوڑ آؤ۔ پھر آ کے مجھے بتانا۔"

پروفیسر مایا جمیل وہی ہیں جنھیں قرۃ العین حیدر نے اپنی کسی کہانی میں یاد کیا ہے۔ (شاید "میرے بھی صنم خانے"، شاید "سیتا ہرن" ـــ معلوم نہیں!)

آخری بار مسلم لیگ کوارٹرز کے قریب ایک پنساری کی دکان کے سامنے وہ مجھے نظر آیا۔

شاید اُس کے لیے منگنی خریدی جا رہی تھی۔ ایک شریف صورت ساؤتھ انڈین بڑے میاں اس کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ وہ پہچان گیا۔ پوچھنے لگا، "اسد! کیسے ہو؟" میں نے کچھ بھی کہہ دیا۔ وہ بولا، "اب میں ٹھیک ہوں۔" مگر یہ باتیں اُس نے آنکھیں جھکا کے کہی تھیں اور اُس کی آنکھوں میں سُرمہ لگا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آپی آپ لرز رہا تھا اور تامل ٹائیگر والی ہنسی کی جگہ چہرے پر ایک fixed معذرت خواہانہ مسکراہٹ ہمہ وقت موجود تھی۔

شریف صورت ساؤتھ انڈین اُس کے باپ تھے۔ کہنے لگے، "اب یہ رُو بصحت ہیں۔ شکر ہے پروردگار کا۔ بڑا بچہ سترہ اٹھارہ برس کا ہو گیا ہے، ایک جگہ ٹائپسٹ لگ گیا ہے تو مالی پریشانیاں بھی کم ہوئی ہیں۔"

میں نے دیکھا، بجلی کے نیچے تلے وولٹیج سے جھٹکے دے کر اور strong کیمیکلز کے محتاط مگر مسلسل dosage سے تامل ٹائیگر کو زنجیر کر دیا گیا تھا۔ اُس کا بدن بحال ہو چکا تھا؛ وہ کھانا کھاتا، نہاتا، کپڑے تبدیل کرتا تھا۔ مگر بڑے میاں نے بتایا کہ پڑھ نہیں سکتا، ذہنی کام نہیں کر سکتا۔

میں نے سوچا اُس کا forte تو اُس کا ٹھاٹھیں مارتا ذہن ہی تھا؛ ذہن نہیں رہا تو باقی جو بچ رہا وہ سعیدالدین احمد تو نہیں، ایک hulk ہے۔ ایک صحت یافتہ ویجی ٹیبل۔ میری دل چسپی ختم ہو گئی۔ جس طرح میری دل چسپی خود اپنی کہانی کے ایک کردار ناصرالدین ہمایوں میں ختم ہو چکی ہے۔

اونچے قد کاٹھ کے سفیدوں سفید ناصرالدین ہمایوں کا forte اُس کی حیران کن قوتِ مردمی تھی۔ وہ ہر شب نشان زدہ گھروں میں سیڑھی لگا کر اُتر جاتا اور ناسُفتہ بی بیوں کو deflower کرتا۔ کہانی کے کسی ناہنجار موڑ پر خداوند قدوس نے (Of course an act of God!) ایک پین لیس آپریشن کے ذریعے اُسے اُس کے خصیوں سے علیحدہ کر دیا۔ اب وہ صرف ایک half-witted non-entity اور ایک incommunicable hulk تھا ــــ ناصرالدین ہمایوں۔

An idiot (mouth-fucked by an imbecile
Jaguar with much sound and fury)
Signifying nothing.

سعید الدین اپنی سوڈ کے بعد بیرونی محیط میرے لیے اعصاب شکن ہوتا جا رہا تھا۔ میں طوفان کے مرکز میں لوٹ آیا۔ وہاں کسی بھی فلم کو ایک بار دیکھتا، پھر اُسی کو دوسری بار دیکھنے کے لیے قطار میں لگ جاتا۔ بہت بے سمت وقت گزر رہا تھا۔ مگر میں پُرسکون ہوتا گیا اور کسی عافیت کے بہلاوے میں دھیما ہوتا گیا۔

کہنے کو اَب کچھ نہیں رہا: میں اپنے بیان کے اختتام پر ہوں اور طوفان کے مرکز میں۔

***

تو ہم مرکز میں تھے جو شانت اور تقریباً unruffled ہوتا ہے۔

مگر ابھی ہم وہیں تھے جو بیرونی محیط سے فیلڈمارشل کا بیٹا کئی سو ٹرکوں کا جلوس لے کر بندرروڈ سے طوفان کے مرکز میں داخل ہوا اور اُسے درمیان سے قطع کرتا، unruffled دائرے کو توڑتا، میوزیکل فاؤنٹین کی طرف نکل گیا۔ طوفان کا مرکز اُتھل پُتھل ہو گیا۔

وہ ـــ جسے برسوں، گندھاروں بعد، سفید ریشمی واسکٹ کی اوپری جیب میں مَرُون کلر کا رومال اُڑس کے اسپیکر کی کرسی پر بیٹھنا تھا ـــ بوڑھی فاطمہ جے پر اپنے پپا کی concocted فتح کا جشن مناتا، اپنے (سروس؟) ریوالور سے بے حساب گولیاں چلاتا، طوفان کے محفوظ دائرے کو ہمیشہ کے لیے دونیم کرتا، سَنسَناتا ہوا، صاف نکل گیا۔ تیس ٹرکوں پر تو صرف اُس کے وہ کارندے سوار تھے جو بید کی گھومی ہوئی چھڑیوں سے ڈھول تاشوں پر ضربیں لگا رہے تھے کہ درِ گہ درِ گہ... درِ گہ... درِ گہ درِ گہ... درِ گہ...

ہم سمجھ گئے کہ عافیت کا دائرہ اب کہیں نہیں رہا۔

***

اور عافیت ایک relative term ہے، اور جتنے دن بھی رہنا ہے براہِ راست سنسناہٹوں
کے بیچ رہنا ہے۔
تو اَب ہم وہیں ہیں۔

The fault, dear Brutus, is not in our stars
But in ourselves, that we
(bookworms etcetera)
are underlings.

سارنگ

نوعمر کریجانند گنیش نے پلے والا بٹن دبا دیا، سونڈ پھیلا کر آسائش کی سانس لی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سامنے اسکرین پر جما دیں۔ دیولوک کے وشنو نرسری اینڈ کنڈرگارٹن ودّیالئے کا گرڈ آنے میں ابھی دیری تھی۔ لنچ بکس کا ڈھکنا کھولنے اور دو چار مودَک — لڈو — لپیٹ لینے میں کیا لگتا، مگر کنپٹی گنیش کو یاد آیا کہ مما قالین پر پڑے فوڈ کرمبز دیکھ کے چڑ جاتی ہے، "کھامکھا میں یَل کرے گی وہ۔" اس نے ڈھکن لگا لنچ بکس توند پر سے پھسلا دیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور چھاج ایسے کان پھر سے اسکرین کی اور کر لیے۔

فرش کے بیچوں بیچ ایک گدا پڑا تھا۔ کونے میں ایک مٹکا اور مٹی کا پیالہ دھرا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا، پر سلاخیں لگے اونچے روشن دان سے اندر کچھ اُجالا پہنچ رہا تھا۔ گدے پر ایک یُووک پڑا آرام کرتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے یُووک کسمسایا اور کروٹ بدل کے اٹھ بیٹھا۔ سر جھٹک کے اس نے جماہی لی اور گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ "ہے ماں! یہ کون جگہ ہے؟"

اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ کوئی بھی نہیں تھا جو جواب دیتا۔ یُووک تیزی سے روشن دان والی دیوار تک گیا۔ دیوار پر ہتھیلیاں ٹکا کر اس نے سر اٹھایا۔ دھیمے اجالے کے اس ماخذ کو دیکھا اور چیخ کے بولا، "کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے؟" پھر بڑبڑایا، "کوئی بولتا ہی نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ پھر چیخا، "یہ کون جگہ ہے بھائی! بتاتے کیوں نہیں؟" کہیں سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ گدے پہ آ بیٹھا اور اپنی جانگھ کھجانے لگا۔

اسے کھُجاتا دیکھ کے گجانن گنیش کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اپنی ران پر سونڈ مار کے چنگھاڑا۔ کہیں سے عورت کی آواز آئی، "کیا بات ہے؟ گجانن!"
"کچھ نہیں ماں! کچھ بھی تو نہیں۔"
پکارنے والی اُما تھی، شیو اردھانگی، ماں پاروتی۔

یُووک نے جانگھ کھُجانی بند کر دی۔ وہ اٹھ کے مٹکے تک گیا، پانی پی کے پھر گدے پہ آ لیٹا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

گریجانند گنیش نے سونڈ سے اپنی توند سہلائی اور بڑبڑایا، "بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"
تھوڑی ہی دیر پہلے اس نے بھاری ناشتا کیا تھا۔

یُووک کچھ دیر کو سو گیا، پھر جو اٹھا تو دن ڈھلنے والا تھا۔ روشن دان اور زیادہ اُجل گیا تھا۔ باہر سے کسی گاڑی کے بار بار سلف اٹھانے کی آواز آ رہی تھی، انجن اسٹارٹ نہیں ہو پاتا تھا۔ بیٹری کم زور ہو گی۔

گنیش نے کان لگا کے سنا۔ یہ وِدّیالنے کا کرُذ نہیں ہو سکتا۔ اُس کے آنے میں ابھی دیری ہے ۔ ٹھیک ہے نا۔ گاڑی کی آواز تو اسکرین سے آ رہی ہے۔ اس نے پھر آنکھیں جما دیں۔

صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام ہو گئی، کوئی نہ آیا۔ بہت بھوک ستاتی تو یُووک اٹھ کے پانی پی لیتا، مگر خالی پیٹ تو پانی بھی تکلیف پہنچانے لگا تھا۔ یُووک کی بِپتَ بڑھتی جا رہی تھی۔

کنپٹی گنیش نے جماہی لی اور صوفے کی پشت پر اپنا بازو پھیلا دیا۔ صوفہ چرچرا گیا۔

اچانک ہی یُووَک کے سرھانے کوئی چیز آ گری۔ اس نے پہلے پہل توجہ نہ دی، پڑا رہا۔ پھر کچھ گرا۔ بہت ہلکی آواز تھی، شیشے کی کھنک جیسی۔ یُووَک نے سر گھما کے دیکھا۔ فرش پر سرخ شیشے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ یہ کہاں سے آئے؟ اس نے سر اٹھایا، روشن دان سے اس کے دیکھتے دیکھتے چوڑی کا ایک اور ٹکڑا گرا۔ اُدھر کوئی ہے جو اشارہ دے رہا ہے۔ اس نے گدّے سے اٹھ دیوار سے کان لگا دیے۔ ایک اور ٹکڑا گرا۔ اس نے دیوار پر تھپکی دی، جواب میں دوسری طرف بھی کسی نے ہاتھ مارا۔ آواز ہلکی تھی۔

آواز گنیش نے نہیں سنی مگر اس کی دل چسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے پہلو بدلا۔ صوفہ پھر چرچرایا۔

یُووَک نے کھڑے ہو کے روشن دان کی طرف مُنہ کیا اور بولا، "کون ہے؟ ارے، کون ہے اُدھر؟" کوئی جواب نہ آیا۔ آہٹ بھی سنائی نہ دی۔ یُووَک نے دیوار پر پھر ہاتھ مارا۔ اُدھر سے بھی دیوار تھپکی گئی۔ یہ آواز بہت صاف تھی۔

"جے پربھو!" گجانن گنیش نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ دوسری طرف بھی کوئی ہے۔

یُووَک نے پوچھا، "کون ہو تم؟"
کسی نے سرگوشی کی، "سور نہیں کرو... آہستے بات کرو۔" یہ لڑکی کی آواز تھی۔
ہے مالک! روشن دان کے پار سے لڑکی بات کرتی ہے!
"کون ہو تم؟" یُووَک نے پھر پوچھا۔
لڑکی نے کچھ کہا جو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔
"پھر سے کہو۔ کیا کہہ رہی ہو؟"
"مَیں ہوں۔ اِدھر اِن کا کھانا بناتی ہوں۔"

یُووِک کھانے کا سن کے نہال ہو گیا۔ "میں بھوکا ہوں۔"

"مجھے کھبر ہے۔"

"کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟" یُووِک نے التجا کی، "ذرا دیکھ کے بتاؤ۔"

"مُسکل ہے۔ کہیں آ جا نہیں سکتی،" وہ بولی۔ "مجھے بھی تالے میں رکھتے ہیں۔ جب کھانا بنانا ہوتا ہے یا جب جرورت ہوتی ہے میری، تب لے جاتے ہیں۔"

"ضرورت؟ کیسی ضرورت؟"

"رَتی کریا کے باسطے۔"

لڑکی کے مُنھ سے اتنے کھُلے پن سے کہی گئی یہ بات یُووِک کو بُری لگی تھی۔ وہ چپ رہا۔ لڑکی نے سنکوچ سے کہا، "کچھ کھائے بِنا تمھیں بڑا ٹیم گُجر گیا۔ ہاں نا؟"

"ہُوں۔"

"دیکھو، پکّا نہیں کہتی، پر سبیرے تمھارے باسطے کچھ لاؤں گی۔ کوسِس کروں گی۔"

"سویرے؟ کل نا؟"

"ہاں۔"

وہ بڑبڑایا، "صبح میں ابھی بہت دیر ہے۔"

"ہُوں۔"

"یہ تو بتاؤ، یہ جگہ کیا ہے؟"

"کارکھانہ ہے۔"

"وہ تو ہے۔ وحام کون سا ہے؟"

"کھبر نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد یُووِک نے پوچھا، "اَے! تمھیں کہاں سے لائے ہیں؟"

"کھبر نہیں۔"

"کیوں لائے ہیں تمھیں؟"

"بتلا تو دیا... کھانا بنواتے ہیں اور رَتی..."

"اچھا اچھا،" یُووک نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔ "وہ تم سے کوئی بات چیت نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں، پر کم کم۔"

"ان سے پوچھنا۔ یہاں سے کہاں لے جائیں گے تمھیں ___ اور مجھے"

"نہیں بتائیں گے۔ مجھے ماریں گے۔"

"مارتے ہیں؟ کیوں؟"

"چُپ! کوئی آرہا ہے۔"

دوسرے کمرے کا دروازہ کُھلا ہو گا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ بہ مشکل سنائی دی۔ اُدھر کسی مرد نے دھیرے سے کچھ کہا۔ لڑکی نے اونچی آواز میں پوچھا، "کیا ہے رے؟"

مرد کی آواز آئی، گھُوں گھُوں گھُوں۔

"پر کیوں؟" لڑکی نے بگڑے تیوروں سے پوچھا۔

چٹاخ سے طمانچہ پڑا۔ یُووک چمک گیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ نے دیوار پر گھونسا بنا لیا تھا۔ دوسری طرف سے اب ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے ہاتھا پائی ہو رہی ہو۔ کپڑے پھٹنے کا چرّاٹا سنائی دیا اور لڑکی کی دبی ہوئی چیخ۔ یوں لگا جیسے اُسے فرش پر گھسیٹا جا رہا ہو۔ کوئی دروازہ کہیں زور سے بند ہوا اور پھر سنّاٹا۔

یُووک روشن دان کی طرف مُنھ اٹھائے یہ آوازیں سنتا رہا تھا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی، جسے سہلاتا ہوا وہ گدّے پہ آن لیٹا اور آنکھیں بند کر کے کھانوں کے خواب دیکھنے لگا۔

گریجانند گنیش توند پر سونڈ پھسلاتے ہوئے میٹھے مہکتے مَودک کے بارے میں سوچ رہا تھا جو پلاسٹک کے شوخ رنگ لنچ بکس میں رکھے تھے۔ وہ گوسوامی تُلسی کی لکھی اِستُوتی گنگنانے لگا جس میں خود اُس کی مَہما کا گُن گان کیا گیا تھا اور اِن لڈوؤں کا ذکر تھا: مَودکَ پریہَ مُد منگلَ داتا، مَودکَ پریہَ...مگر فوراً ہی اُسے خیال آیا کی وہ بھدّی آواز میں گنگنا رہا ہے۔ وہ چپ ہو گیا۔

یُووَک کتنی ہی بار سویا اور جاگا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اندر دھوپ چلی آ رہی تھی۔ کوئی چیز (نرم اور گرم) روشن دان کے رستے یُووَک پہ آن گری۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ سمجھا ہو گا کوئی جانور گرا ہے، مگر دوسری طرف سے دیوار پہ ہاتھ مار کے لڑکی نے پوچھا، "مل گیا؟"

یُووَک نے سامنے پڑی چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ اُبلا ہوا آلو تھا، خوب گرم۔ اُس نے جھیلنے کا بھی کشٹ نہ کیا، کھانے لگا۔

شاید اُس کا مُنھ جلا ہو گا تو یُووَک نے تکلیف کی آواز نکالی۔

لڑکی سمجھ کے ہنسنے لگی، بولی، "ہُسیاری سے کھا رے، گرم ہے۔"

"کِرپا تمھاری، بڑی بڑی مہربانی۔"

"یہ اَور لے، "ایک اور آلو پھینکا گیا جو واپس اُدھر ہی گر گیا۔

لڑکی خوش دلی سے ہنسی۔ "ٹھیر۔ پھر پھینکتی ہوں۔" اِس بار آلو سیدھا گدے پہ گرا۔ وہ بولی، "پیٹ تو نہیں بھرے گا تیرا۔ پر پانی پینے جوگا ہو جائے گا۔"

"نہیں ٹھیک ہے،" یُووَک نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

"سُنو!" دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔ دونوں ہی ہنس پڑے۔

کچھ پیٹ میں پڑا تھا تو یُووَک ہنسنے جیسا ہو گیا تھا۔ بولا، "نام کیا ہے تمھارا؟"

"رُوپکا۔"

"اَہُو!" یُووَک نے حیرت کی آواز نکالی۔

"کیا ہوا؟"

"میرا نام رُوپ ہے۔"

"اررے! اچنبھے کی بات ہے ___ ہے نا؟"

"پر ٹھیک ہے،" یُووَک نے بات بڑھائی، "کوئی اتنی انوکھی بھی نہیں۔ میں رُوپ، تم رُوپکا۔" یہ کہہ کے وہ ہنسنے لگا۔

"کےتُو !" ماں پاروَتی کی دُلار سے بھری آواز آئی۔ کےتُو رے! جا تیرا گرُڈ آگیا۔ جا، دیر نہ کر۔" پاروَتی نے گریجانند کو کیتُو کہہ کے بلایا تھا ـــ میرا دُم دار تارا! میری روشنی!

"ہہ!" گنپتی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر گرُڈ رکا ہوا تھا۔ اس کی سَن سَن سنائی دے رہی تھی۔ گنپتی گریجانند لنچ بکس اٹھا کے بھاگا۔ مَودَکَ پریہ مُد منگلَ داتا... مَودکَ پریہ مُد منگل... اور تو اور، جلدی میں اس نے اسٹاپ والا بٹن بھی نہیں دبایا تھا۔

آوازیں سنیں تو جگت ماتا پاروَتی ٹہلتی ہوئی آ گئی۔ وِدّیالئے کا گرُڈ گجانن کو لے کے جا چکا تھا، اب کام کوئی نہیں تھا۔ گریجا ماں اسکرین کے سامنے صوفے پر آن بیٹھی۔

"رُوپکا!"

"رُوپ! ـــ ہاں رے؟" لڑکی کی آواز اب بہت سُرسَ تھی۔

"مَیں سمجھا تم چلی گئیں۔"

"اب نہیں جاتی۔ اب کہیں نہیں جاتی۔ سُنا تو نے؟"

"ہُوں"

"اور یہ بھی سُن لے۔ مَیں آؤں گی۔ اُدھر تیرے پاس ہی آؤں گی۔"

ماں پاروَتی نے لمبی پتلی انگلیوں سے اپنے رخسار چھوئے جو مہیشوَر شِوشنکر کے خیال سے گلابی ہوئے جاتے تھے اور تپ رہے تھے۔ جے اُماوَر!
جے دِگمبَر! جے مہیشوَر!

"ایسے کیوں ہنستی ہو؟"

"تیری عُمر کتنی ہے؟"

"اٹھارہ کا ہوں۔"

"چھوٹا ہے نا۔"

"چھوٹا؟ تم کتنی بڑی ہو؟"

مہیشی کا دھیان اُدھر نہیں تھا۔ یُووک اور کماری پہلے کچھ ایسا کہہ گئے تھے جو اس نے سُنا نہیں تھا، یا سُنا ہو گا تو دھیان نہیں دیا۔ وہ سوچنے لگی، پلٹ کے سُن لوں۔ پر ایسا بھی کیا ہو گا۔ اُما اب سیدھی ہو بیٹھی۔ کماری سے یُووک اُس کی عُمر پوچھتا تھا۔

"سترہ برس کی ہوں میں، مگر..."

"اگر مگر کیا؟ چھوٹی ہو مجھ سے۔"

"میں نہیں، تُو چھوٹا ہے۔ ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں تُو نے"۔

یُووک چڑ گیا۔ کہنے لگا، "تم نے ایسا کیا دیکھ لیا؟"

دیوار کی اوٹ سے آتی آواز میں دُکھ بھر گیا۔ "بہت کچھ... جو تُو دیکھ سہ لیتا تو چودہ برس کی عمر میں ایک دم بڑھ جاتا ــــ ایک ہی راتری میں۔"

"ایک ہی... رات... میں۔" یُووک نے ٹھہر ٹھہر کے دُہرایا۔

دیوار کے پار اب وہ سسکیاں لیتی تھی۔ "وہ اٹھانے آئے تھے مجھے۔ مَیں پکاری، بچاؤ، مجھے بچاؤ! کوئی ایک نہیں بولا۔ کوئی آگے نہیں آیا۔"

یُووک نے افسوس کی آواز نکالی، کہا کچھ نہیں۔

اب جو وہ بولی تو آواز میں ایک ذرا ٹھیراؤ تھا۔ "یہاں اِس وَکت جتنے ہیں، سب کی روٹی بناتی ہوں، چیرے دھوتی سکھاتی ہوں۔ روج رات میں دن میں، جبی مَرجی ہو، کھینچے لے جاتے ہیں۔ تین برس سے ایسا ہی ہے۔ اِن سے پہلے دوسرے تھے۔ اُن سے پہلے دوسرے ــــ سب سکتی مان، سبھی تاکت بَر۔ جب تک جی کرتا ہے رکھتے ہیں۔ جی بھر جاتا ہے، کسی اور کے ساتھ بنکا دیتے ہیں۔" وہ روئے جا رہی تھی۔

یہ کیا کر دیا میں نے؟ یُووک دیوار سے لگا بیٹھا دُبدھا میں سر جھٹکتا تھا ــــ چپ رہوں یا دلاسا دوں اِسے؟

وہ خود ہی چپ ہو گئی۔

یُووک دھیرے سے بولا، "دُکھ ہوا سب سُن کے۔"

لڑکی کی آواز میں چمک تھی۔ "ارے سب چلتا ہے۔ تو دُکھی مت ہو۔ سال پیچھے سنا کے روئی ہوں۔" اُس نے ہنسنے کی بھی کوشش کی تھی۔

"سال پیچھے کسے سنایا تھا؟"

"دیہاروں کو۔"

یُووَک چُپ ہو گیا۔

لڑکی نے آواز دی، "رُوپ! — رُوپمان!"

"ہُوں۔"

"کوئی بات کر۔"

"بات؟ — میں یہ بات بھولوں گا نہیں، جو تُو نے کہی، بھولوں گا نہیں۔"

"کون بات؟"

"کہ رُوپکا کشٹ جھیلتی ہے، مصیبت میں ہے۔"

"مصیبت تو رُوپمان اتنی دیر کی تھی، جتنی دیر ی تجھے سنایا۔ اب ٹھیک ہوں، پروا نہیں — پکّی ہو گئی ہوں۔ اِن چنڈالوں سے بدلہ بھی چکا لیتی ہوں اب تو۔"

"بدلہ؟ وہ کیسے؟"

"ابھی دو کو لڑا دیا نا۔ ایک نے ایک کے چُھری مار دی۔ گاڑی اِدھر تجھے لے کے آئی، اُدھر اُسے لے گئی۔ بچے گا نہیں۔ گردن کی نرّڑی کٹ گئی ہے۔"

"کس طرح لڑا دیا؟"

"بس — لڑا دیا۔"

"بتاؤ نا، کیسے؟ کیا کِیا تم نے؟"

"نہیں بتاؤں گی۔"

"رُوپکا! یہ کیا بات ہوئی؟ بھلا دوست نہیں ہیں ہم؟"

"دوس؟ — دوس کا تو پتا نہیں... پر بتاؤں گی نہیں۔ بڑی بے سرمی کی بات ہے۔ تجھے تو بالکل نہیں بتانے کی۔"

"اچھا- رہنے دو پھر-"

"بُرا کیوں مناتا ہے؟ ___ بس نا، کھتم کر-"

"ہاں- ختم کر دیا- پر ایک بات ہے-"

"کیا؟"

"اُنھیں پتا چل گیا کہ وہ رُوپکا کی وجہ سے جھگڑے ہیں تو بُرا حال کریں گے تمہارا-"

"اور کیا برا کریں گے چنڈال؟ ویسے کسی کو مالُم نہیں ہوئے گا کی جھگڑا کیسے، کس وَجے سے ہوا-"

"وہ پوچھ لیں گے- ایک تو زندہ بچا ہو گا- وہ جس نے مارا ہے-"

"وووہ نہیں بتائے گا- کوئی مَرد ایسی بات نہیں بتاتا-"

"کیا مطلب؟"

"میں نے بات وہ کہی کی دونوں لڑ پڑے، پر ایک نے دوسرے کو بتائی نہیں- چُپ کی ___ کھاموسی کی بات ہے-"

"خبر نہیں کیا کہہ رہی ہے!"

"اسی لیے کہا تھا ابھی تُو چھوٹا ہے-"

"چل پھر وہی مت شروع کر ___ جا سوجا-"

"کھَفا ہو گیا؟"

"نہیں نہیں، سوچتا ہوں تُو پھر نہ رونے لگے- اب سو جا- میں تھک گیا ہوں-"

"ہاں- تھک گیا ہے تو سو جا ___ دوس!"

"دیکھا! آخر تُو نے دوست کہا نا مجھے-"

لڑکی دیوار کے پار سے ایسے ہنسی کہ یُووَک کی کوٹھری میں بسنت آ گئی-

"دیکھا؟ دوست بنا لیا تجھے- مجھے دوست کہا نا تُو نے،" یُووَک اِترا کے بولا-

وہ پھر ہنسی- "وہ تو ایسے ہی کہہ رہی تھی ___ جُھووٹھ-"

ماں جکدمبے نے سیس کا چندرَ کِرَن پُشپ اُتارا اور رُوپکا کی اور پھینک دیا۔

"یہ کیا تھا؟"
"کیا؟" وہ کھلکھلا کے بولی۔
"جو ابھی دیوار کے پار تیری طرف گیا؟"
"چَندرَ کِرَن پُشپ۔ یہ تُو نے پھینکا ہے نا؟"
"مَیں نے؟ ــــ نہیں تو۔"
"جیادہ مت اِتراؤ، جُھوٹھے!"

شیو اَردھانگی پاروَتی ایک مَند مُسکان لیے اسکرین پر نظر ڈالتی رسوئی میں چلی گئی۔ یہاں بہت کچھ ہوتا رہا۔

یُووَک پوچھ رہا تھا، "کیا بازار جا رہی ہے؟"
لڑکی بولی، "ہاں بَزار لے جا رہے ہیں سُسرے۔ ناج، مسالے کھتّم ہو گئے۔"
"اچھا ہے، چلی جا۔ جتنی دیر یہاں سے دور رہے، اچھا ہے۔"
"دیر دُور کیسا۔ اِدھر سے دُور اب نہیں رہنا۔ اور جو بَزریا جاؤں گی تو تُو بھی سنگ ہوے گا میرے۔"
"وہ کیسے؟"
"ہیا میں ــــ ہیا سمَرتا ہے؟ ــــ ہِردئے، دِل۔"
یُووَک ہنس پڑا، "آہ!"
"ہنستا کیوں ہے؟ ایتبار نہیں؟"
"ہے۔ اعتبار ہے۔ اچھا بتا کیا لائے گی؟ میرے لیے بازار سے کیا لائے گی؟"
لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی، "سارنگ۔"

"سارنگ کیا؟"

وہ بولی، "سب چیج۔"

"کیا سب چیز؟"

"سُن ـــ سارنگ بولتے ہیں جب کسی اپنے کو کچھ دنیا ہووے اور سمجھ نہیں آوے کی کیا دے۔ جی کرے اِس دُنیا سنسار کی، برہمانڈ کی سبھی چیج دے دیو۔ تبھی بولتے ہیں کی تیرے لیے سارنگ لاؤں گی۔"

"اچھا۔ پر یہ سارنگ ہوتا کیا ہے؟ چیز کیا ہے؟"

لڑکی بولی، "سب چیج! کمَل کا پھول سارنگ۔ کاجل، کپڑا، موتی، سونا، چراگ دِیوا، یہ سب سارنگ ۔ باج، ہنس، مور، گھوڑا سبھی سارنگ اور جیسا تُو ہے باگھ، سیر ـــ تو تُو بھی سارنگ۔ تال، سنکھ، پپیہا، ہرنی، کویل ـــ اَے اَے! تیرے کو کویل لادوں؟ کواُو، کواُو ـــ ہاں؟"

"باولی ہے تُو تو۔"

"ابھی سُن نا۔ سارنگ بولتے ہیں رات کو، چندرما کو، سُوریہ کو، جَمین کو، بھنورے کو، اور آکاس کو، کبوتر کو، بل کو، راجے کو، سِر کے چھتر کو اور تیرے چرن لگانے چندل کو۔"

"چندل؟"

"ارے ہاں نا۔ جسے صندل بولتے ہیں اور چڑیا بھی سارنگ ہے اور عورت بھی ـــ عورت چَہیے تیرے کو؟"

"ایک دم مَستک اُلٹ گیا ہے تیرا!"

لڑکی رو پڑی۔ "ہاں رے رُوپ! مہادیو میرا ساکشی۔ تُو نے تو میرا مَستک ہی اُلٹ دیا رے۔"

اور ٹھیک اُسی وقت ایک بھیانک گتی سنائی دی۔ مہادیو کا ڈمرُو بجتا تھا۔ ایک دامنی کے لشکارے میں یُووک اور کماری کے بیچ کی دیوار ڈھے گئی۔

کوٹھری میں پڑے (کتنی ہی رَتی کِریاؤں سے چِکٹے) مَیلے کُچیلے گدے پر باگھمبر بچھ گیا۔

جَے ہو!

رُوپ اور رُوپکا پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔
"تو رُوپ ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔
"اور تم رُوپکا ــــ تم نِرملا ہو اور اُجولتا بھی۔"
"میں چنڈالوں کی رکھیل رُوپکا۔"
"تم ستیہ ہو، شِو اور سُندر بھی۔"
"میری جنگھاؤں کے بیچ اَپوتر آگ کی دلدل ہے۔"
یُووَک نے اُس کے دونوں ٹخنوں کو چھُوا۔ "تم لجاوَنتی اور پَوِتر ہو اور نِرمل بھی۔"
یُووَک نے اُس کے مَستک کو ہاتھ لگایا۔ "جے ہو!"
لڑکی نے اُس کے چرَن تھام لیے۔
وہ اُسے باگھمبر پر لے آیا۔
کسی آخری نِرتیہ کے پچھواڑے، جہاں کچھ نہیں بچا تھا، زانیوں چنڈالوں کا رستا روکے ہوئے اب ایک نئی اور بے خوف زندگی سر اٹھا رہی تھی۔
رُوپ اور رُوپکا، کروناسے گرِہاپتی مہیش کے باگھمبر پر تھے۔ دُنیا بھر کے مَسلے مَسلائے پٹے ہوئے یہ دِلت پُرُش اور استری مَتھن کرتے تھے۔ ان کی دَھمنیوں میں گرِہاپتی مہیشوَر کے شوکت و جلال کا ڈمرُو بجتا تھا۔

ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹِو اسٹوری

مغلوں سے پہلے — اور اُن کے بعد بھی — ناپسندیدہ سلطان یا ناپسندیدہ سلطانہ سے پیچھا چھڑانے کی راست صورت یہی سمجھی گئی کہ ایک سو ایک مروّج طریقوں میں سے کوئی ایک استعمال کرتے ہوئے اُسے ہلاک کر دیا جائے — تلوار سے یا پھانسی دے کے، وِش کنّیا سے ہم بستری کرا کے یا مور کے پَر سے تلووں میں گدگدی کرتے ہوئے — جیسے بھی بن پڑے۔

ذاتی طور پر مصنّف اِن تمام ایک سو ایک طریقوں کے حق میں ہے مگر کیوں‌کہ یہ کہانی مزاحمت کرنے والے کے نقطۂ نظر سے سوچی گئی ہے، اس لیے فی الحال یہ مصنّف رسمی معذرت پیش کرتے ہوئے کہانی سنانا شروع کرتا ہے۔

دریاخان حُجّاب دار پرانے وفاداروں میں سے تھا۔ وہ اقامت گاہِ سلطانی کے قریب کہیں رہتا تھا۔ ایک بار راستا طے کرتے ہوئے دریاخان بازار کے بھیڑ بھڑکّے میں پھنس گیا۔

اجناس کی منڈی کے اِس ہجوم میں پھنس کے دریاخان حجاب دار نے عجب طرح کی بے بسی اور اُلجھن محسوس کی۔ اُسے دیر پر دیر ہو رہی تھی۔ یہ اُلجھن ایک آہستہ سلگنے والے غصّے کی شکل اختیار

کرتی جارہی تھی کہ اُس نے دوسری طرح سے یہ بات سوچی۔ اُس نے غور کیا کہ ناج منڈی کے حمال، گاڑیاں، بہلیاں اور گڈ اس کے راستے میں نہیں آرہے، وہ خود اُن کی راہ کھوٹی کر رہا ہے۔ "یہ ان کا علاقہ ہے اور میں یہاں اجنبی ہوں،" یہ سوچتے ہوئے اُس کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔ غصہ ٹل گیا۔

دریاخان کے لباس، اُس کی تلوار کے مرصّع نیام یا دستار کے جواہر نگار جیغے پر جس بھی رہ گیر کی نظر پڑتی یا جو بھی گاڑی بان اُس کی پُرتکلف چال، سرخ و سپید رنگت اور بارُعب چہرے کی جھلک دیکھ لیتا، وہ حیران اور مرعوب ہو کر راہ دے دیتا، گاڑی کی رفتار کم کر کے اُسے گزرنے کا موقع دیتا تھا۔

روزمرّہ کے مفید کاموں میں مصروف ان سادہ، محنتی لوگوں کو اپنی موجودگی سے اس طرح ٹوکنا دریاخان کو اچھا نہ لگا۔ اُس نے چلتے چلتے ہاتھ بڑھا کر دستار کا زیور اتار لیا، اُسے اپنی جیب کے حوالے کیا۔ کمر کا دوپٹا کھول اُسے سر اور شانوں کے گرد اس طرح لپیٹ لیا کہ زردوزی کی جھلملاتی دستار اور گردن اور شانوں پر پہنے درباری نشان چھپ گئے۔ چہرے کا کچھ حصہ بھی بازار کے گردوغبار سے اور سرسری دیکھنے والوں کی نظروں سے محفوظ ہو گیا۔ اُس نے آستین سے رُومال کھینچ کر اُسے اپنی تلوار کے مرصّع نیام پر لپیٹ لیا۔ اب چلتے پھرتے، قریب و دُور کا کوئی بھی دیکھنے والا دریاخان کو دیکھ کے ٹھٹھکتا نہیں تھا۔ وہ خریداروں، بیوپاریوں، حمالوں کے ہجوم میں اب ایک عام سارہ گیر تھا جو اجناس کی منڈی میں اعتماد کے ساتھ راستا طے کر رہا تھا۔

لوگوں نے اُسے دیکھنا بند کر دیا تھا مگر ادھراُدھر نگاہ ڈالتے ہوئے خود دریاخان نے ایک ایسا شخص دیکھا جو اگرچہ عامیانہ پوشاک پہنے تھا مگر عامیوں میں سے نہ تھا۔ وہ اپنے نکلتے قد کے ساتھ کو بڑ نکال کے چل رہا تھا۔ دریاخان کو یوں لگا جیسے وہ بھی ہجوم میں گم ہونا چاہتا ہے اور یہ احساس ہوا کہ اسے کہیں باربار دیکھا ہے ــــ مگر کہاں؟ دارالحکومت میں؟ دربار میں؟ دریاخان نے اس کشیدہ قامت آدمی کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ دربار میں پیش بھی کیا تھا۔ ہاں! یہ پُرتگالی طبیب زادہ ہے ــــ بھلا سا نام ہے، الفانس؟ ناں ــــ افانزو۔ مگر یہ اس وقت یہاں؟ اجناس کی منڈی میں؟

ایک حبشی حمال بڑا سا تھیلا اٹھائے افانزو کے پیچھے پیچھے چلا جاتا تھا۔

دریاخان نے سوچا، عجیب بات ہے، جو شخص دیسی درباریوں کو خاطر میں نہ لاتا ہو وہ اِس وقت اس حبشی حمال کے ساتھ خوب باتیں کرتا کہیں جارہا ہے! — تو یہ کہاں جارہا ہے؟
کہیں بھی جانے سے پہلے دریاخان اپنے تجسس کی تسکین چاہتا تھا۔ وہ دس قدم کے فاصلے سے افانزو اور حمال کے پیچھے چلنے لگا۔

جس شہر میں سلطان یا سلطانہ موجود ہوں، وہاں دیوانِ شُرطہ کی ذمے داریوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ بات مملکت کے میرِ توزک اور دربار کے حجاب دار (یہ دونوں عہدے دریاخان کے پاس تھے) سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔ دریاخان جانتا تھا کہ کتنے ہی مُخبر اور پرچہ نویس ولایت "الف" کی سرکار "با" میں اِس وقت زندگی کے ہر شعبے کی ہر عامی اور سرکاری سرگرمی کا مشاہدہ کررہے ہوں گے اور ڈاک چوکی کے تیزرَو نظام کو لیاقت سے استعمال کرتے ہوئے آس پاس کے احوال سمیت اپنے مشاہدات دَروغہ ڈاک چوکی کی وساطت سے خود سلطانِ والاجاہ یا سلطانۂ معظمہ تک پہنچاتے ہوں گے۔ مگر دریا نے یاد کیا کہ سلطان کچھ عرصے سے علیل ہیں، اس لیے بےشمار پرچہ نویسوں کی بھیجی ہوئی بےحساب خبریں خود اُن کے ملاحظے میں نہیں آرہیں۔ پھر بھی دیوانِ وزارت آٹھوں پہر بیدار رہنے والا محکمہ تھا تو اس کے ہوتے دریاخان کو ڈاک چوکی کے فرائض ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تاہم ایک غیر معمولی بات مشاہدے میں آگئی ہے، اس لیے جاننا ضروری ہے کہ یہ شخص افانزو آخر اِس وقت جاتا کہاں ہے۔ تجسس دور کرکے دریا اپنی راہ لے گا۔ اگر کوئی غیر معمولی بات اِس بارے میں اُس کے مشاہدے میں آئی تو شحنہ کو بُلوا کے اس کے علم میں لائے گا، ورنہ سمجھے گا کہ یہ نصف ساعت بازار میں ضائع ہوئی۔

افانزو اور وہ حبشی نارجیل فروشوں کے کوچے کی طرف مڑ گئے۔ یہاں دکانوں پر تازہ سبز کھال کے نارجیل لٹکے تھے۔ کہیں پختہ کتھئی رنگ اور گھنی جٹا والے نارجیل کسی شیطانی جنگ وجدال کے بعد بنائے گئے سروں کے میناروں جیسے سجائے گئے تھے تو کہیں مُونجھ نوچ لیے جانے کے بعد وہ لکڑی کی بیضوی گیندوں کی طرح پڑے لڑھکتے تھے۔ کسی دکان دار نے نارجیل کا کاسہ توڑ کے اور تازہ کھوپرے کو قاشوں میں تراش کے یہ دکھانے کے لیے انھیں طشتوں میں سجادیا تھا کہ اُس کے پھل تازہ اور فربہ ہیں۔

دریاخان یہی سب دیکھتا اور دکان داروں کے آوازے سنتا آ رہا تھا کہ اچانک سامنے کوئی کش مکش اور ہیجان سا سنائی اور دکھائی دیا۔

ہوا یہ تھا کہ بے ڈھنگے پن سے چلتے ہوئے افا زو کے ساتھی حبشی نے اپنا تھیلا سبز نار جیلوں کی ایک سجاوٹ سے ٹکرا دیا تھا۔ تھیلا اُس کی گرفت سے چھوٹ کے زمین پر آواز کے ساتھ گرا تھا اور کھڑ بڑ کرتی بہت سی چیزیں تھیلے سے باہر جا پڑی تھی۔ تانبے کے قلعی کیے ہوئے کٹورے، بادیے، طشتریاں، قاشق، چمچے سب طرف بکھر گئے تھے۔ دریاخان ٹھہر گیا۔ افا زو سخت پریشان اور برہم ہوا، اُس نے طیش میں حبشی کی کمر پہ لات ماری اور اپنی زبان میں بک جھک کرتا اکڑوں بیٹھ کے برتن سمیٹنے میں حبشی کا ہاتھ بٹانے لگا۔

تھیلے کا ٹکرانا، برتنوں کا بکھر جانا، ایک اعتبار سے غیبی امداد تھی۔ یوں لگا جیسے قدرت خود دریاخان کی مدد کر رہی ہے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ حبشی کے تھیلے میں کیا ہے اور اب اس نے دیکھ لیا تھا۔ یہ کسی باحیثیت گھر کے برتن تھے۔ تاہم ایک بات طے تھی کہ یہ افا زو کے گھر کے برتن نہیں تھے۔ نہ ہی یہ عرقیات اور سفوفوں، معجونوں کے ظروف یا طبیبوں کی دواسازی میں کام آنے والے قرابے اور بادیے تھے۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا افا زو انھیں قلعی کرانے لیے جاتا ہے؟ مگر یہ تو تازہ قلعی سے چمچمار ہے ہیں اور دستور یہ ہے کہ قلعی گروں کے پاس برتن بھانڈے نہیں لے جائے جاتے، وہ خود مکانوں پر پہنچ کر قلعی کرتے ہیں۔ یہ برتن نئے خریدے ہوئے بھی نہیں تھے ــــ یہ اگر ابھی خریدے گئے ہیں تو اجناس کی منڈی میں ان کا کیا کام؟ ٹھٹھیروں، کسیروں کا بازار تو کسی اَور ہی طرف ہے۔ دریاخان پہلے سے زیادہ الجھ گیا۔ بھلا الجھنے کی بات نہیں تھی؟ افا زو کا ٹھکانا اقامت گاہِ سلطانی کے قریب دریاے نَرد کے رُخ پر ہے تو پھر راہ سے بے راہ یہ برتن اٹھوائے کہاں جا رہا ہے؟

حبشی نے برتن سمیٹ کے دوبارہ تھیلے میں بھر لیے تھے اور اب وہ زیادہ احتیاط اور مستعدی سے افا زو کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دریاخان نے اِن دونوں کے پیچھے چلتے ہوئے برتنوں کی اقسام اور اُن کی تعداد پر پھر غور کیا۔ سب برتن وہ تھے جو کھانا نکالنے، پیش کرنے میں استعمال ہوتے ہیں، اِن میں ایسا کوئی برتن نہ تھا جو کھانا پکانے میں کام آتا ہو۔ دریاخان نے سوچا، سبحان اللہ! یہ

میں کوتوال کے مخبروں، دیوانِ شُرطہ کے دانش مندوں کی طرح برتنوں کی گتھی کیوں سلجھا رہا ہوں؟ راستے کی تھکن اور بھوک کا تو واللہ مجھے خیال ہی نہ رہا۔ اِس پُرتگالی طبیب بچے سے فراغت ہو تو کچھ زہر مار کروں۔

نارجیل فروشوں کا کوچہ ختم نہیں ہوا تھا کہ دیوانِ شُرطہ کے دو اہل کار پٹکے باندھے، کمر کسے سامنے کوچے میں داخل ہو گئے۔ افانزو نے اپنے حبشی سے زیرِ لب کچھ کہا اور خود اُس نے ایک محراب کی اوٹ لے لی۔ دیوانِ شُرطہ کے اہل کار دریاخان کو توجہ سے دیکھتے ہوئے اُس کے برابر سے نکل گئے۔ اُن کے ہجوم میں غائب ہوتے ہی افانزو نے محراب سے سر نکال کے جھانکا اور دُور تک نظر ڈالی۔ دریاخان مڑ کے ایک نارجیل فروش سے سَودے کے دام پوچھنے لگا تھا مگر اُس کا دھیان دکان دار کے جواب پر نہ تھا، جس نے کچھ کہا تھا۔ دریاخان انکار میں سر ہلاتا افانزو کے پیچھے چل پڑا۔ پرتگالی طبیب زادے نے قدم بڑھا کے حبشی حمّال کو جا لیا تھا۔ "طبیب زادہ قانون کے خلاف کسی کام میں پڑا ہے جبھی دیوانِ قانون کے اہل کاروں سے چُھپتا ہے۔ اب مَیں اِس کا پیچھا نہیں چھوڑنے کا۔"

نارجیل فروشوں کے کوچے سے نکل کر حبشی اور افانزو روغن فروشوں اور نانبائیوں کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ایک حقیر سے قہوہ خانے کے پاس وہ دونوں ٹھہر گئے۔ حبشی قہوہ خانے کے مالک سے کچھ کہتا رہا، وہ سر ہلا کے انکار کرتا تھا؛ مگر جب افانزو نے اپنی پہنی ہوئی انگشتری اتار کے اُسے دی تو قہوہ خانے کا مالک پہلے تو الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا رہا، پھر دونوں کو اندر دکان میں بلا لیا اور خود وہ انگشتری جیب میں ڈال ایک طرف کو روانہ ہوا۔

افانزو نے قہوہ خانے کی یکدَری میں جا بیٹھنے سے پہلے دُور تک کوچے میں نظر ڈال کے اپنا اطمینان کیا تھا۔ دریا اُس کا ارادہ بھانپ کے پہلے ہی ایک روغن ساز کے کارخانے میں داخل ہو گیا تھا جہاں روغنوں کے بھاؤ پوچھتا اور عدم اطمینان ظاہر کرتا وہ گھومتا رہا۔

کچھ وقت گزر گیا۔ آخر قہوہ فروش اپنی دکان میں واپس آیا اور افانزو کو وہ انگشتری لوٹا کر اُسے اور حبشی کو اپنے ساتھ لیے چل پڑا۔ دریاخان نے روغن فروش سے پیچھا چھڑانے کو یہ کہا کہ میں دام سے خوش نہیں ہوا، مال بہ ہر حال اچھا ہے، کیوں نہ ایک دو دکانیں اَور دیکھ لوں؛ یہ کہہ کے وہ

افانزو اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

دریا نے دیکھا، وہ لوگ کچھ دُور ایک چوڑی گلی میں داخل ہو گئے ہیں۔ دو چار بڑے پھاٹکوں والے مکان چھوڑ وہ ایک غیر معمولی بلند دروازے تک پہنچے۔ یہ کسی بااختیار معزز کا مکان ہو گا، کس لیے کہ اتنا بلند دروازہ فیل نشین ہی بنواتے ہیں۔ تاہم مکان پر ایک عام خستہ حالی چھائی ہوئی تھی۔ قہوے فروش نے دروازے پر خفیہ دستک دی ہو گی یا شاید روزن سے انھیں کوئی دیکھتا ہو گا، جو خاموشی سے دروازہ کھل گیا اور وہ تینوں مکان میں داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کر لیا گیا۔

دریاخان کے لیے یہ وقت بڑے اضطراب کا تھا۔ وہ بہ زور اس مکان میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ شور شرابا سُن کے افانزو کسی اَور راستے سے نکل جاتا اور ساری محنت اکارت ہوتی۔ خان نے آس پاس کے مکانوں اور گلیوں کا جائزہ لیا۔ بازار کی عمومی سرگرمی جاری تھی۔ کسی نے دریا کو یا افانزو اور اس کے ساتھیوں کو نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا ہو گا۔ اُس نے سوچا، وہ کیا کرے؟ کیا دیوانِ شُرطہ سے مدد لے؟ مگر دریاخان اپنے مستقر سے دُور تھا اور وہ دربارِ سلطانی میں اپنے ہم چشموں، ہم رُتبہ امیروں کے تمسخر کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ "میرے پاس کہنے کے لیے پوری بات اور کوئی واضح الزام تو ہونا چاہیے۔ صرف شک شبے پر تو کام نہیں چلتا۔"

دریاخان نے کوچے پر نظر ڈالتے ہوے اِس بات کا مشاہدہ کیا تھا کہ اِس بڑے رستے اور متصل گلیاروں میں نان بائی، شیر فروش، باورچی بہت سے تھے مگر قہوہ فروشوں کی صرف دو ہی دکانیں تھیں۔ ایک دکان تو وہی تھی جس کا مالک افانزو کو ساتھ لے گیا تھا۔ دوسری ایک درخت کی اوٹ لیے جیسے بازار میں جھانکتی دکھائی پڑتی تھی اور بہت حقیر اور خستہ حال تھی۔ اِس وقت وہاں گاہک کوئی نہیں تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ کچھ دیر سے اِدھر کوئی آیا بھی نہیں۔ ایک بوڑھی عورت کوئلے کی انگیٹھی پر کیتلیاں جمائے اور تختے پر فنجان اوندھائے حقارت کے ساتھ ہر آتے جاتے کو دیکھتی تھی۔

دریاخان نے اندازہ لگایا کہ اگر کوئی اس کی مدد کر سکتا ہے تو یہی عورت کر سکتی ہے۔ اُسے قیافہ شناسی میں دعویٰ تو نہیں تھا تاہم انتظامی امور میں ایک تجربہ ضرور تھا، جس نے آگاہ کیا تھا کہ ایک کوچے میں ایک ہی طرح کا کاروبار کرنے والے دو دکان داروں میں رقابت تو ہو گی۔ دیگر یہ کہ

بڑھیا کا دھندا بہت مندا چل رہا ہے، اِسے عام گاہکوں سے شکوہ بھی ہو گا اور سامنے یک درے میں دکان سجائے جو ملعون رقیب بیٹھا ہے، اُس سے تو وہ باقاعدہ نفرت کرتی ہو گی۔

دریاخان نے خود پر جھنجھلاہٹ طاری کی، بڑبڑاتا ہوا بڑھیا کی خالی دکان میں داخل ہو، پاپوشیں اتار گاہکوں کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ عورت نے پیروں سے شروع کر کے دستار کے طُرّے تک دریاخان کا جائزہ لیا۔ وہ پاپوش سے بندھی قیمتی مہمیز اور پوشاک کی عام نفاست دیکھ کے متاثر ہوئی تھی مگر عادتاً اتنی تلخ مزاج تھی کہ لگتا تھا دریاخان جیسے معزز گاہک کو بھی خاطر میں نہ لائے گی۔ خاموشی سے خان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ دریاخان نے سوچے سمجھے طریق پر عمل کرتے ہوئے کہا، "تجھے بھی کہیں جانا ہو تو چلی جا۔ میں انتظار کر لوں گا۔" اُس نے یہ ظاہر کیا تھا جیسے وہ سامنے والے قہوہ فروش سے ناراض ہو کے یہاں آیا ہے۔ عورت گاہک کے جھنجھلانے پر حیران ہوئی۔ وہ سمجھتی تھی جھنجھلانے کا حق اسی کا ہے۔ حیرت سے اپنے اِس گاہک کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی، "مجھے کہیں نہیں جانا ـــ کہو کیا چاہیے؟"

"قہوے اور چار طرف بھنبھناتی مکھیوں کے سوا تیرے پاس ہے کیا؟"

بات درست تھی۔ عورت نے مصالحت کے انداز میں چھوٹی سی کیتلی کو انگاروں پر اِدھراُدھر جمانے کی کوشش کی۔ بولی، "یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے اگر کچھ کھانا چاہو گے تو مشہدی قاسم کی دکان سے تازہ پنیر لادوں گی مگر اُسے دینے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمھیں پہلے پیسے دینے ہوں گے۔"

دریاخان بھوکا تھا۔ اُس نے سوچا، کیا حرج ہے، پنیر اچھا ہوا تو کھا لوں گا ورنہ غریب بڑھیا خود بھوکی لگتی ہے، وہ کھا لے گی۔ اُس نے جیب سے چمڑے کی تھیلی نکالی اور دو دام لے کے بڑھیا کی طرف بڑھا دیے، جب کہ پنیر، قہوے اور بہت سی چیزوں کے لیے ایک ہی دام کافی ہوتا۔ بڑھیا حیرت اور جھنجھلاہٹ میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکی۔ ملی جلی کیفیت میں بولی، "ایک ہی بہت ہے۔"

"رکھ لو،" دریاخان نے ہلکے غصّے میں کہا۔ "بددیانت قہوہ فروشوں کے کوچے میں خود کو زیادہ اعتبار کا ثابت نہ کرو۔ رکھ لو!"

عورت پہلی بار گاہک سے خوش ہو کے بولی، "آغا! مجھے مرنے کے بعد خدا کو منہ دکھانا ہے۔ کوچے کے شیاطین سے مجھے کیا سروکار!" اور وہ تیزی کے ساتھ قہوے خانے سے نکل گئی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ واپس آ کے اِس اپنے منحوس رقیب قہوہ فروش کے خلاف ضرور کچھ کہے گی۔ یہ گاہک اُس کے مزاج کا آدمی لگتا ہے۔

وہ لَوٹی تو کیلے کے دُھلے ہوئے تروتازہ پتّے میں لپٹا پنیر کا بڑا سا ٹکڑا اور ایک صاف ستھرے نئے کوزے میں پانی لائی تھی۔ کہنے لگی، "تم جیسے سردار، ملک التجار کے لائق پانی کا برتن نہ تھا، تو مشہدی قاسم سے کورا کوزہ مانگ لائی۔ لو کھاؤ، میں ابھی قہوہ بناتی ہوں۔"

دریاخان نے ابھی کھانا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ بڑھیا نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا شروع کر دیے۔ بولی، "میں تو کہتی ہوں اُس منحوس قزّاق سے ہم غریبوں کا مقابلہ نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔ کوئی ایک کاروبار تو ہے نہیں اُس کا۔" بڑھیا فقرہ پھینک کے گاہک کا تجسس اُبھارنا چاہتی تھی ___ مگر دریاخان کو صحیح وقت کا انتظار تھا۔ کہنے لگا، "معلوم ہے، معلوم ہے ___ میں اُس کے کرتوت خوب جانتا ہوں، مگر مجھے کیا۔ اب تو چھ ماہ بعد اِدھر آنا ہو گا، وہ جانے اور اُس کے اعمال۔"

بوڑھی عورت نے اِثبات میں سر ہلایا مگر یہ سوچ کے پریشان ہو گئی کہ گاہک کو معلومات کے اس ذخیرے سے کوئی دل چسپی کیوں نہیں جو اُس کے سینے میں محفوظ ہے۔

"پنیر اچھا ہے ___ میں سمجھتا ہوں تُو قہوہ بھی اچھا دے گی۔ کم سے کم سامنے والے اُس... اُس لاپروا آدمی سے تو اچھا قہوہ بناتی ہو گی۔"

"میں بازار کی سب سے اچھی دکان پہ نہیں بیٹھی، مگر قہوہ تمھیں اچھا پلاؤں گی۔"

قہوہ سامنے آیا تو دریاخان پوری طرح تیار تھا۔ بولا، "میں اِسے توجّہ اور یکسوئی سے تیار کیا ہوا قہوہ کہوں گا۔ تُو نے اپنے کام پر دھیان دیا ہے اور دیکھ لے کیسا اچھا قہوہ بنایا ہے۔ بے شک تُو انعام کی حق دار ہے۔" دریاخان نے چاندی کا ایک سکّہ نکال بڑی بی کی طرف اُچھال دیا۔

بڑھیا غریب نے کبھی، کسی اچھے موسم میں چاندی کا سکّہ دیکھا ہو گا! وہ حیرت اور شکر گزاری میں ہکلانے لگی اور بے رُکے دریاخان کو دعائیں دینے لگی کہ آغا خدا تجھے یوں رکھے اور یہ عطا کرے اور وہ دے۔ دریاخان اٹھ کھڑا ہوا، پاپوشیں پہنتے ہوئے بولا، "جانتا ہوں ـــ اور اگر وہ سامنے والا خبیث اپنی دلالی سے لوٹتا مجھے مل گیا تو کہیں سے تازیانہ لے کے اُسے اتنا پیٹوں گا کہ..."

"آغا! تم نے دلّال اچھا کہا ـــ وہ ملعون اس جہنمی جادوگر کا دلّال ہی تو ہے۔ گاہک لاتا ہے اس کے پاس۔"

دریاخان نے پاپوشیں پہننے میں دیر کر دی۔ چاندی کا سکّہ نتائج لا رہا تھا۔ اُس نے بڑھیا کو دیکھا، اثبات میں سر ہلایا، بولا، "جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ یہ تُو مجھ سے کہہ رہی ہے؟ اُس بدانجام سامری کے چکر میں تو اُسی نے مجھے پھنسایا تھا۔ کہتا تھا آغا! کنیز تمھاری مطیع فرماں بردار ہو جائے گی۔ ایسا عمل کرا دوں گا اُس بدقماش سے کہ..."

"عمل؟" عورت حیران ہوئی تھی، "اَے یہ مُردہ عملیات کب سے کرنے لگا؟ اسے شیطانی دوائیں تیار کرنے سے ہی فرصت کہاں ملتی ہے جو عملیات اور حاضرات کرے گا۔"

دریا کو مایوسی ہوئی۔ افازو اور اُس کا حبشی دواؤں کے لیے اس مکان میں گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ پُرتگالی علمِ طب کی تعلیم کے لیے یہاں آیا ہے، مددگار طبیب ہے۔ افسوس دریاخان نے پوری ایک ساعت کسی ایسے ناتجربہ کار نوجوان کی طرح گزار دی جس کا ذہن اوہام سے اور خیالی داستانوں سے خوب مشتعل ہو۔

وہ مایوسی اور خِفّت میں دکان سے چلنے کو ہوا کہ بڑھیا نے، جو کچھ نہ کچھ بولے جا رہی تھی، کہا، "تم شاید اس قطامہ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو ـــ اپنی کنیز سے؟"

"ہاں ہاں،" دریا نے یوں ہی سر ہلا دیا۔

"یہ خبیث سب طرح کے زہر تیار کرتا ہے۔ کام میں فرد ہے اپنے۔"

"زہر!" دریاخان رک گیا۔

شاید وہ ٹھیک جگہ آیا ہے۔ شاید صحیح طور پہ کلام کر رہا ہے۔ اُس نے محتاط انداز میں گول مول بات کی، بولا، "ہاں، یہی عمل کرایا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔"

عورت رازدارانہ دریا کے قریب پہنچی اور دھیرے سے کہنے لگی، "ایک بات آغا، میں خدا لگتی کہوں گی! اِس منحوس کے تیار کیے زہر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتے۔ آج نہیں تو ایک ماہ بعد، چھ ماہ بعد، وہ مُردی ختم ضرور ہو جائے گی۔ کنیز تمھاری بچے گی نہیں۔" پھر وہ فوراً ہی پوچھنے لگی، "کس طرح کا دیا تھا اس نے؟ کھانے کا؟ سونگھنے کا؟"

"سونگھنے کا؟" دریاخان نے بناوٹ کی حیرت ظاہر کی۔

"کیا سمجھتے ہو؟ یہ ایسا زہر بھی تیار کر سکتا ہے جو رنگ کے ساتھ لباس میں سرایت کر جائے اور پہننے والے کو آٹھ دس روز میں ختم کر دے۔"

دریاخان کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ "کیا ایسا زہر بھی جو برتنوں میں پیوست کیا گیا ہو؟ اور پھر جب ان برتنوں میں کھایا پیا جائے تو...؟"

"کیوں نہیں آغا! یہ منحوس سب طرح کے کام ہاتھ میں لیتا ہے۔ طاق ہے اپنے ہنر میں۔"

مسندِ عالی دریاخان حُجاب دار نے چاندی کا ایک سکّہ بخش کے بڑھیا کو اپنا مطیع کر لیا تھا۔ وہ ساری منحوس کے بارے میں تفصیلات بتانے پر آمادہ تھی۔ ہرچند کہ اُس کا کاروبار بڑھیا کے کاروبار سے جدا تھا؛ دونوں میں براہِ راست کوئی ٹکراو نہ تھا۔ بڑھیا کو تو اِس بات کا غصہ تھا کہ وہ اُس کے رقیب قہوہ فروش سے دلّال کا کام لیتا ہے؛ اُسے اپنی جیب سے حقِ محنت دیتا ہے۔ بڑھیا کو یقین تھا کہ قہوہ فروش گاہکوں سے بھی کچھ نہ کچھ ہتھیا لیتا ہو گا۔ دونوں ہاتھوں سے پیسا کھینچ رہا ہے نافرجام۔ قہوہ فروش کو خود کیا محنت پڑتی ہو گی۔ اُس نے شہر بھر کے آوارہ گرد نکموں سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ ایسوں کو پہچان کے خبر کر دیں جنھیں دشمنوں کو چُپ چُپاتے ٹھکانے لگانے کی ضرورت ہے۔ آوارہ گرد نکمے ایسے لوگوں کا پتا نشان قہوہ فروش کو بتا کے آدھی رات کو بھی اپنا انعام لے سکتے تھے۔ قہوہ فروش ضرورت مندوں کے بارے میں کچھ دوسروں سے مدد لے کے اطمینان کر لیتا کہ سودا طے ہو سکتا ہے، کوئی خطرے کی بات نہیں۔ پھر وہ ضرورت مندوں سے مل کے تفصیل سمجھتا اور زہر فروش سے پوچھ کے رقم بتا دیتا۔ بڑھیا کا خیال تھا، مردود اس رقم میں بھی الٹ پھیر کرتا ہو گا۔

دریاخان بڑھیا سے یہ سُن کے بہت پریشان ہوا کہ سامری وہ زہر بھی تیار کرتا ہے جو کھانے کے برتنوں میں سرایت کر جائے اور جب اُن برتنوں میں کھانا اُتارا جائے تو زہر اپنا کام دکھا دے ــــ کھانے والا ہلاک ہو جائے۔ دریا نے افانزو کو برتن لے جاتے دیکھا تھا۔ خدایا! اگر یہ برتن سلطانِ والاجاہ کے استعمال کے ہوے؟ اللہ رحم کرے!

دریاخان دل کی پریشانی میں دوبارہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ دستار کے پیچ ڈھیلے کر پھر سے باندھنے لگا۔ "سلطان کو اور سلطانہ کو مالک سلامت رکھے۔ کیسی اُلجھن کی بات سامنے آئی ہے۔"

دریا نے افانزو کو برتن لے جاتے دیکھا تھا۔ یہ طبیب زادہ اقامت گاہِ سلطانی کے پڑوس میں رہتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سلطان اور سلطانہ کے استعمال کے برتن ہوں جنہیں یہ حرام خور اُس سامری نابکار سے مسموم کرانے لے جا رہا ہو۔ اَللّٰھم احفظنا! فوری طور پر کچھ کرنا اَزبس ضروری ہے۔

دریاخان نے سوچا، اگر زہر ساز کے مکان کا یہی ایک دروازہ ہے (جس کا کہ امکان کم ہی ہے) تو افانزو اُس کے علم کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کوئی اَور دروازہ بھی ہے اور طبیب زادہ یہاں سے نکل کے اپنے شیطانی سامان کے ساتھ سلطانی اقامت گاہ تک پہنچ جاتا ہے تو دریاخان کو کچھ اور کرنا ہوگا ــــ وقت بالکل نہیں ہے۔

تاہم عورت کو مدد دینے پر آمادہ کرنے میں کوئی زیادہ محنت نہ لگی۔ دریاخان نے کہا، "میں تجھے انعام دوں گا۔ اتنا کہ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

بڑھیا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس کا نصیبا پلٹنے میں اب دیر کوئی نہیں۔ بولی، "آغا! حکم کرو، میں حاضر ہوں۔"

دریا بولا، "مجھے اِس مکان کے بارے میں بتا اور زہر ساز کے بارے میں بھی، اور یہ بھی سمجھا دے کہ مکان میں جلد اور خاموشی سے کیوں کر داخل ہوا جائے۔"

لالچ اپنی جگہ، مگر بڑی بی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی۔ اپنا اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ یہ آغا کہیں دیوانِ قانون کا کوئی عہدے دار تو نہیں ہے۔ کہنے لگی، "عالی جاہ! میں بہت غریب مسکین بدحال عورت ہوں۔ کوئی بیٹا نہیں جو اِس عمر میں میری کفالت کرے۔ آپ بے شک انعام اکرام دو

گے، سخی معتبر ہو، لیکن ایک بات قرآن کو بیچ میں لا کے کہو کہ دیوانِ شُرطہ کے الجھیڑے میں تو مجھے نہیں ڈالو گے؟"

دریا نے کہا، "بالفعل دیوانِ شُرطہ بیچ میں آیا بھی تو میں قسم کھاتا ہوں، تجھے گزند نہ پہنچنے دوں گا- وہ لوگ سبھی تجھے انعام ہی دیویں گے- تو بے خدشے میرا ساتھ دے-"

بڑھیا کہنے لگی، "یہ تو کہو تم دیوانِ قانون کے عہدے دار، قاضی سررشتے دار تو نہیں ہو؟"

دریاخان کو اُلجھن ہونے لگی، "اگر ہوا بھی تو تیرا کیا نقصان؟"

بڑھیا بولی، "میرے دس دشمن، دس دوست ہیں- گڑے مردے اکھڑنا شروع ہو گئے تو مجھ غریب کا اللہ ہی والی ہے-"

دریاخان سمجھ گیا تھا کہ خود بڑھیا کے ہاتھ صاف نہیں ہیں اسی لیے ڈرتی ہے- کہنے لگا، "میں سمجھ گیا- لے، میں قسم کھاتا ہوں کہ دیوانِ قانون سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور آج سے پہلے چاہے تُو کچھ بھی کرتی رہی ہو، میں تیری گردن کہیں پھنسنے نہیں دوں گا- بے فکر رہ ــــ پہنچ میری دُور تک ہے-"

"آغا سردار! تمہاری شوکت اور دبدبے کو خدا دس گنا بڑھائے- مجھے یقین آ گیا- لو اب سنو،" کہہ کے بڑھیا ڈھڈّو نے اُس مکان کا احوال بتایا جس میں قہوہ فروش رقیب اس ولایتی جوان اور حبشی حمّال کے ساتھ داخل ہوا تھا- کہنے لگی، مکان کا ایک پچھلا دروازہ بھی ہے جہاں سے وہ دریاخان کو داخل ہونے میں مدد دے گی- اندر کہاں کہاں خطرات ہیں، زہرساز کے آدمی کہاں کہاں پہرہ دیتے ہیں، کس ڈھب کے لوگوں سے اندر واسطہ پڑ سکتا ہے، یہ بڑھیا نے خوب سمجھا دیا- وہ زہرساز کا حلیہ بیان کرنے سے قاصر تھی- بولی، "جنھوں نے اُسے دیکھا ہے وہ بتانا نہیں چاہتے، یا بتا نہیں سکتے- اور وہ نحوست مارا خود کبھی باہر نہیں نکلتا-"

دریاخان نے چاندی کے بیس بائیس سکّے دکان کے تختے پر رکھ کے کہا، "سن، یہ رقم تیرے لیے نہیں ہے ــــ تجھے تو میں اشرفیوں میں انعام دوں گا- یہ سکّے رکھ- مجھے مکان میں داخل کرنے سے پہلے چار پانچ نکمّے شہدے کہیں سے پکڑ لا، انھیں پیسے دے کے یہاں اپنے چبوترے پر بٹھا دے، میری طرف سے قہوہ پلا اور خود بھی سامنے دروازے پر نظر رکھ- پرتگالی افانزو اور اس کا

حمّال یا تیرا حریف قہوہ فروش مکان سے نکلیں تو شہدوں نکموں کو سمجھا دے کہ وہ کوئی فساد کھڑا کر دیں۔ انہیں روک رکھیں، جانے نہ دیں۔ آگے مَیں سنبھال لوں گا۔"

اتنے بہت سے روپے دیکھ کے بڑھیا تو سمجھو غش کھا گئی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا، اس لیے کہ آغا نے اسے طِلائی سکّے انعام میں دینے کو کہا تھا۔

واللہ اشرفیاں! سونے کی مقدّس ٹکیاں! اب تو وہ سامنے والے خبیث کو بندھوا کے ڈلوا دے گی۔ تختے پر جو چاندی پڑی ہے، اس سے دس درجے کم رقموں پر تو بڑھیا نے اپنے بیٹوں بھتیجوں سے کتنے الٹے سلٹے کام کرائے ہوں گے۔ اس آغا کا دکان پہ آنا کیا ہوا کہ سمجھو نصیبے کا بند دروازہ کھل گیا۔

اُس نے دریاخان کی فرغل کا دامن چھوا اور اپنا ہاتھ چوم لیا، "آغا ملک! تمہیں تو کہیں کا حاکم ہونا تھا۔ یہ خدائے کریم، کیا حِکمت سوجھی ہے! میں پلک جھپکتے بازار کے بکھرے شہدوں میں سے دوچار کو پکڑلاتی ہوں۔ اتنی رقم میں تو وہ اس مردود قہوہ فروش کے ٹکڑے کر دیں گے۔"

دریاخان کا منھ بن گیا۔ الجھ کر بولا، "او تیرہ بخت! مجھے کسی کے ٹکڑے نہیں کرانا۔ ان شہدوں نکموں کو سمجھا رکھنا کہ کھینچاتانی اور فضول گوئی سے زیادہ کچھ نہ کریں۔ اور سن لے! مجھے آتا دیکھے تو تُو ان شہدوں کو چلتا کر دیجو۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجرم اگر اِس راہ سے نکل بھاگنا چاہیں تو تیرے نکمے انھیں جانے نہ دیں۔"

بڑھیا مسندِ عالی دریاخان کو گاہکوں کے چبوترے پہ بٹھا کے چلی گئی اور ذرا دیر میں چار مُسٹنڈوں کو گھیر لائی؛ ان میں دو تو اس کے اپنے ہی بیٹے تھے۔ کہنے کو یہ چاروں بازار میں حمّالی کرتے تھے مگر بازاروالے جانتے تھے کہ انہیں حمّالی سے زیادہ پتھر پہ کھڑیا سے لکیریں بنا کے کوڑیوں، ٹھیکروں سے کھیلنا اور بہلیوں، بوروں، ٹوکریوں سے گرا پڑا سامان سمیٹ کے چل دینا ہی آتا تھا۔ کسی باحیثیت رہ گیر کو تاک لیتے تو دائیں بائیں دیکھ کے دستِ سوال بھی دراز کر دیتے تھے۔ ایک بار دیوانِ قانون کے اہل کار اُس کے اِن بیٹوں بھتیجوں کو جرمِ گداگری میں کھینچ کے لے جا بھی چکے تھے۔ مختصر یہ کہ چاروں اس قابل تھے کہ ثبوت، شہادت، گواہوں، استغاثوں کے بغیر ہی سلطانی جلّادوں کے ہاتھوں مارے جاتے تو انسب تھا۔

خیر، شہدوں نے صدر دروازے کی نگرانی شروع کر دی اور بڑھیا دریاخان کو مکان کا عقبی راستا سمجھانے لے چلی۔

پچھواڑے گلی کا عجب حال تھا۔ مکان دار کی بے توجہی سے یا شاید جان بوجھ کے چھوڑی گئی خودرُو گھاس اور اونٹ کٹارا جھاڑیوں کی وجہ سے گلیارا جیسے جنگل بیابان ہو رہا تھا۔ خودرُو درخت قدِ آدم سے زیادہ بلند تھے اور بہت گھنے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ پتوں شاخوں کے پیچھے مسلسل دیوار ہے کہ کوئی دریچہ، روشن دان یا موکھا ہے۔ گلیارے میں سناٹا تھا۔ دریاخان اور بڑھیا کسی خرخشے کے بغیر مکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسی دوران دیوار کے برابر اُگے پیپل کے ایک اَدھ کچرے درخت کے پاس بڑھیا جا کھڑی ہوئی اور اشارے سے بتانے لگی تو دریاخان کو پتوں کے جمگھٹے اور جھاڑ جھنکاڑ کی اوٹ میں ایک بڑا سا دریچہ نظر آیا۔ بڑھیا اگر اشارہ نہ کرتی تو دریاخان نکلا چلا جاتا؛ دریچہ اسے ہرگز نظر نہ آتا۔ اس جگہ فرشِ زمین پر گھاس بھی جیسے تہ در تہ اُگی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے اشارے سے بانس کی ایک سیڑھی بھی دکھائی جو گھاس میں چھپی پڑی تھی۔ کہنے لگی، "دریچہ اندر باہر سے کھلا رہتا ہے۔ کیا خبر کب ان بدنہادوں کو بھاگنا پڑے۔ آغا! تم بلاتامل مکان میں اُتر جاؤ۔"

دریا نے سیڑھی لگا کے دیکھا، دریچہ پرانی مگر مضبوط لکڑی کا بنا تھا۔ پٹوں کی سانکل کاری لوہے کی موٹی چھڑیوں، سانکلوں سے ہوئی تھی۔ بند کرنے کو ایک کنڈا سانکل باہر کو ایک اندر کو لگا تھا۔

دریا نے بڑھیا سے کہا، "سن، میں جاتا ہوں۔ تُو صدر دروازے کا خیال رکھنا۔"

وہ خوش ہو کے بولی، "جی آغا!" اور جانے کو ہوئی۔

دریاخان بولا، "ٹھیر تو نیک بخت! میں اندر اُتر جاؤں تو باہر سے تُو دریچے کے پٹ بند کر کے کنڈا چڑھا دینا۔"

وہ بولی، "کیا فرماتے ہو؟" بڑھیا کو یقین نہ آیا کہ جو کچھ وہ سن رہی ہے، وہ وہی ہے جو آغا چاہتا ہے — ایسے پُرخطر مکان میں خود کو اس طور بند کر لینا کہ صدر دروازہ مسدود ہو تو ان قاتلوں سے بچ نکلنے کی کوئی اور صورت نہ رہے۔ یقیناً بڑھیا کے سننے سمجھنے میں فرق ہے۔ کون ایسا پاگل ہو گا جو اس مکان میں بند ہونا چاہے گا۔ پوچھنے لگی، "کیا فرمایا؟ پھر کہو آغا۔ تمھارا حکم کس طرح

ہے؟"

دریاخان جو چاہتا تھا اس نے پھر بتا دیا۔ عورت کو شک سا ہوا کہ یہ حاکم آسیب مارا یا سرٹی دیوانہ ہے۔ یہ اگر بند ہو گیا اور مارا گیا تو بڑھیا کے انعام کی اشرفیاں تو سمجھو گئیں۔ وہ دریاخان سے حجت کرنے پہ تُل گئی۔ خان چڑ گیا۔ کہنے لگا، "نیک بخت! بے کار باتیں نہ بنا۔ میں ملک التجار نہیں، سپاہی ہوں۔ غلط کاروں کی گرفت کرنے کا فوری اور سادہ طریقہ اختیار کرتا ہوں، یعنی گھیر کے اور تلوار کے ذریعے۔" پھر اس نے کمر سے تلوار کھینچ ہاتھ میں لے لی۔ بڑھیا کو اشارہ کیا اور سیڑھی چڑھ کے مکان میں اتر گیا۔

قہوہ فروش بڑھیا کیا کرتی ـــ اُس نے اِس مخبوط الحواس آغا کو اِس خطرناک مکان میں، سمجھو سانپوں بچھوؤں بھری بانبی میں، بند کر دیا۔

مسندِ عالی دریاخان حجاب دار کوئی لڑکا بالا نہیں تھا جو اِس نحوست آثار مکان کی ویرانی، بے رونقی سے وحشت زدہ ہو جاتا۔ وہ ایک پختہ کار سپاہی، درجنوں معرکے، سینکڑوں لڑائیاں جھیلا ہوا سردار تھا، جس نے دربار دیکھے تھے، انہیں برتا تھا۔ کتنے ہی دریاؤں، ندی نالوں کو کبھی تیر کے کبھی کشتی ناؤ سے کبھی اصیلوں کی پشت پر عبور کیا تھا۔ جنگل بیلے راتیں گزاری تھیں۔ لاشوں کے انبار دیکھے اور خود بھی کشتوں کے پُشتے لگائے تھے۔ اس نے عالی مرتبت سرداروں سے لے کے آدھے دام کی چادر چُرانے والوں تک کے معاملات فیصل کیے تھے۔ تاہم عجیب بات تھی کہ اس وقت اِس مکان میں وہ بے کیف ہو رہا تھا۔

دریچے سے مکان میں پہنچنے کے بعد ہی سے دریا نے خود کو نفرین کرنا شروع کر دیا تھا کہ یہ مَیں خود کو کہاں لے آیا۔ وہ ایک اچھا منتظم تھا اور اِس بات پر برہم تھا کہ اُس نے اِس قضیے میں کوڑی بھر فراست کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ جوں ہی اُس نے دیکھا تھا کہ افانزو دیوانِ قانون کے اہل کاروں سے چھپ رہا ہے، اُسے بڑھ کے افانزو کی گدّی ناپ دینی چاہیے تھے۔ بہر حال، جو ہوا۔

جس نحوست نشان کمرے میں اِس وقت کھڑا دریاخان باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہا تھا، اُس میں چوکور پتھروں کا شطرنجی فرش بنا تھا جس میں جگہ جگہ دراڑیں پڑی تھیں۔ مہینوں برسوں کا میل کچیل اِن دراڑوں میں بھر گیا تھا۔ فرش پر گرد کی تہہ جمی تھی اور اِدھر اُدھر سے اُڑ کے

آنے والے سوکھے پتّوں کے ڈھیر لگے تھے۔

باہر دالان کی طرف سے کوئی آہٹ سنائی نہ دی تو دریا دبے قدموں دالان میں نکل آیا جو خاصا چوڑا تھا۔ یہاں بھی فرش پتھر کی سِلوں سے بنا تھا۔ صحن کے رُخ پتھر کی جالیوں سے بنائی گئی ایک نیم قد دیوار تھی۔ جالیاں وقت کے ساتھ ٹوٹ گئی تھیں تو ان پر بھی زمانے کی گرد جمی تھی اور جالے لگے تھے۔ صحن کا حال اُس گلیارے سے کچھ بہتر نہ تھا جسے دریاخان مکان کے پچھواڑے بھگتا آیا تھا۔ صحن میں اُگے جامن، پیپل اور نیم کے پیڑوں پر گرگٹوں اور کیڑے مکوڑوں کی اجارہ داری تھی۔ وہاں کہیں پتھر کا فرش نظر آتا تھا، کہیں کمر کمر گھاس اگی تھی۔ دریا کو یقین تھا کہ آنگن کی جھاڑیاں اور گھاس پھونس سانپوں بچھوؤں سے پٹے پڑے ہوں گے۔ اُس نے گھن اور نفرت کی پھریری لی۔ وہ حملہ کرتے شیر کا سامنا کرنے کو ہر وقت تیار تھا مگر رینگتی ہوئی چیزیں اور سرد خون والے سرسراتے ہوئے لجلجے جانور ــــ خدا محفوظ رکھے!

اچانک سامنے دالان میں آواز کے ساتھ دھات کی کوئی چیز آ گری۔ دریاخان کو اگلے کمرے سے کسی کے غصّے سے چینخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً اس کمرے میں چلا گیا جس سے ہو کر صحن میں آیا تھا۔

دروازے کی اوٹ سے اُس نے دیکھا کہ بکری سے بڑا ایک جانور اُچھل کے دالان میں آیا ہے۔ دریاخان نے ایسا چوپایہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اِس کے بدن پر بکری جیسے بال تھے جن کا رنگ گدلا سفید اور بادامی تھا۔ پچھلی ٹانگوں کے مقابلے میں اگلی ٹانگیں بڑی تھیں اور چلتے وقت یوں لگتا تھا کہ اِس کی کمر یا پچھلی ٹانگیں کبھی توڑ دی گئی تھیں جو پھر صحیح طریق پر جڑ نہیں پائیں۔

یہ جانور جو کتّے اور سیار کی نسل کا تھا، ایک بار غصّے سے کھنکھارا ــــ یا شاید یہ اِس کی ہنسی کی آواز تھی۔ دریا کو یقین تھا کہ یہ شیطانی جانور اندر کمرے میں کوئی شیطانی کام کر کے آیا ہو گا جس پر آدمی نے پھینک، کے اِسے کچھ مارا ہے اور اب یہ اُس پر ہنستا ہے۔ دریاخان حجاب دار نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی اور تلوار کے قبضے پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ اگر یہ منحوس چوپایہ ہنستا ہوا اِس طرف آیا اور اِس نے کمرے میں دریاخان کی بُو سونگھ لی یا اُسے دیکھ کے حملہ آور ہوا، تو دریا

نے حساب لگایا کہ پہلا وار اِس کے سر پر کیا جائے گا تا کہ یہ ختم ہو جائے اور دوسرا وار اس کی ٹوٹی ہوئی کمر یا پچھلی ٹانگوں پر کیا جائے گا تا کہ بعد میں بھی یہ ابلیس آثار چلتا ہوا قریب نہ آسکے۔ اس کی منحوس ساخت ـــ بالوں کا گھناونا رنگ اور اس کی نفرت انگیز ہنسی بتا رہی تھی کہ اِس طرح کی چیزیں مرنے کے بعد بھی آگے بڑھ کے اپنے مارنے والے پر حملہ کر سکتی ہیں۔

دریاخان پھر ایک بار بڑبڑایا کہ "پناہ بہ خدا! یہ میں کس شیطانی طلسم میں آگیا ہوں۔"

جانور کی ہنسی ابھی جاری تھی کہ ایک آدمی جھپٹ کے کمرے سے نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی لمبی سی لکڑی تھی جو اُس نے چوپائے کی کمر پر ماری۔ اُچٹتی سی چوٹ لگی ہو گی جو جانور ہنستا ہوا بھاگا اور دالان کی ٹوٹی ہوئی جالی سے نکل کر صحن کے جھاڑجھنکاڑ میں غائب ہو گیا۔ دریا نے سنا، وہاں وہ اپنے کسی بھٹ میں چھپا، دبی ہوئی ہنسی ہنسے جا رہا تھا۔

عجیب الخلقت چوپائے کا پیچھا کرنے والے نے بڑبڑاتے ہوئے جھک کر فرش سے دھات کی وہ چیز اٹھائی جو اُس نے چوپائے پر پھینکی تھی۔ یہ بڑا سا کف گیر تھا۔ کف گیر اور جلتی ہوئی لکڑی اٹھائے وہ شخص بڑبڑاتا ہوا لوٹ گیا۔

بڑھیا کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق یہ باورچی ہو گا اور باورچی خانے میں گیا ہو گا۔ دریاخان کے ذہن میں مکان کا نقشہ بنتا جا رہا تھا۔ آگے خادموں کے کمرے ہوں گے، جس کے بعد زینہ ہو گا جو اوپر مہمان خانے کو جاتا ہے۔ بڑھیا کے خیال میں افانزو کو مہمان خانے میں ہونا چاہیے۔

دریاخان کو جب اطمینان ہو گیا کہ باورچی اب واپس نہیں آئے گا تو وہ نکلا اور دبے قدموں دالان میں چلتا اُس کمرے کے آگے پہنچا اور اُس دَر کے سامنے سے گزرا جس سے وہ جہنمی چوپایہ کھنکھارتا تمسخر کرتا برآمد ہوا تھا۔ یہاں خادموں کے کمرے تھے جن میں سے بعض مقفّل نظر آئے۔ ایک سے اس نے کسی مرد کے کھانسنے کی آواز سنی۔ جھانک کے دیکھا کہ جو کھانستا تھا، گودڑ بستر پہ چادر لپیٹے پڑا ہے۔ سانس لینے کے ہموار انداز سے پتا چلتا تھا کہ سو رہا ہے۔ دریاخان رسانیت سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے سوچا، قدرت نہیں چاہتی کہ یہ اجل گرفتہ بدمعاش میرے ہاتھ سے مارے جائیں۔ ویسے بھی اِس قبیل کے لوگوں کے خون سے اپنی تلوار ناپاک کرنا مناسب نہیں۔ ایسے غلط کار تو جلّادوں کے لیے ہوتے ہیں۔

وہ سیڑھیوں تک جا پہنچا تھا۔ اوپر فرش پر لکڑی جڑی تھی اور فرش اور سیڑھیوں پر سستے پچہ مزدوروں کے ہاتھوں بنوائے ہوئے کھُردرے بھدّے قالین پڑے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کے دریاخان نے سب طرف نظر دوڑائی۔ دُور تک کوئی نہیں تھا مگر وہ ٹھٹھک گیا۔ اگر یہ وہم نہیں ہے تو اُسے ایک جوان عورت کی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ وہم نہیں تھا ــــ کچھ دیر بعد اُسے پکھاوج کی گمک اور تان پورے کی ترنگ سنائی دی۔ عورت پھر ایک بار ہنسی۔ وہ ابھی ہنستی تھی کہ سارنگی کی دل گداز آواز جیسے بَین کرتی ہوئی چلی۔ بجانے والوں نے کوئی حُزنیہ دُھن شروع کر دی تھی۔ عورت کی ہنسی ڈوب گئی۔

ربّ العالمین! یہ اُس منحوس سامری کا کارخانہ ہے کہ کسی گانے بجانے والی کا مکان؟ یہ تو موت کے سوداگر ہیں، یہاں گانا بجانا یعنی چہ؟ سازوں کی آواز ہلکی ہوئی تو عورت نے بھرپور قہقہہ مارا۔ بڑی کھُل کھیلتی ہوئی آواز تھی ــــ طےشدہ طور پر بازار کی آواز۔ اب ایک مرد نے گھوں گھوں کرتے ہوئے کچھ کہا۔ الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے، تاہم بولنے والا ٹھہر ٹھہر کے بولتا یا لکنت کرتا معلوم ہوتا تھا۔ عورت مرد دونوں نے قہقہہ لگایا۔ بڑھیا کے بتائے ہوئے نقشے کے حساب سے یہ آوازیں مہمان خانے سے آ رہی تھیں۔ "اگر مہمان خانے میں افانزو ہے تو مجھے پہلے اسے قابو میں کرنا ہوگا۔"

دریاخان ابھی کوئی مفصّل حکمت عملی تیار نہ کر سکا تھا کہ مہمان خانے سے زوروشور سے ساز بجانے کی اور گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اِس بار کوئی طربیہ دُھن بجائی جا رہی تھی۔ گانے والی کسی اجنبی زبان میں گاتی تھی۔ حیرت ہے، بڑھیا نے ایسا تو کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ یہاں گانے بجانے والے بھی رہتے ہیں۔ خیر، ہو سکتا ہے صاحبِ خانہ مہمانوں کی تواضع اِس طرح کرتا ہو۔

دریاخان کمرے کے ٹوٹے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دروازے سے کمرے کا خالی حصّہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک بے حیثیت قالین جگہ جگہ سے پھٹا اُدھڑا ہوا کمرے کے فرش کو چھپائے تھا۔ دریا کو چھپرکھٹ کا ایک پایہ بھی دکھائی دیا۔ ابھی تک سوچا آدمی کوئی نظر نہ آیا تھا۔ ایک پرانے چوبی تخت کا سرہانا ضرور دکھائی دے رہا تھا جس پر میلے چیکٹ گاؤتکیے رکھے تھے اور تکیوں سے ٹیک لگائے ایک عورت بیٹھی سارنگی بجاتی تھی۔ اُس کی صرف پشت دکھائی دیتی تھی۔ عورت کسی

طرح کا جھرجھرا، جھینا لباس پہنے تھی، جس کے پار سے نیچے پہنے مرمر کا رنگ، ساخت اور ڈوریاں تک نظر آ رہی تھیں۔ برابر ہی پکھاوج بجانے والی تھی جس کا آدھا چوتھائی چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں اُجلی رنگت کی جوان عورتیں تھیں۔

دریاخان ابھی ساز بجانے والیوں کا جزوی منظر دیکھتا تھا کہ اندر کمرے کی دیوار پر اُسے چمک سی دکھائی دی۔ پردہ ہلا تھا۔ اُس نے کھلایا ہوا سا قدِ آدم آئینہ دیکھا۔ آئینے پر دو عکس واضح تھے۔ چھپر کھٹ کے تکیے سے ٹیک لگائے افانزو پیالہ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اور اُس سے بالکل بھڑی ہوئی اُجلی رنگت کی ایک جوان عورت بیٹھی تھی جس کی آنکھیں سبز اور بڑی بڑی اور سُرمے سے سنواری ہوئی لگتی تھیں۔ یہی عورت تان پورا اٹھائے گا رہی تھی۔ افانزو کی توجہ اس کے گانے پر نہیں تھی۔ وہ اُس کے لباس کی سلوٹوں میں جیسے کچھ ڈھونڈتا تھا ــــ حرام الدّہر، بدمعاش!

اس نےــــ دریاخان نے ــــ یہ سب دیکھا اور سوچا، یہاں دارالحکومت میں، اقامت گاہِ سلطانی کے بہرحال نزدیک ہی، یہ کیا ہو رہا ہے؟

اُس نے سوچا، دیوانِ شرطہ کو کیا ہوا؟ کیا سب پرچہ نویس اور مخبر نااہل ہو گئے؟ یا وہ بددیانت ہیں؟

مگر سوچنے کی بات ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ پرتگالی افانزو اپنے مزاج کے مطابق لطف و تفریح کے لیے یہاں آتا رہتا ہو اور میں ایک غیر ضروری محتسب اور مداخلت کار کی طرح اس کی تفریح اور خلوت میں کھنڈت ڈالنے یہاں گھس آیا ہوں؟ مجھے کیا! بہت کروں گا تو ایک تحریری بیان دیوانِ قانون کو ارسال کر دوں گا کہ فلاں فلاں جگہ شراب نوشی کا اہتمام شاید کسی ضابطے، اجازت نامے کے بغیر کیا جاتا ہے، اور ایسی ایسی سرگرمیاں جاری ہیں۔ باقی وہ جانیں، اُن کا کام۔

دریاخان حجاب دار ابھی یہیں تک سوچ پایا تھا کہ اُس نے ایک بہت ہی بھیانک دھماکا سنا ــــ مگر نہیں یہ دھماکا اُس کے سر میں ہوا تھا۔ اُس نے گھوم کے دیکھنا چاہا، گھوم نہ سکا۔ کوئی کند چیز پھر اس کی کنپٹی پر آ لگی، اور کوشش کے باوجود دریا خود کو اپنے پیروں پر کھڑا رکھنے میں ناکام ہوا۔

وہ تیورا کر گرنے لگا تو دائیں بائیں سے نکل کے آگے آنے والے پانچ سات شہدوں نے

اُس بلند قامت سردار کو سنبھالا اور اُسے اٹھائے ہوئے برابر کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ افانزو کی مے نوشی، اُس کا بے محابا تجسس اور گدگدائی گئی عورت کے فحش قہقہے جاری رہے ـــ ساز وغیرہ بھی بجتے رہے۔

آنکھ کھلی تو دریا نے دیکھا کہ اُسے پلنگ پر لٹا کر مضبوط رسّوں کی مدد سے اِس طرح باندھا گیا ہے کہ اُس کے لیے ہلنا بھی ممکن نہیں۔ سر اُس کا بہت بُری طرح درد کرتا تھا اور بھوک کسی درندے کی طرح بدن کے بیچ بیٹھی اُسے بھنبھوڑے ڈالتی تھی۔

"معاذاللہ! کیا تباہی ہے! غذا کے سوا دماغ کچھ بھی سوچنے سے انکاری ہے۔" پھر بھی غصّے کی ایک لہر نے دریاخان کے بدن میں غیر معمولی طاقت بھر دی۔ اُس نے زور لگا کے رسّیاں تڑانا چاہیں۔ "اگر ابھی اس بندش سے آزاد ہو جاؤں تو اِن حرام خور غلط کاروں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔ وہ تعداد میں بیس ہوں یا پچاس، مجھ پر ان بے ادب نافرجاموں کو سزا دینا لازم ہے۔ غضب خدا کا! رہزنوں، حرام خوروں نے مجھے اپنی لاٹھیوں سے زدو کوب کیا؟ مجھے؟ دریاخان کو؟"

مگر فوراً ہی اُسے یاد آیا کہ یہ رَہ زنی کی واردات نہیں۔ دریاخان آپ ہی اِس گھر میں چوری سے داخل ہوا ہے۔ مملکت کے قانون کے مطابق اجازت کے بغیر گھر میں اِس طرح داخل ہونا جرم اور قابلِ مواخذہ ہے۔ "پھر بھی... پھر بھی غور طلب بات یہ ہے کہ ان بدقماشوں نے مجھے زدو کوب ... مگر نہیں مجھے اصل بات یاد رکھنی چاہیے... اصل بات یہ ہے کہ پرتگالی طبیب زادے کی مدد سے یہاں کوئی سازش تیار ہو رہی ہے۔ شاید میرے سلطان یا سلطانہ کے خلاف۔ ایسی صورت میں اپنے مرتبے اور عہدے کی رُو سے مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں اِس گھر میں ـــ یا کسی بھی گھر میں جہاں سازش ہو رہی ہو، بہ زور یا بہ حکمت داخل ہو جاؤں اور مجرموں سازشیوں کا حساب لوں۔ مگر ناں ناں ناں، یہ بات تو مجھے کسی کے سامنے کہنی ہی نہیں ہے۔ جہاں سلطان یا سلطانہ کے نام آجاتے ہیں، ہر درباری عہدے دار کو وہاں بہت محتاط ہونا پڑتا ہے۔ یہ سازش والی بات تو کسی کے سامنے کہنی ہی نہیں ہے۔ تو پھر کیا کہا جائے؟ ہاں! مجھے کہنا چاہیے کہ اصل میں مَیں ملک التجار ہوں۔ مشرق، جنوب یا شمال سے آیا ہوں۔ کسی سے سنا تھا کہ یہ سامری موثر زہر تیار کرتا ہے۔ بس آگھسا۔ آگے پھر وہی کہانی نافرمان کنیز والی، جو میں نے قہوہ فروش بڑھیا کے لیے تیار کی تھی۔"

دریاخان ابھی تک اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ لوہا چڑھی جریب اٹھائے ایک کریہہ صورت غلام کمرے میں آ گیا۔ کمرہ کیا تھا، یہ جگہ کسی تہہ خانے کا خالی ڈھنڈار حصّہ لگتی تھی۔ اِدھر اُدھر بے کار سامان پھیلا پڑا تھا۔ غلام نے آتے ہی پُرشور انداز میں ایک پرانا صندوق کھینچ لیا اور صندوق پر بیٹھ کر وہ سکون سے لاٹھی ٹیک، فرش کو ایسے دیکھنے لگا جیسے خاص اِسی کام کے لیے آیا ہے۔

دریاخان نے غلام کو مخاطب کیا، "او نامراد! مجھے کھول۔ ایسے کیوں بیٹھ گیا؟ مجھے کھول، اپنے مالک کے پاس لے چل۔"

جریب والے غلام نے جیسے اَن سنی کر دی، بے تعلق بیٹھا رہا۔

"خبیث غلام زادے! مجھے کھول دے۔ سنتا ہے؟ مجھے کھول، ورنہ تیرے ساتھ بہت بُری ہو گی۔"

غلام نے پلک تک نہ جھپکائی۔

"تیرا مالک کہاں ہے؟ اُسے بلا اور مجھے آزاد کر۔ کیا کہہ رہا ہوں، سنا کہ نہیں؟"

غلام نے جماہی لی اور نیم وا آنکھوں سے دریاخان کو دیکھا، بے تعلقی سے مسکرایا اور پھر لاٹھی کی ٹیک لگائے فرش کو تکنے لگا۔

دریاخان غصّے کی بے بسی میں چیخ کے بولا، "او بدانجام! لعنت ہو تجھ پر! ایسا بیٹھا ہے جیسے بہرا ہو، خبیث۔"

عقب سے ایک نرم مردانہ آواز نے ستھرے لہجے میں کہا، "آپ نے ٹھیک فرمایا، وہ بہرا ہے اور گونگا بھی۔"

دریا نے سر گھما کے دیکھنا چاہا، مگر بالکل عقب میں دیکھنا ممکن نہ تھا۔ جھنجھلا کے اُس نے مطالبہ کیا، "سامنے آؤ۔ کون ہو تم؟"

"آغا پہلے اپنا تعارف کرائیں گے۔ صاحبِ خانہ سے متعلق ہونے کے سبب یہ حق میرا ہے کہ میں آپ سے سوال کروں ـــــ بتائیے، کون ہیں آپ؟" بولنے والے کا تپاک واضح طور پر مصنوعی تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی دریاخان مشتعل ہو گیا۔ "ذلیل غلام زادے کی بے ضابطہ اولاد! مجھے کھول

دے ــــ پھر میں بتاؤں گا کہ کون ہوں۔"

"چچ چچ، چچ چچ ــــ آغا! آغا!" بولنے والے نے بہت نرمی سے ملامت کی۔ کہنے لگا، "آغا! یہ بدکلامی آپ کی شان کے شایان نہیں۔"

"تُو کون ہے۔ سامنے آ۔"

"ناں ناں۔ پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں گے۔"

جیسا کہ سوچ کے بیٹھا تھا، دریاخان نے بتایا کہ وہ شمال سے آیا ہے، مسالوں کا تاجر ہے اور اُس "ملعون" سے ملنا چاہتا ہے جو گھر میں بیٹھا ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کیا کرتا ہے۔

عقب سے بولنے والا ہنسا، "اُس ملعون سے ملنے کیوں آئے ہو؟"

"یہ میں اُسی کو بتاؤں گا۔"

"مجھے بتا دو۔ میں تمھاری بات اُس تک پہنچا دوں گا۔"

بس یہ دریاخان حجاب دار نے وہی کنیز سے نجات حاصل کرنے والی بات کہہ دی اور جب اُس نے پوچھا کہ مکان میں اِس طرح داخلے کی ضرورت کیوں پیش آئی تو کہہ دیا کہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ زہرساز سامری کے سبھی خادم رشوت خور بے دین ہیں، پیسے لے کر بھی مجھے اُس سے نہیں ملنے دیں گے۔ اِس لیے مکان میں پوشیدہ طور پر داخل ہوا ہوں۔ جب اُس نے سوال کیا کہ داخلے کا یہ رستا اُسے کس طرح معلوم ہوا تو دریا کو بوڑھی قہوہ فروش کا ذکر کرنا پڑا۔ پوچھنے لگا، بوڑھی کو تم کب سے جانتے ہو، تو بولا، "آج پہلی بار اُس کی منحوس شکل دیکھی ہے۔"

"یعنی پہلے اس بوڑھی سے معاملت نہیں رہی؟"

دریا نے کہا، "نہ۔"

"تو پہلے کس سے معاملت رہی تھی؟ ــــ اُس دوسرے قہوہ فروش سے؟"

"ہاں۔"

"اُس سے کس نے ملوایا تھا؟"

"ایک تاجر نے۔"

"نام؟"

"تُو تاجر کا نام پوچھتا ہے یا اُس حرام زادے قہوہ فروش کا؟"

عقب سے بولنے والا ہنسا، "اُس حرام زادے کا نام ہی بتا دو۔"

دریاخان نے منہ پر کف لا کر غصّے کی آواز نکالی۔ اِس طرح کے سوال جواب اُسے مشتعل کر دیتے تھے۔ تاہم پوچھنے والے نے اپنے نرم مصنوعی لہجے میں پوچھا، "اگر اُسے ___ قہوہ فروش کو یہاں بلوائیں تو وہ تمھیں پہچان لے گا؟"

"کیوں نہیں،" دریاخان نے درشتی سے کہا۔ "کیسے نہیں پہچانے گا۔ اُس نامنجار کو بھی تو پیسے کھلائے ہیں۔"

وہ ہنستا ہوا سامنے آ گیا۔ شکایتاً کہنے لگا، "تم ایسے سردار کو جھوٹ پہ جھوٹ بولتے دیکھ کے مجھے خِفت ہو رہی ہے آغا!" دریا نے دیکھا، یہ وہی قہوہ فروش تھا جو افازو کو مکان میں لایا تھا۔

دریا نے پھر غصّے کی آواز نکالی۔ کہا کچھ نہیں۔

قہوہ فروش نرمی سے بولا، "ہم تو سبھی کے خادم ہیں ___ اب کہو، حکم کرو۔"

دریاخان کا اصرار تھا کہ اُسے کھول دیا جائے اور فی الفور صاحبِ خانہ سے ملوا دیا جائے۔ قہوہ فروش پوچھتا تھا، اِس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دریاخان اِشتعال میں آ کر خود اُسے یا صاحبِ خانہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟

اسی حیص بیص میں بہت وقت گزر گیا۔

بالآخر طے پایا کہ دریاخان کلام اللہ کو گواہ کر کے اور اپنی تلوار کی قسم کھا کے اقرار کرے گا کہ گھر والوں کے پُرامن رہتے خود پُرامن رہے گا اور نہ قہوہ فروش پر اور نہ صاحبِ خانہ پر حملہ کرے گا، سکون کے ساتھ اپنا مدّعا بیان کرے گا، پھر مہمانوں کی طرح رخصت ہو جائے گا۔

اب جب کہ باہمی سلامتی کا معاہدہ طے پا گیا تھا تو قہوہ فروش کا انداز یکسر بدل گیا، گھگھیا کر بولا، "عالی جاہ! یہ غلام اپنے اہل کاروں کی جانب سے معافی کا خواستگار ہے اور خود اپنی طرف سے بھی سو ہزار دفعے معافی مانگتا ہے۔ کیا کریں عالی مرتبت! ہمارا کام ہی سرا سر بُرا ہے۔ پھر حضور جو اچانک عقبی راستے سے تشریف لے آئے تو..."

دریاخان نے کہا، "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

مگر قہوہ فروش بے رُکے بولے جارہا تھا کہ حضور اُس بڑھیا ڈھڈو ہی کو پابند کر دیتے ـــ وہ دستک دے کے کسی کو بلا لیتی- میری تو کیا اوقات ہے عالی جاہ! واللہ باللہ خود صاحبِ خانہ پیشوائی کو آتا- اور یہ کہ توبہ توبہ کیسی تقصیر ہوئی ہے ہم غلاموں سے...

دریا خاں مُحّاب دار جھنجھلا گیا- بولا، "چل چل، اَور باتیں نہ بنا بے غیرت، اب ہمیں کھول بھی دے-"

"حاضر حاضر،" کہتے ہوے قہوہ فروش رسّیاں کھولنے لگا- گونگے بہرے جریب بردار نے بھی اُس کا ہاتھ بٹانا شروع کیا- پلنگ سے کھول دینے کے بعد دونوں بدمعاشوں نے مستعدی سے دریاخان کے ہاتھ پیر سونت کر دورانِ خون بحال کیا- دریاخان کی پاپوشیں، کمر سے باندھنے کا دوپٹا، دستار کا جیغہ، رقم والی چمڑے کی تھیلی ـــ غرض ہتھیاروں کے سوا تمام سامان سامنے لا رکھا- قہوہ فروش نے دریا کو اپنے ہاتھ سے پاپوشیں پہنائیں، دوپٹا باندھا، دونوں ہاتھوں پر رکھ رکھ کے سب چیزیں دیتا رہا، مگر جب اُس نے ہتھیار طلب کیے تو کھیسیں نکال کے بولا کہ عالی مرتبت ہم تو بڑے کم زور بے حیثیت لوگ ہیں؛ حضور کے ہتھیاروں کو ایک بار ہاتھ لگانے کی جسارت تو جیسے تیسے کر گزرے تھے، اب ہمت نہیں کہ دوبارہ ہاتھ لگاویں- عالی مرتبت جب مکان سے تشریف لے جاویں گے تو وہیں ڈیوڑھی میں تخت پوش کے گدیلوں پہ دونوں ہتھیار رکھے ملیں گے؛ سرکار اپنے دستِ مبارک سے پہن لیجیے گا-

دریاخان اِس حرام الدّہر چاپلوس کی باتیں خوب سمجھ رہا تھا- ظاہر ہے جب تک دریا اِس مکان میں ہے وہ لوگ اسے غیر مسلح ہی رکھیں گے- برا سا منھ بنا کر بولا، "چل ـــ اِس منحوس تہ خانے سے تو نکل-"

الغرض آگے آگے قہوہ فروش چراغ اٹھائے ہوے رستا دکھاتا، پھر دریاخان، اور آخر میں گونگا بہرا غلام، یہ چھوٹا سا جلوس ناہموار سیڑھیاں چڑھتا ہوا تہ خانے سے نکلا اور ایک کچے صحن میں پہنچ گیا- یہاں کہیں ہاتھ ہاتھ بھر اونچی گھاس تھی اور کہیں بے ترتیب قطعوں میں گھناونے رنگوں اور نامانوس شکلوں کے پھولوں پتّوں سے ڈھکی جھاڑیاں تھیں جن کی شکل وصورت اور بد بو ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ زہریلی جڑی بُوٹیاں سامری منحوس کی زہر سازی میں کام آنے والی چیزیں

ہیں۔

دریاخان نے اوپر کہیں ساز بجنے کی آواز سنی۔ پرتگالی افانزوا بھی تک اپنی مے نوشی اور جشن میں مصروف تھا۔ دریا نے قہوہ فروش کی طرف دیکھا۔ "یہ کون لوگ ہیں جنھوں نے دن کے اوقات میں رات کی مصروفیات جاری رکھی ہیں؟"

قہوہ فروش نے کوئی جواب نہ دیا؛ خوشامد سے ہنسنے لگا۔

دریا بولا، "میں انھی نافہم لوگوں کو دیکھنے بڑھا تھا جو تیرے آدمیوں نے عقب سے حملہ کر دیا۔"

قہوہ فروش بولا، "غلام کو اَور شرمندہ نہ کیجیے عالی جاہ!"

دریاخان نے منھ بگاڑ کے کہا، "تیری شرمندگی میرے سر کا درد دُور نہیں کر سکتی۔"

وہ بولا، "یہ حقیر اپنے استاد سے سردرد کی کوئی زُود اثر مجرّب دوا لے کر حضور کو پیش کر دے گا۔"

دریاخان نے پریشان ہو کر ہاتھ بلند کیے، "پناہ بہ خدا! تیرے استاد کی مجرّب دواؤں سے خدا بچائے رکھے۔"

قہوہ فروش خوش دلی سے ہنسا، بولا کچھ نہیں۔

جڑی بوٹیوں والے صحن سے بچ بچا کر گزرتے ہوے یہ تینوں ایک اَور ویران دالان میں پہنچے۔ ہرچند یہ جگہ صاف ستھری تھی مگر بےرونق اُتنی ہی تھی جتنا گھر کا کوئی بھی حصہ۔ دالان سے ایک سنگی زینہ اوپر گیا تھا۔ زینے پر موٹی بانات کی دری بچھی تھی۔ ایک اَور لٹھ بند یہاں اپنی جریب سے ٹیک لگائے ڈھیلاڈھالا کھڑا تھا ــــ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر مستعد ہو گیا۔ دونوں خادم دالان ہی میں رہے۔ دریا اور قہوہ فروش چڑھتے چلے گئے۔

کئی طرح کے دروازوں سے گزرتے، دالانوں کو پار کرتے یہ دونوں ایک دُہرے کمرے میں پہنچے اور ایک بھاری بھرکم دروازے کے سامنے جا رکے۔ قہوہ فروش نے دستک دی۔ جواب میں اندر سے کسی نے کچھ پوچھا۔ قہوہ فروش نے کچھ کہا جس پہ دروازہ کھول دیا گیا اور قہوہ فروش کو بلا لیا گیا۔

دریاخان کو انتظار کرنا پڑا۔ آخرکار قہوہ فروش اور ایک بلند قامت چوب دار کمرے سے برآمد ہوئے۔ چوب دار باہر رہ گیا، قہوہ فروش دریا کو لے تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر مکمل تاریکی تھی۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو دریاخان کو کمرے کے صدر میں بچھی ایک بھاری بھرکم کرسی میں ایک ہیولا بیٹھا دکھائی دیا۔ یہ پستہ قد منحنی آدمی اس بڑی کرسی میں سامنے کے رخ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ ایسی نشست کے باوجود اس کا پورا سراپا کرسی میں سما گیا تھا۔ کچھ کرسی بڑی ہو گی، کچھ یہ چھوٹا تھا۔ آدمی کے اس ہیولے نے پیروں میں زرکار پاپوشیں پہن رکھی تھیں جن میں شاید یاقوت جڑے تھے۔ دریا نے سوچا، ہو سکتا ہے یہ اصل پتھر نہ ہوں، بے حیثیت کنکروں سے سجاوٹ کی گئی ہو۔ جو بھی تھا، دریا کو اس کی جوتیوں کے تلے دیکھنا برا لگا۔

یہ بات ہیولے نے محسوس کر لی۔ آہستہ سے کہنے لگا، "میری معذوری ہے بندہ نواز! کوئی بےادبی مقصود نہیں۔ میں اپنے گھٹنے نہیں موڑ سکتا۔" پھر کچھ ٹھہر کر بولا، "خوش آمدید! مجھے عزت بخشی۔"

اس کی آواز ایسی تھی جیسے شام پڑے کنجوں میں چڑیاں شور کرتی ہوں۔

دریا نے جواباً کہا، "ہُوں۔" پھر بےوجہ پوچھا، "تم صاحبِ خانہ ہو؟"

ہیولا اپنی چہچہاتی آواز میں بولا، "آپ کا خادم!"

دریا نے کہا، "بھلے آدمی! اپنے ملازم سے روشنی لانے کو کہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل تو دیکھیں۔"

ہیولا اسی چہچہاتی آواز میں ہنسا، "میں بدصورت آدمی ہوں۔ آپ مجھے دیکھ کے بے کیف ہوں گے اور آپ کا مبارک چہرہ میں صرف انگلیوں کے پوروں سے چھُو کر دیکھ سکوں گا ــــ نابینا نہیں ہوں تاہم پوری طرح دیکھ نہیں سکتا۔ چھُو کے، چکھ کے، سونگھ کے اور سُن کے پہچان لیتا ہوں۔"

"ہُوں،" دریاخان نے ہونکارا بھرا۔

وہ چہچہایا، "بعض معاملات میں بصارت سے زیادہ بصیرت کام آتی ہے۔"

"مثلاً کیسے؟"

"مثلاً حضور کا یہ فرمانا کہ آپ کے تردّد اور ملال کی وجہ کوئی نافرمان کنیز ہے، جی کو نہیں لگا تھا۔ اب آپ کی آواز سن کے یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو کنیز کا نام مصلحتاً لیا گیا تھا۔ کس لیے کہ آپ تاجر نہیں صاحبِ سیف سردار ہو۔ کنیز سے خفا ہوتے تو اُسے بے تامّل کاٹ کے پھینک دیتے ___ میرے پاس آنے کی زحمت کیوں کرتے۔"

دریا نے کہا، "ہُوں ___ اَور؟ اَور کیا؟"

وہ بولا، "اَور یہ کہ حضور لشکروں کی سالاری کرتے رہے ہیں، تاہم اِدھر چند برسوں سے درباروں میں رہنا ملا ہے۔"

دریاخان حیران ہوا۔ کہنے لگا، "خوب!"

"اور درباروں کا یہ ہے کہ ہم رُتبہ سرداروں میں چشمکیں چلتی ہی رہتی ہیں۔"

ہیولا شاید ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پچھلے دنوں دبیرِ دولت شادی خان سیہ رُو سے دریا کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ ہُنھ! بےوجہ وہ اس خوف میں رہتا ہے کہ دریا حجاب دار کہیں دبیرِ مملکت کی مسند پہ نہ آن بیٹھے ___ کتنے ہی برس سے بھیڑ کے بچے کی طرح اپنی ٹانگوں پر کھڑا لرز رہا ہے شادی خان!

ہیولے نے اسے ٹوکا، "حضور کیا سوچنے لگے؟"

"اوں؟___ ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"جی بندہ نواز! اور بڑوں کی چشمکیں کرسیاں ہلانے والی اور تقدیریں بدلنے والی ہوتی ہیں۔ خود عالی جاہ یہاں تشریف لائے، دل نے کہا حضور کا ستارہ اوج پر ہے ___ حریف آپ کا مُنہ کے بل گرے گا۔"

دریا نے کہا، "چلو ہم پہلے آ گئے تو ایسا ایسا ہو رہا ہے اور جو ہم سے پہلے وہ سیہ رُو یہاں پہنچ جاتا تو کسی اَور طرح ہوتا ___ منہ کے بل ہم گر گئے ہوتے۔"

ہیولا چہچہا کر بولا، "ناممکن! یہ پتھر پہ لکھا جا چکا۔ شادی خان فرلّی کی مسند اُلٹ گئی۔"

"شا۔ دی!" دریاخان کو یوں لگا جیسے اچانک کہیں سے اس پر وار کیا گیا ہے۔

ہیولا کیا ہنسا کہ چڑیوں کی چہکار سے کمرہ بھر گیا۔

دریاخان ہکلا رہا تھا۔ "یہ نام؟ ــــ یہ نام جو تم نے لیاـــ یعنی یہ کیسے؟"

"غلام غیب داں نہیں ہے۔ عالی جاہ نے ابھی خود فرمایا ہے کہ ہم سے پہلے اگر وہ سیہ رُو پہنچ جاتا... دارالحکومت میں کون نہیں جانتا کہ سیہ رُو کون ہے اور سب جانتے ہیں کہ دبیرِ مملکت شادی خان فرُلمی بہت تشویش کے ساتھ جس عالی مرتبت کے روشن چہرے پر نظریں جمائے رہتا ہے، وہ سردار درـ یا..."

"نام نہیں!" دریاخان نے چمک کے کہا، "نام نہیں! اور اُس سوختہ ساماں کا نام لینے کی بھی ضرورت نہیں ــــ سمجھے؟"

ہیولے نے آہستہ سے کہا، "سمجھا۔" یا شاید یہ دریا کا وہم تھا کہ اُس نے یہ لفظ کہا۔ اندھیرے کمرے میں بہت دیر سے سناٹا تھا۔

یہ کیا وبال ہے؟ میں تو سانپ کی اس بانبی میں داخل ہوا تھا کہ معلوم کروں اور اس مشتبہ ولایتی افانزو کی حرکات سے باخبر رہوں؛ دیکھوں کہ کہیں سلطان یا سلطانہ کے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی۔ لیکن یہاں تو سب کیفیت ہی بدل گئی۔ شادی سیہ رُو کا قصہ درمیان میں کیوں آ گیا؟

سامنے کے اندھیرے سے سیہ کار مرشد کی آواز آئی۔ وہ کچھ پوچھ رہا تھا۔ دریا اپنے ہی خیالوں میں تھا، اس نے غور نہیں کیا یا سُنا نہیں، پوچھنے لگا، "کیا کہتے ہو؟"

ہیولے نے بےوجہ ہلکا قہقہہ لگایا۔ بولا، "عالی منزلت میدان کے شیر ہیں، تاہم مشکل سوالوں کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔"

"کیا بکتا ہے؟" دریاخان کو طرارہ آ گیا۔

"تو پھر فرمائیے نا کہ حضور کس طرح کی چیز چاہتے ہیں۔ کھانے پینے کے ساتھ دی جانے والی؟ ہتھیار کے چرکے سے اثر کرنے والی؟ عطر یا لباس کے ذریعے بدن میں سرایت کرنے والی؟ آخر کس ڈھب کی دارُو؟"

دریاخان حُجّاب دار نے غیظ و غضب کے اظہار میں حلق سے بے معنی آواز پیدا کی جو ہیولے نے اَن سُنی کر دی۔ وہ اپنی ہی رو میں بولتا رہا۔ کہنے لگا، "ایک صورت اور بھی ہے سرکار! کہ اس شخص کو، جس کے بارے میں ہم اس وقت بات نہیں کرنا چاہتے، ایک ناکتخدا عورتــــ سمجھو

وش کنیا، خاص مقاربت کے لیے تیار کی گئی فراہم کی جائے جس کی ایک بار کی قربت ہی مذکورہ شخص کے لیے جان لیوا ثابت ہو۔ تو یہ اور بہت سے طریقے ہیں۔ اب جیسا بھی ارشاد ہو۔"

یہ کس قماش کا آدمی ہے؟ میری بات کیوں نہیں سمجھتا؟ اور سنتا کیوں نہیں؟ اپنی ہی کہے جاتا ہے۔ اور لو بھلا شادی خان فرُلی کے بارے میں یہ کیسی بکواس کرتا ہے۔ وہ میرا حریف مخالف سہی مگر سچ بات کہنے میں کیا جھجکنا۔ شادی آدمی پاک باز ہے۔ 'وِش کنیا' کا حربہ اُس پر نہیں چلنے کا۔ منکوحہ عورتوں کے سوا مقاربت کو وہ منحوس جائز نہیں سمجھتا تو پھر یہ فضول بات ذہن سے نکال دی چاہیے کہ..."

"درست ___ " ہیولے نے کہا، "تو بندہ نواز! عورت کو خارج از بحث سمجھو۔ یہ کہو ہتھیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

دریاخان دل ہی دل میں ہنسا۔ ہتھیار؟ شادی خان ہتھیار اپنے ہی استعمال کرتا ہے۔ دوسرے کا ہتھیار چھُوتا بھی نہیں اور بے مثال تلوَریا ہے۔ کون ہو گا جو اُسے خراش بھی دے سکے!

"بجا ارشاد ہوا ___ اچھا اگر عطر یا لباس کے تحفے استعمال کرتے ہوے...؟"

نہ عطر نہ لباس۔ ایسے تحائف وہ صرف اپنے قرابت داروں اور دوستوں سے لیتا ہے۔

"اور برتن؟"

دریاخان کو افانزو کے لائے ہوے برتن یاد آئے۔ انھی برتنوں کا بھیجا کرتا وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے سلطان اور سلطانہ کی سلامتی سے متعلق اپنی تشویش کو یاد کیا مگر ساتھ ہی ہیولے کی چہچہاتی ہوئی آواز آئی جس نے خیال کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ کہتا تھا، "عالی جاہ! برتنوں کی حکمت میں دیر لگے گی جب کہ شادی خان سوختہ نصیب کو حضور ازراہِ مصلحت شاید اتنا وقت دینے پر تیار نہ ہوں۔"

دریا نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ شادی خان سے نجات جس قدر جلد ممکن ہو، بہتر ہے۔ دبیرِ مملکت کی مسند کے لیے اگرچہ اس نے اتنی چاہت سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا، تاہم...

آگے کرسی میں بیٹھے ہیولے نے دریاخان سے اِس اہم معاملے میں گفتگو جاری رکھی۔

دریا کی آنکھیں کمرے کی تاریکی کی عادی ہو چکی تھیں۔ وہ بے چینی جو اس نے آتے ہی

محسوس کی تھی، اب نہیں تھی۔ دریا، شادی خان سیہ رُو کے مسئلے کو طے کر کے جانا چاہتا تھا۔ کیا خوب اتفاق ہے کہ اِس شخص نے یہ موضوع خود ہی چھیڑ دیا ہے۔ اِس لیے بات فیصلہ کن ہو جائے تو انسب ہے۔

مگر فی الاصل یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ دریاخان ہیولے تک آ پہنچا تھا۔ اس تاریک کمرے کے مماثل ایک تاریک کمرہ اَور تھا جس میں عین مین اس ہیولے کا ہم شکل ایک سایہ کرسی میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا چہچہا رہا تھا اور اپنے عالی قدر مہمان دبیرِ دولت شادی خان فرُلی کو سامنے بٹھائے عرض کرتا تھا کہ بندہ نواز! غور کیا جائے کہ حُجّاب دار دریاخان سے (جو شادی خان کی مسند کے درپے ہے) نجات حاصل کرنے کے لیے کیا حکمت وضع کی جا سکتی ہے؟

اور ایسے ہی ایک اَور تاریک کمرے میں ایک اَور فراخ کرسی میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ایسا ہی ایک اَور ہیولا خوشامد میں چہچہا رہا تھا اور دریا اور شادی سے کہیں زیادہ عالی منزلت ایک نرتاج دار (یا شاید وہ مادہ تھی) کو آمادہ کر رہا تھا کہ رعایا پر گرفت رکھنے کے لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ بعض عمائدِ مملکت کو عطر اور لباس کے تحائف دیے جائیں؟ یا برتنوں کے تحفے؟ اور مواصلت کے لیے بہ حکمت تیار کی گئی ناکتخدا عورتوں کے تحفے؟ کس لیے کہ ان اشیا سے متعلق حِکمت اس خانہ زاد کے پاس فی الوقت موجود ہے۔

اور اس خدائی خوار عمارت کے ہزار خدائی خوار کمروں کی تاریکی سے جیسے سمجھو چڑیوں کی آوازیں چلی آ رہی تھیں، جب شام پڑے وہ کُنبوں میں شور کرتی اور چہچہاتی ہیں۔

اور یہاں یہ کہانی ختم اور شروع ہوتی ہے۔

ترجمے

کتاب کا دوسرا حصہ ان ترجموں پر مشتمل ہے جو سہ ماہی "آج"، کراچی، کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے: پہلے چار ترجمے شمارہ ۱۷ (خصوصی شمارہ: "سرائیوو سرائیوو" میں اور آخری ترجمہ شمارہ ۸ میں۔

نجاد ابریشیموِچ (Nedzad Ibrisimovic) اور عرفان ہوروزووِچ (Irfan Horozovic) کا تعلق بوسنیا سے ہے اور سلاوینکا دراکولچ (Slavenka Drakulic) کا سابق یوگوسلاویا کے دوسرے حصے کروشیا سے۔ ان تینوں ادیبوں کی تحریریں براہِ راست بوسنیا میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہیں۔ برطانوی ادیب جولین بارنز (Julien Barnes) کی کہانی ایک مختلف زاویے سے بوسنیا کے آفت زدہ مگر دلیر شہریوں کو خراج پیش کرتی ہے۔

منوج داس ہندوستان کی ریاست اُڑیسہ سے تعلق رکھتے ہیں اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔

نجادا برِیشیموِچ

ترجمہ : اسد محمد خاں

دوبرینیا

دوبرینیا کے محاصرے کا چودھواں دن:

آدم قہرمان ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ آدم پانچویں فلور پر رہتا ہے، میں چوتھے پر۔ ہم دونوں کی کھڑکیوں سے سرائیوو ایرپورٹ اور اس سے پرے اگمان پہاڑیوں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑیاں دن رات، مسلسل رنگ بدلتی ہیں اور ہر وقت حسین نظر آتی ہیں۔ کوہ تریسکاوِچا کی برف پوش چوٹیاں کبھی کہر کی اوٹ سے دکھائی دے جاتی ہیں۔ آدم کو برف بھلی لگتی ہے۔ وہ باون سال کا ہے۔ وہ ایک کتاب لکھنا چاہتا ہے جو ماضی میں ہو چکے جرائم کو سرزد ہونے سے روک دے گی۔

آدم قہرمان کس قسم کا آدمی ہے؟

وہ سرائیوو میں پیدا ہوا تھا۔ مگر یہ ذرا اُلجھن میں ڈالنے والی بات ہے۔ کوئی سرائیوو میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ وہ گوری رنگت والوں میں سے نہیں ہے، لیکن یہ بھی درست نہیں۔ شاید یوں بیان کیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا: کھچڑی ہوتے بال، چہرے پر نہ ڈاڑھی نہ مونچھ، موزوں ناک نقشہ، شناختی نشان کوئی نہیں۔

افلاطون کہتا ہے کہ آدمی دوٹانگوں والی بے پروں کی ایک مخلوق ہے۔ اس تعریف کا اطلاق، بڑی ایمان داری سے، آدم قہرمان پر کیا جا سکتا ہے۔ آدم کا اپنا وجود اُس کے اوپری آدھے دھڑ میں اکٹھا ہو گیا ہے: اُس کے دل میں، اور اس کے دماغ میں۔ وہ ایک روح کا مالک ہے، حساس اور ایمان دار ہے، وہ اُن میں سے ہے جو وقوعے سے قبل محسوس کر لیتے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اُس میں یہ صلاحیت ہے کہ مُنھ کھولنے سے پہلے آدمی کو سمجھ لیتا ہے۔ جب آدم اکیلا ہوتا ہے تو لوگوں کے خیال ہی سے ہیبت زدہ ہو جاتا ہے۔ تمام جانور آدم کے لیے ناقابلِ فہم ہیں مگر اُنھیں دیکھنا اُسے اچھا لگتا ہے۔

شاید یہ سمجھانا آسان ہے کہ آدم قہرمان کس قسم کا ادیب ہے: وہ اچھا ہے، بہت اچھا ہے، مگر غیر معروف ہے۔

یہ آدم کی کتاب کا پہلا جملہ ہے:

> "۱۹۴۲ میں چیتنکوں نے فوچا (Foca) کے حاجی طاہر ووچ کی پیٹھ کی کھال کھینچ لی۔ یہ کھال اوڑھنی کی طرح حاجی کے سر پر اُلٹ کر انھوں نے پن کی مدد سے ایک پرچا لگا دیا جس پر لکھا تھا: دیکھو، یہ نقاب گرائے ہوئے مسلمان عورت ہے!"

تو آدم قہرمان حاجی طاہر ووچ کی کھال کھینچنے سے چیتنکوں کو کیسے روکے گا جب کہ وہ لوگ یہ کر ہی چکے؟

آدم نے اِس سال اپریل میں اپنی کتاب شروع کی۔ ایسا ہوا کہ اس مہینے میں ایک شخص نے، جو پروفیسر ہے اور خود بھی کتابیں لکھتا ہے، تباچی گاؤں میں ایک بُریدہ انسانی کھوپڑی کو کِک ماری۔ اتفاق سے یہ گاؤں تباچی اُنھیں پہاڑیوں میں بسا ہوا ہے جو فوچا شہر کو گھیرے ہوئے ہیں۔

پروفیسر کھوپڑی کو اکیلا کِک نہیں مار رہا تھا۔ بوسنیائی حکومت کا کوئی وزیر بھی موجود تھا، وہ

جو بھی ہو، اُس کی طرف کھوپڑی کو کِک ماری گئی تھی، یعنی اُس کی شکل میں کوئی ایسا تھا جو کِک مار کر کھوپڑی کو لوٹا بھی سکے۔ میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ بعد میں انھوں نے اپنے جوتے دھو لیے ہوں گے۔ کیا معلوم انھوں نے اپنی پتلونوں کے پائنچے بھی پلٹے تھے یا نہیں پلٹے تھے۔

یہ انسانی سر جسے بوسنیائی وزیر نے کِک مار کر پروفیسر کی طرف اور پروفیسر نے کِک مار کر واپس وزیر کی طرف پھینکا، کبھی گاؤں کے ایک کسان کے شانوں پر ہوتا تھا۔ کسان کے پاس بھیڑوں کا ایک گلہ تھا؛ اصل میں انھی اعلیٰ قسم کی بھیڑوں کی وجہ سے وہ علاقے میں اتنا مشہور تھا۔ مگر فوراً ہی اُس کا سر نہیں اُتار لیا گیا: پہلے اُس سے بھیڑ کے دس بچے طلب کیے گئے تھے، پھر برانڈی ــ بہت سی برانڈی ــ اور پھر تیس بھیڑیں۔ وہ سب کسان کی میز کے گرد لکڑی کی بنچوں پر بیٹھ گئے: وزیر، پروفیسر، اور سات چیتنک۔ کسان نے بھیڑیں حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اُس سے رقم مانگی۔ اُس نے پھر انکار کر دیا۔ اس لیے تین چیتنک اُسے اُس کے گھر کے پیچھے جنگل میں لے گئے اور وہاں اُنھوں نے اُسے مار دیا۔

شاید وجہ اَور ہی تھی: وہ کسان سرب نہیں تھا۔ دریائے درینا، جس کے قریب وہ کسان رہتا تھا، صرف سربوں کے لیے ہے۔ جو لوگ بلغراد میں کتابیں لکھتے ہیں، کم از کم وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔

***

دوبرینیا کے محاصرے کا پندرھواں دن:

آدم قہرمان سے میں نے پوچھا، "جو جُرم سرزد ہو چکے، اُنھیں کیسے روکنے کا ارادہ ہے؟"

کہنے لگا، "کتاب لکھ کے، اور وہ میں نے شروع کر دی ہے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے!"

"تم نے میری کتاب کا پہلا جملہ پڑھا ہے؟"

"ہاں پڑھا ہے۔"

"کیا پہلا جملہ پڑھنے سے پہلے تمھیں خبر تھی کہ فوچا کے حاجی طاہر ووِچ پر کیا آفت آئی ہے؟"

"نہیں۔"

"اب تمھیں اُس کا حشر معلوم ہو چکا ہے؟"

"ہاں۔"

"یہ بتاؤ، تم اُسے دیکھ سکتے ہو؟ حاجی کو؟"

"ہاں، دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیا تم اُسے مَرا ہوا دیکھ رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں اُسے اِس بھیانک حالت میں زندہ دیکھ رہا ہوں۔"

"تو بس، اَب یہی کرنا باقی رہتا ہے کہ میں اُنھیں حاجی کی کھال کھینچنے سے روک دوں۔"

"مگر کیسے؟"

آدم قہرمان بولا، "ناممکن تولگتا ہے، مگر کم سے کم میں کوشش کروں گا۔"

اُسی روز روگاتیچا کے اوپر والے گاؤنوں میں سے ایک میں چیتنک داخل ہوے۔ انھوں نے تمام مَردوں کو اکٹھا کیا۔ پھر اُنھیں آگ لگا کر ختم کر دیا۔

حاشیے:

چَیتنک: یہ فوجی کے لیے استعمال ہونے والے لفظ "چے تا" سے مشتق ہے۔ چیتنک اپنی بہت سی خاصیتوں سے پہچانے جاتے ہیں: وہ جھوٹ بولتے ہیں، وہ سرب ہیں، وہ بوسنیا والوں کا قتلِ عام کرتے ہیں، وہ قتلِ عام کے ذریعے ــــ یا زیادہ صحت کے ساتھ کہا جائے تو ذبح اور ہلاک کر کے، آبروریزی کر کے، آگ لگا کے اور لُوٹ مار کر کے ــــ وہ ملک بوسنیا کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں۔ چیتنک سرب کاز کے محافظ ہیں، اور سرب کاز ہے ہر چیز کا سرب ہونا: سرب مرد، سرب عورتیں، سرب

چڑیاں، مچھلیاں، پودے، حتیٰ کہ سرب کوّے بھی۔ یہ دیکھیے ڈاکٹر سوَیتی سلاف زیچ نے اپنی کتاب "سربیائی عالمِ طبیعی" (مطبوعہ زموم، ۱۹۳۸ء) میں تشویش ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پچھلے تیس برسوں کے دوران یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ سربیائی کوّے کی پرواز میں اَور زیادہ آلکس اور سستی آتی جا رہی ہے، اور اگر یہ رجحان جاری رہا تو سرب کوّا سو سال کے عرصے میں پرواز کرنا چھوڑ دے گا۔"

کوئی عام سا کوّا نہیں، سربیائی کوّا ــ تشویش کی بات ہے!

سرائیوو: بوسنیا کا دارالحکومت۔ (اگر گائکوں اداکاروں کا ذکر خاص طور پر نہ کیا جائے تو) مسجدوں، گرجاگھروں اور کیتھیڈرلز کا شہر۔ شہر کو پہاڑیوں نے گھیر رکھا ہے۔ دریاے ملیاکا، اُتھلا سا دریا، شہر کے درمیان سے گزرتا ہے جس کے کناروں پر اونچی سفید دیواریں کھڑی ہیں۔ اس کے بہاو پر بیچ بیچ میں آبشار بنے ہیں، پُل کھنچے ہوے ہیں۔ ہر پُل محلسرا کے دروازے جتنا خوب صورت ہے۔ لفظ "سرائیوو" تُرکی لفظ "سرائے" سے بنا ہے جس کے معنی محل کے ہیں۔ پہلی بار سنہ ۱۵۰۷ء میں یہ لفظ سامنے آیا تھا۔

سنہ ۱۶۹۷ء میں یوجن سیوائسکی نے سرائیوو کو لُوٹا اور اسے آگ دکھا دی۔ اگلے تین سو برسوں میں سرائیوو کو پانچ مرتبہ اَور جلایا گیا۔ شہر اَب تریبےوِچ پہاڑی کے عقب سے دوبرینیا تک پھیلا ہوا ہے جہاں آدم قہرمان اور میں رہتا ہوں۔

بوسنیا: اچھا ملک۔

بوسنیا اور ہرزگووینا: ایک ہی بات ہے، سواے اس کے کہ ہرزگووینا کی پہاڑیاں ننگی ہیں۔

درِینا: خوب صورت، ٹھنڈا دریا جو ملک بوسنیا کو ملک سربیا سے
ملاتا اور علیحدہ کرتا ہے۔ اس دریا کے کناروں پر باغات ہیں جو میرے
تصوّرِ جنت کی تشریح ہو سکتے ہیں۔ بلندی پر اونچی مہربان پہاڑیاں ہیں؛
شانت ہوائیں ان پہاڑیوں سے اُترتی رہتی ہیں۔

***

دوبرینیا کے محاصرے کا سولھواں دن:
"کیا حاجی طاہر ووِچ اَب بھی تکلیف میں ہے؟" میں پوچھتا ہوں۔ مجھے فکر ہے۔
"ہاں، وہ تکلیف میں ہے،" قہرمان کہتا ہے۔ "لو، یہ پڑھو۔"
"مارچ ۱۹۴۲ء کی آخری جمعرات کو علی الصباح چیتنک ایک
گاؤں وَرسینیے میں داخل ہوے جو ملیچی کے مقام سے چند کلو میٹر کے فاصلے
پر ہے۔ اُنھیں جو ملتا گیا اکٹھا کرتے گئے۔ پھر سب کو ایک مسجد میں دھکا
دے کر اُنھوں نے اُسے آگ لگا دی۔ ورسینیے میں اُس صبح ایک سو تراسی
جیتے جاگتے آدمی مار دیے گئے، زندہ جلا دیے گئے۔ ان ایک سو تراسی
شہیدوں میں ایک مقامی معلّم حسین آفندی تالووِچ بھی تھا اور اس کے کنبے
کے افراد بھی: بیوی، چار لڑکے، بیٹی۔"
میں آدم سے کہتا ہوں، "اگر تم اسے روک نہیں سکتے تو مجھے یہ اَور مت دکھاؤ۔" سارا منصوبہ
ہی یہ تھا کہ آدم ماضی میں ہو چکے جرائم کو سرزد ہونے سے روک دے گا۔
"بارش!" آدم نے سکون سے کہا، "دھواں دھار بارش آگ کو بجھا دے گی۔ سمجھو بچا لیے
گئے وہ لوگ۔"
"ہاں، مگر صرف تمھاری کتاب میں!"
آدم کہتا ہے: "چلو یوں ہی سہی۔"

***

اچانک آدم مجھے آستین سے پکڑ کر کھینچتا ہے اور فرش پر جھکا دیتا ہے؛ وہ خود بھی دبک کر بیٹھ گیا ہے۔ ہم باہر گولیاں چلنے کی آواز سنتے ہیں۔ شیلنگ دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ لُوکاوِیجا بیر کس سے دوبربنیا پر شیلنگ کا سولھواں دن ہے۔ ہم کرال کرتے ہوئے برآمدے میں نکل آتے ہیں۔ کوئی وجہ ضرور ہے جو ہم برآمدے میں خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔

آدم ابھی تک سرگوشیوں میں بات کر رہا ہے۔ کہنے لگا، "تم نے نوٹ کیا ہو گا، شیلنگ کے ابتدائی دنوں میں چڑیوں کی آوازیں بالکل سنائی نہیں دیتی تھیں۔ انھوں نے گانا بند کر دیا تھا۔ پہلا ہفتہ گزرنے کے بعد وہ دوبارہ آ گئیں اور فائرنگ کے وقفوں میں اُنھیں گاتے ہوئے سنا جا سکتا تھا۔ اور اَب، فائرنگ جاری ہو یا بند ہو، اُن کے گانے کی آواز آتی رہتی ہے۔"

حاشیے:

ورسینیے: چند گھروں، ایک اسکول، کچھ چھپروں کا گاؤں۔ گردوپیش کی پہاڑیاں بالکل خطۂ عرب جیسی ہیں مگر ان پر گھاس اگی ہوئی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ورسینیے کی پہاڑیاں سرما میں سفید ہو جاتی ہیں، خطۂ عرب کی پہاڑیاں سفید نہیں ہوتیں۔ سرما میں بھی عرب میں برف باری نہیں ہوتی۔

مسجد: منارے اور دوسری بہت سی چیزوں کے بغیر ایک مسلم عبادت گاہ۔ اُن بہت سی چیزوں کا ذکر میں یہاں نہیں کروں گا، ورنہ مجھے اُن کی بھی وضاحت کرنی پڑے گی۔ مسجد وہ جگہ ہے جہاں چیتنکوں نے ایک سَو تِراسی لوگوں کو زندہ جلا دیا۔ اگرچہ یہ تمام مرد، عورتیں اور بچے چیتنکوں نے نذرِ آتش کیے تھے، کمیونسٹوں نے نہیں، تاہم کمیونسٹوں نے پچاس برس تک ورسینیے کے لوگوں کو یہ مسجد دوبارہ تعمیر کرنے کی

اجازت نہیں دی۔

معلم: دینی مدرس۔

پارٹیزن: مارشل ٹیٹو کے لڑاکے۔

حاشیے پر حاشیہ:

یوسپ بروز ٹیٹو: وہ پارٹیزن فوجیوں کا سپریم کمانڈر تھا، جنھوں نے ۱۹۴۵ء میں چیتنکوں اور اُستاشوں کو مار لگائی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں اُس کی موت کے بعد ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور سرب چیتنکوں نے اُس کی فوج کے سب ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں ٹیٹو نے فاشسٹوں کے خلاف لڑائی میں چیتنکوں کو دو مرتبہ پارٹیزن فوجیوں کا ساتھ دینے کو کہا تھا جس پر وہ کہتے رہے کہ ہاں ہم ساتھ دیں گے، مگر وہ جھوٹ بولتے تھے۔

***

موسمِ بہار کی ایک دل آویز اور حسین صبح میں کریسولا ئیسکو پہاڑی کی ڈھلان پر پارٹیز فوجیوں کا ایک جتھا کھڑا تھا۔ اس جتھے میں کچھ سرب تھے، ایک مسلمان تھا جس کا نام مصطفیٰ دُوارڈیا تھا۔

سرب پارٹیزنوں نے بڑی محبت سے کہا، "ڈیر کامریڈ! آؤ چلیں۔"

مصطفیٰ اُن کے ساتھ چلا گیا۔ اُسے کسی شیطنت کا شبہ بھی نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ پارٹیزن اچانک چیتنک بن گئے اور مصطفیٰ دُوارڈیا کو انھوں نے ایک مضبوط لکڑی میں زندہ پرو دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۲ء میں مئی کی دوسری تاریخ کو ہوا۔

ہمارا نوبیل انعام یافتہ ادیب آئیوو آندریچ اسے اِس طرح بیان کرتا ہے:

زمین پر شاہ بلوط کی لکڑی کا ایک کھمبا پڑا تھا، ڈھائی میٹر لمبا۔ اُس میں لوہے کی دھاردار شام لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے جب مصطفیٰ کو زمین پر لیٹنے کا حکم دیا تو اُس نے سر جھکا دیا۔ چیتنک اُس کے پاس گئے۔ اُنھوں نے مصطفیٰ کا کوٹ اور قمیص اُتار پھینکی۔ جیسا کہ کہا گیا تھا، پارٹیزن مصطفیٰ خاموشی سے زمین کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ انھوں نے اُس کی دونوں ٹانگوں سے ایک ایک رسّا باندھا، پھر دو چیتنکوں نے یہ رسّے کھینچ کر اُس کی ٹانگیں جتنی چوڑی کھل سکتی تھیں کھول دیں۔ اسی عرصے میں دوسرے چیتنک یوواں نے شاہ بلوط کے کھمبے کو لکڑی کے دو ٹھیوں پر اس طرح ٹکا کر رکھ دیا تھا کہ اُس کی نوک اب مصطفیٰ کی ٹانگوں کے بیچوں بیچ تھی۔ یوواں نے اپنی بیلٹ سے ایک مختصر، چوڑا سا خنجر کھینچ لیا اور اوندھے پڑے ہوئے آدمی پر جھک کر اُس کی ٹانگوں کے بیچ پتلون کی سیانی کا کپڑا کاٹتے ہوئے وہ جگہ چوڑی کر دی جہاں سے کھمبے کو بدن میں داخل ہونا تھا۔ خنجر کے اس چھوٹے سے وار سے بندھے ہوئے آدمی کا جسم ایک بار لرزا۔ اُس نے اپنا اوپری بدن ایسے اُٹھایا جیسے کھڑا ہونا چاہتا ہو، پھر فوراً ہی اسے زمین پر گرا دیا۔ قصابی کا سب سے دہشت ناک عمل پورا ہو چکا۔ تو یوواں اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے مضبوط لکڑی کی ایک موگری اٹھائی اور کھمبے کے نچلے، کند سرے پر آہستہ آہستہ، جما جما کر ضربیں لگانی شروع کر دیں۔ وہ رک گیا۔ اُس نے جھک کر پہلے اُس بدن کو دیکھا جس میں وہ کھمبا داخل کر رہا تھا، پھر دونوں چیتنکوں کی طرف دیکھا؛ اُنھیں یاد دلایا کہ آدمی کی ٹانگیں جھٹکے سے ایک دم نہیں چھیڑ دینی، ہمواری سے اور آہستہ آہستہ چھیڑنی ہیں۔ موگری کی ہر ضرب پر اوندھے پڑے ہوئے آدمی کا بدن مٹھی کی طرح بند ہو جاتا، اُس کی ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی ہو جاتی، کولہا بڑا سا بن جاتا، مگر رسّے کھینچ کر اُسے پھر سیدھا کر دیا جاتا۔

وہ زمین پر سر مارتا تو اُس کی دھمک آتی اور ساتھ ہی ایک بہت عجیب سی آواز سنائی دیتی۔ یہ کوئی چیخ، فریاد یا جاں کنی کی خرخراہٹ یا کسی بھی قسم کی انسانی آواز نہیں تھی۔ اذیت جھیلتا، کھینچا اور توڑا جاتا وہ بدن بس ایک چیں چیں سی آواز اور ٹکرانے کی دھمک پیدا کر سکتا تھا جسے سُن کر لگتا تھا کہیں باڑ کے لیے لکڑی کا لٹھا چیرا جا رہا ہے۔ اب ہر ضرب کے بعد یووان اوندھے پڑے ہوئے آدمی کے پاس پہنچتا، اُس پر جھک کر اطمینان کر لیتا کہ کھمبا صحیح سمت میں جا رہا ہے یا نہیں، اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اعضائے رئیسہ میں سے کوئی زخمی نہ ہو گیا ہو، وہ اپنا کام پھر شروع کر دیتا۔ ایک لمحے کے لیے ضربیں لگانے کا کام روک دیا گیا۔ یووان نے نوٹ کیا تھا کہ دائیں شانے کے اُبھار پر بدن کے پٹھے کھنچ گئے ہیں اور بد نصیب آدمی کی کھال وہاں سے اُٹھ رہی ہے۔ وہ تیزی سے گیا اور اُس نے اپنے خنجر سے اُٹھی ہوئی جگہ پر کراس کی شکل میں دو قط لگا دیے۔ زردی مائل خون، پہلے ہلکے ہلکے، پھر اَور تیزی سے، اُبل کر بہنے لگا۔ اُس نے احتیاط اور آہستگی سے دو تین ضربیں اَور لگائیں اور کھمبے کی لوہا چڑھی نوک قط لگی جگہ سے نکل آئی۔ پھر اُس نے جم کے کئی اَور ضربیں لگائیں، یہاں تک کہ کھمبے کی دھاردار شام آدمی کے دائیں کان کے لیول پر آ گئی۔ آدمی کو کھمبے میں ایسے پرو دیا گیا تھا جیسے باربی کیو کے لیے بَرّہ تیار کیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کھمبے کی شام اُس کے منھ سے نہیں، پیٹھ سے باہر آئی تھی اور یہ کہ اُس کی انتڑیاں، دل اور جگر کوئی بھی زیادہ زخمی نہ ہو پائے تھے۔ یووان نے موگری ایک طرف ڈال دی اور زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے پاس گیا۔ کھمبے کے داخل ہونے کی جگہ سے خون ٹپکتا تھا جس کے چھوٹے چھوٹے ڈبرے بھر گئے تھے۔ ان سے جوتے کپڑے بچاتے ہوئے یووان نے بدن کا جائزہ لیا۔ ساتھ کے دو چیتنکوں نے اکڑے ہوئے

بدن کو چت لٹا دیا اور کھمبے سے اُس کے ٹخنے باندھنا شروع کر دیے۔ اُس وقت یووان دیکھ کر چیک کر رہا تھا کہ آدمی کیا ابھی زندہ ہے۔ وہ اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو اچانک متورّم ہو کر اُبھر گیا تھا اور بڑا بڑا لگتا تھا۔ اُس کی آنکھیں بے چین اور پوری طرح کھُلی ہوئی تھیں لیکن پلکیں ساکت تھیں۔ ہونٹ ایک طرح کی اینٹھن میں کھنچ کر مُڑ گئے تھے جن کے عقب میں بھنچے ہوے دانت چمکتے نظر آتے تھے۔ آدمی اپنے کچھ عُضلات کو قابو نہیں کر پا رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ چہرہ نہیں کوئی نقاب ہے۔ اُس کے پھیپھڑے تیزی سے چھوٹے چھوٹے سانس لے رہے تھے۔ دونوں چیتنک اُسے ایسے اُٹھانے لگے جیسے گِلنگ کے لیے تیار کیا گیا گوشت کا پارچہ اُٹھاتے ہوں۔ یووان اُن پر چیخ رہا تھا، خبردار کر رہا تھا کہ احتیاط سے اُٹھائیں، بدن کو ہلائیں جُلائیں نہیں، سادھ کے رکھیں۔ پھر وہ خود اُن کی مدد کو آ گیا۔ اُنھوں نے کھمبے کا نچلا، موٹا حصّہ زمین میں گاڑ دیا۔ سہارے کے لیے پیچھے ایک چھوٹی لکڑی ٹِکا دی، اُسے کیل لگا کے کھمبے سے ٹھونک دیا۔

پھر تینوں چیتنک گئے اور جتھے کے باقی لوگوں میں شامل ہو گئے۔ خالی جگہ میں مصطفیٰ دُواڑیا، کمر تک ننگا، اپنی چھاتی نکالے ہوے، زمین سے ایک میٹر بلندی پر، کھمبے پر، اکیلا رہ گیا۔ پُشت پر بندھے بازوؤں اور کھمبے سے بندھے ٹخنوں کے ساتھ، دور سے دیکھ کر کوئی مشکل ہی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ کھمبا اُس کے بدن کے بیچ سے ہو کر گزرا ہے۔ اَب چیتنک اچھی طرح چیک کرتے ہوے اذیت میں گرفتار اس آدمی کے پاس پہنچے۔ کھمبے پر سے خون کی پتلی، کم زور سی دھار بہہ رہی تھی۔ وہ زندہ تھا اور باخبر۔ سانس کے ساتھ اُس کے پہلو سکڑ اور پھیل رہے تھے۔ گردن کی نسیں دھڑک رہی تھیں۔ آنکھیں دھیرے دھیرے پھرتی جا رہی تھیں، مگر

وہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے بھینچے ہوئے دانتوں سے چبا چبا کر غراہٹ جیسی آواز نکال رہا تھا جس کے صرف چند ہی لفظ سمجھ میں آتے تھے: "چیتنکو! چیتنکو!" وہ سسکی لے کر کہہ رہا تھا، "تمھیں کتے کی موت نصیب ہو! کتے کی موت!"

***

یہ ۱۱ جولائی سنہ ۱۹۹۲ء ہے۔ دوبرینیا کے محاصرے کا سترھواں دن۔ ہم نے آسمان کا ایک حصہ دیکھا۔ ایک پہاڑی کی اگلی عمارت کا ایک حصہ دیکھا۔ دوبرینیا کے قریب ہی ہراس نیچا (Hrasnica) کی بستی میں چیتنکوں نے کنڈرگارٹن پر شیل مار کر چار بچے ہلاک اور دس زخمی کر دیے۔

***

دوبرینیا کے محاصرے کا اٹھارواں دن:

آدم کہنے لگا: اپارٹمنٹ بلاکس پر پہلے وہ ٹینکوں، اینٹی ایر کرافٹ مشین گنوں اور توپوں سے حملہ کرتے ہیں۔ پھر وہ عمارت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو پکڑے گئے وہ سمجھو مارے گئے۔ چیتنک اُن کا گلا کاٹ دیتے ہیں، اپارٹمنٹ کو لوٹتے ہیں، پھر وہ اسے آگ لگا دیتے ہیں۔ اس لیے پکڑے مت جاؤ! اور آگے، دوبرینیا میں چلتے جاؤ۔ اپنے دوست کے پاس یا کسی پڑوسی کے پاس ٹھیر جاؤ۔ لیکن خیال رہے کہ چیتنک تمھارے پیچھے ہیں۔ تہ خانے میں جا رہے ہو؟ یہ غلطی کر رہے ہو! اب تم آ گئے اُن کے قبضے میں۔ وہ شیل مارتے رہیں گے، تمھیں وہیں روکے رکھیں گے۔ نہ روشنی، نہ پانی، نہ کھانا۔ جب یہ سب کچھ تمھاری برداشت سے باہر ہو جائے گا، تم ڈینڈیلین کا ایک پتا توڑنے نکل پڑو گے، سلاد جو بنانا ہے۔ بس، کسی اوٹ سے تاک کر نشانہ پر گولی چلا دے گا۔

تم مرتے نہیں، زخمی ہو جاتے ہو۔ [illegible]

دو برینیا کا دفاع کرنے والے اسنائپرز کو پکڑتے ہیں۔ وہ اُسی کو پکڑ لیتے ہیں جس نے تم پر گولی چلائی تھی۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ چیتنک کہتے ہیں: لاؤ، اسنائپر کو واپس کر دو، بدلے میں ہم قریب کے ایک اسپتال تک ایک ایمبولینس لے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ کیوں کہ دو برینیا کے ساتھ ساتھ سرائیوو کا بقیہ شہر بھی ناکا بندی میں ہے، اُس چیتنک اسنائپر کو ۔ اُسی کو جس نے گولی چلا کر تمھیں زخمی کیا تھا ۔ اُن کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اسی روز شہر کے دوسرے حصے میں، سمجھو موجمیلو میں، دوسرا چیتنک اسنائپر ایک نرس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ چناں چہ مرہم پٹی کے لیے جب تم اسپتال پہنچتے ہو تو نہ وہاں دوا ہے نہ کچھ کھانے کو ہے؛ ایک نرس بے چاری مری پڑی ہے۔ تمھیں دوسرے اسپتال میں، جہاں بہت بھیڑ ہے، منتقل کر دیا جاتا ہے۔ خنزیر کا روسٹ کیا ہوا گوشت کھانے، برانڈی پینے اور اپنے گیت گانے کے بعد، چیتنک آس پاس کی پہاڑیوں سے اس اسپتال پر شیلنگ شروع کر دیتے ہیں۔ بعد میں، جب وہ ایمبولینس جسے ناکا بندی سے گزرنے کی اجازت دی گئی تھی، لوٹ رہی ہوتی ہے تو اُن میں سے (فرض کرو) مارشل ٹیٹو بیرکس کے چیتنک، ڈرائیور کو مار ڈالتے ہیں اور گاڑی ہتھیا لیتے ہیں۔ اسی دوران میں اُن زخموں کی وجہ سے جو اسنائپر کی گولی سے پہنچے تھے ۔ جسے پکڑ لیا گیا تھا مگر ایمبولینس کو گزارنے کی اجازت دینے کے بدلے میں چھوڑ دیا گیا تھا جو اب چوری کر لی گئی ہے ۔ تم اسپتال میں دم توڑ دیتے ہو۔ لوگ تمھارے لیے قریب ترین پارک میں قبر کھودتے ہیں، مگر تمھارے تابوت پر، جنازہ پڑھنے والے امام پر، اور اُن بہت سے بہادر بھلے آدمیوں پر جو تمھیں دفن کرنا چاہتے ہیں، چیتنک گولیاں برساتے ہیں۔ اور جب رات ہو جاتی ہے تو پہاڑیوں پر لگے شیل مار کر وہ تمھاری قبر ہی کو اڑا دیتے ہیں۔

"اب آپ اصل جنگ کو کیا کہیں گے؟" [illegible]

"حاجی طاہرووِچ کو ابھی تک اُس کے زخم تکلیف پہنچا رہے ہیں۔ اُس کا عذاب برداشت سے باہر ہے!" میں کہتا ہوں۔

"ہاں،" آدم رسان سے کہتا ہے، "مجھے معلوم ہے! مگر ور سینیے کا معلم، اس کے چار بیٹے، بیوی اور بیٹی، اور ان کے علاوہ جلتی ہوئی مسجد میں ایک سَو چھتّر جانیں، ان سب کو بچا لیا گیا ہے۔"

میں کہتا ہوں، "ہاں۔"

آدم قہرمان کہتا ہے، "کل چیتنِکوں نے روگا تیچا کے نزدیک ایک ہزار مکان جلا دیے۔ ایک ہزار تو بہت بڑی تعداد ہے!"

میں کہتا ہوں، "میرے ذہن کو جِلا بخشنے والے صرف پانچ الفاظ ہیں: بوسنیا اور ہرزگووینا کی فوج۔"

***

دو برینیا کے محاصرے کا انیسواں دن:

"میں نے تمھاری کتاب کا صرف شروع کا حصّہ پڑھا ہے، لیکن ابھی تک بہت سی چیزیں دیکھی نہیں جا سکتیں۔"

آدم پوچھتا ہے، "تم کیا نہیں دیکھ سکتے؟"

میں کہتا ہوں، "دو برینیا نہیں دیکھا جا سکتا، اپارٹمنٹ بلاکس، لوگ، لان، کتّے ــ میں تو اُن تمام چیزوں کی تعداد بھی نہیں بتا سکتا جو نہیں دیکھی جا سکتیں۔"

آدم کہتا ہے، "یہ کتاب ہے، مُووی نہیں ہے۔" اور وہ مسکراتا ہے، "کتاب کتاب ہوتی ہے۔"

"مگر پڑھنے والے نے جلائی ہوئی مسجد میں وہ ایک سَو چھتّر جانیں ابھی نہیں دیکھی ہیں،" میں اپنی بات پر اَڑ جاتا ہوں۔

آدم پوچھتا ہے، "تم میری کتاب لکھنا چاہو گے؟"

"نہیں۔ مگر جلتی ہوئی مسجد سے باہر آتے اُنھیں دیکھا تک نہیں جا سکتا۔ کیا تم یہ نہیں دکھا سکتے کہ وہ ایک سَو چھتّر آدمی مسجد سے کس طرح نکل رہے ہیں؟"

آدم کہتا ہے، "وہ ڈھیرے ڈھیرے باہر آ رہے ہیں۔"

"اچھا!" میں آخر کار کہتا ہوں، "اچھا!" کیوں کہ میں مصالحت کر لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس سے میری تشفی ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں، "ٹھیک ہے، جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہر وقت یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ میں نے ورسینیے کے معلّم، اس کے چاروں بیٹوں، بیوی اور بیٹی کو زندہ سلامت دیکھا ہے۔ یہ میں نے بہ ہر حال دیکھا ہے۔"

آدم کہتا ہے، "شکریہ۔"

***

یہ ۱۷ جولائی ۱۹۹۲ء ہے۔ یہ وہی دن ہے کہ وِشے گراد کے نزدیک ووچینے (Vucine) کی بستی میں چیتنکوں نے اَسّی مردوں عورتوں کو ایک مکان کے تہہ خانے میں ٹھیل دیا اور زندہ جلا دیا۔ میں اِن اَسّی کا ذکر آدم قہرمان سے نہیں کرتا، حالاں کہ مجھے خبر ہے کہ اُسے معلوم ہے۔

جب آدم دوبرینیا کے ایک سَو تِراسی آدمیوں کو بچا سکتا ہے تو میں اَسّی کو کیوں نہیں بچا سکتا؟ مگر یہ محض میرا خیال ہے۔ میں نہیں بچا سکتا! میں اُنھیں نہیں بچا سکتا، مگر نہ یوروپ ہی انھیں بچا سکتا ہے ـــــ یا ہو سکتا ہے اُس کی مرضی نہ ہو۔ اور نہ ہی امریکا بچا سکتا ہے ـــــ یا ہو سکتا ہے وہ بچانا نہ چاہتا ہو۔ میں نہیں بچا سکتا، مگر نہ ہی ساری دنیا اُنھیں بچا سکتی ہے ـــــ یا ہو سکتا ہے دنیا اُنھیں بچانا ہی نہ چاہتی ہو۔

سلاوینکا دراکولیچ

ترجمہ: اسد محمد خاں

موت کا کلوزاَپ

* * *

ٹی وی کیمرے دعوت دیتے ہیں:

(Voyeurism) موت اور خبیثانہ ظلم اور بد معاشی کو دیکھنے دکھانے کے ہر گز پسندانہ شوق سے مغلوب ہو کر الکیمرے دعوت دیتے ہیں۔ یادداشت کے نام پر، اور اس خوش فہمی کے ساتھ کہ پھر ایسا کبھی نہیں ہو گا، ٹی وی کیمرے اپنے ناظرین کو شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔

بتاتے ہیں کہ ایک چھوٹی لڑکی "الف میم" اُس وقت ماری گئی جب وہ اپنی رکابی سے پائی کھا رہی تھی۔ کچھ اس طرح سمجھیے کہ فروری کے آخر میں صبح کا وقت تھا، اور وہ روشن اور سرد صبح تھی جب یہ واقعہ ہوا۔ آپ خود سے پوچھتے ہیں کہ اُس عورت، یعنی بچی کی ماں نے جنگ کی شروعات کے دس مہینے بعد سرائیوو میں یہ پائی کیسے تیار کر لی؟ اُس نے کیسا آٹا، کس طرح کا تیل استعمال کیا؟ پائی میں اُس نے بھرا کیا ہو گا؟ یقیناً اُس نے اسے ایک رات پہلے پکایا ہو گا، مگر پھر سوال اٹھتا ہے کہ کیسے؟ بجلی تو نہیں ہے، یا اگر ہے تو کبھی کبھی آتی ہے۔ یا شاید اُس نے یہ پائی کھلی آگ پر پکائی تھی؟ مگر لکڑی ہے کہاں؛ بہت پہلے ہی شہر کے سب درخت کاٹ دیے گئے تھے ــــ بہ ہر حال، ڈھائی سالہ لڑکی ابھی تک، آدھی سوئی آدھی جاگی، میز پر بیٹھی ناشتا کر رہی تھی کہ اُس نے

شیلنگ کی آواز سنی۔ ممکن ہے وہ اس آواز سے ڈر گئی ہو، اس لیے وہ دوڑ کر ماں کے پاس چلی گئی۔ ہو سکتا ہے نہ گئی ہو۔ شیلنگ کی آواز تو اب یہاں کا معمول بن گئی ہے۔ مگر نہیں، یہ آواز وہ سن ہی نہیں سکتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں ہٹ ہونے والوں کو کچھ بھی سننے کا موقع نہیں ملتا۔ ان کے پاس تو خوف زدہ ہونے کا بھی وقت نہیں ہوتا۔ ایک شیل ان کے گھر کی چھت سے گزرتا کچن میں آ گرا۔ بچی فرش پر گر گئی۔ سبھی کچھ برق رفتاری سے ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے ماں باپ یا دادا دادی سمجھ پاتے کہ کیا ہوا ہے، وہ مر چکی تھی۔ جب تک اس کا باپ اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھاتا، مدد مانگتا، سب ختم ہو چکا تھا۔

اور پھر — پھر ایک ٹی وی کیمرا موقعے پر آ جاتا ہے۔ بعض تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ آمد شیلنگ کے محض ایک یا دو گھنٹے بعد ہوئی ہو گی۔ ہم چھوٹا سا کچن دیکھتے ہیں جہاں اب چھوٹی لڑکی نہیں ہے۔ کچن کا فرش پلاسٹر اور اینٹوں سے، ادھر ادھر پڑے جوتوں سے، اس کے ننھے بوٹوں سے ڈھک چکا ہے۔ ٹی وی کیمرا چھت پر زوم ان کرتے ہوئے شیل کا چھوڑا ہوا سوراخ دکھاتا ہے جس میں سے ٹھنڈک اور آسمان کچن میں در آتے ہیں۔ باپ میز پر اپنے بازو ٹکائے بیٹھا رو رہا ہے۔ کیمرا اس کی نیلی آنکھوں اور آنسوؤں کا کلوز اپ دیتا ہے۔ حقیقت میں یوں لگتا ہے جیسے وہ "ان کیمرا" رو رہا ہو — تاکہ ہم، یعنی ٹیلی ویژن ناظرین، یہ تسلی کر لیں کہ اس کے آنسو اصلی ہیں، کہ وہ واقعی رو رہا ہے، وہ، مری ہوئی بچی کا باپ۔ وہ شخص کسانوں کے کام آنے والے موٹے اون کا سفید پل اوور پہنے ہے۔ عام طور پر کچن میں ایسے گرم کپڑے نہیں پہنے جاتے، کر سنبھلے جیسے لگتا لیکن ہم اس سردی کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں جو جنگ میں اس وقت وہ بھگت رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے ہٹ کر کیمرا اس کے پل اوور پر آتا ہے تاکہ یہاں ہم وہ جگہ دیکھ سکیں جہاں اس نے فرش سے اٹھا کر اپنی لڑکی کو اپنے بدن سے لگایا تھا اور جہاں وہ مر چکی تھی۔ خون ابھی سوکھا نہیں ہے۔ دکھائی دیتا ہے، سرخ، بالکل تازہ لگتا ہے۔ لیکن کیمرا دور ہٹ جاتا ہے، ہاتھ لگائے بغیر میں اس اون کو پہچانتی ہوں جس سے باپ کا پل اوور بنا گیا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے میں اسے اپنے پوروں سے محسوس کر رہی ہوں۔ کیسے چبھتی ہیں اس اون کی سوئیاں، اور خون آلودہ اون تو اور بھی کسی طرح چپچپا لگیلا رہتا ہے۔ خون کو دیکھنے کے بجائے میں سوچ رہی ہوں۔ پھر بھی کیمرا لوٹ لوٹ کر بار بار اس پر ٹھہر جاتا ہے۔ یہ بالکل

غیر ضروری ہے۔ مگر اس طرح کی تصویروں سے آپ بچ نہیں سکتے۔ کوئی نہیں ہے جو کہے کہ بھئی یہ سب بے کار ہے۔

اب ہم اسپتال میں ہیں۔ ماں کو پہلی بار دیکھتے ہیں۔ رپورٹر کی آواز بتاتی ہے کہ ماں کے پیٹ میں زخم آئے ہیں۔ تب وہ رپورٹر (مرد یا عورت) ایک بات قطعی طور پر لغو اور فضول کہتا ہے۔ جس عورت کا بچہ ابھی ابھی مرا ہو اُس کی اِبتلا اور یاس کے لمحے میں آخر اس بک بک کی کیا ضرورت ہے۔ رپورٹر کی آواز کہتی ہے کہ یہ نوجوان عورت شاید اب اَور بچے پیدا نہ کر سکے گی۔ وہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے ایک طرح کے اسٹریچر پر پڑی ہے۔ وہ سسکیاں لیتی ہے۔ اُس کی آواز ایسے آتی ہے جیسے ٹوٹی ہوئی، ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہو۔ باپ اپنے سُرخ دھبّے والے سفید پُل اوور میں آتا ہے اور اُسے گلے سے لگا لیتا ہے۔ صاف ظاہر ہے وہ چھوٹی بچی کی موت کے بعد پہلی بار یہاں سے ہیں، اسپتال کے کمرے میں، "آن کیمرا" پہلی بار۔ ماں کوئی آواز نکالتی ہے؛ کسی اَور جگہ، اَور وقت میں اِسے شاید چیخ یا واویلا کہہ سکتے تھے، یہاں بس ایک خالی پن کا آوازہ ہے یہ۔ اِس آواز سے عورت نے اپنے شوہر کو بتایا ہے کہ ابھی ابھی وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔ یہ خاتمہ ہے۔ جی ہاں، خاتمہ نہیں تو اَور کیا ہے۔ کیمرا اُس ماں کے غیر انسانی اندوہ سے آگے نہیں جا سکتا جس نے اپنا بچہ کھو دیا ہو۔ اب نہ تو ہم (ٹیلی وژن ناظرین) اور نہ ہی کیمرے کے پیچھے کھڑے لوگ (جو ہمیں نظر نہیں آتے: رپورٹر، کیمرا مین، ساؤنڈ مین)، ہم اَب اَور برداشت نہیں کر سکتے۔ اِسے رُک جانا چاہیے، اَب رُک جانا چاہیے۔ میں دل ہی دل میں دُہراتی ہوں، اور کیمرا رول کرتا رہتا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا، لیکن نظر جو آ رہا ہے وہی ہے۔ اب ہم ایک سفید چادر دیکھ رہے ہیں جس پر سُرخ دھبّے پڑے ہیں۔ ہم پہلے ہی اسے ممنوع قرار دے چکے ہیں۔ اِس علامت کو پہچانتے ہیں ہم۔ سفید پر سُرخ، یہ علامت موت کی ہے۔ خدایا! اس کا خون کتنا چمک دار ہے، میں سوچتی ہوں، اور میرا پورا وجود چیختا رہتا ہے: بس، بس، بس کرو! میں نہیں چاہتی کیمرا اُس چادر میں داخل ہو جس سے اُس کا چھوٹا سا بدن ڈھکا ہوا ہے۔ لیکن کسی کا ہاتھ میرے خیالوں پر سبقت لے جاتا ہے اور سفید چادر اُٹھا دیتا ہے۔ چہرہ، ہم اُس کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ اُس کا ننھا مسخ شدہ چہرہ جو اَب انسان کی صورت نہیں ہے۔ سیاہ بالوں کے میلے کچیلے گچھوں کے فریم میں گھِرا ہوا۔ اُس کی

اَدھ کھُلی آنکھیں۔ ہم ایک موت کا کلوزآپ دیکھتے ہیں، اور پھر ___ کٹ! جنازہ۔ لوگ کچھ کہتے ہوے، ایک "آف اسکرین" آواز، باپ، دادا، اُتھلی یخ بستہ زمین میں ایک چھوٹا سا تابوت۔ رپورٹ ختم ہو گئی۔ مجموعی طور پر یہ تین منٹ چلی۔

لمحے بھر بعد ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ٹی وی براڈکاسٹ جو ہم نے ابھی دیکھا ایک فیملی کی ٹریجڈی ہے جسے اُن کے بچے کے ہلاک ہونے کے صرف دو گھنٹے بعد فلم بند کیا گیا اور یہ کہ: یہ پوری ٹریجڈی "آن کیمرا" واقع ہوئی ہے! بس ایک چیز جس کے ہم عینی شاہد نہیں ہیں، وہ ہے ڈھائی برس کی "الف میم" کی موت کا لمحہ۔ جس وقت شیل چھت کو لگے اُس وقت باہر سے ایک ٹیک (take) کی جائے۔ پھر اندر کا ایک منظر جب لڑکی کرسی سے گرتی ہو، سلوموشن میں، بالکل یوں لگے جیسے اُڑتی چلی جا رہی ہے۔ اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر پائی کا ایک ٹکڑا زمین پر گرے اور لڑھکتا چلا جائے۔ یہ ہوئی نا بات! رپورٹر بہت خوش ہے۔ کیوں نہ ہو، ٹھیک تو ہے! اب ہم لوگ بھی، یعنی عوام، اتنے بالغ ہو گئے ہیں کہ جس ڈاکیومنٹیشن (documentation) پر ہم ایمان لائے ہیں اُس کے نام پر یہ سب برداشت کر لیں گے۔ بس یہی ایک چیز ہے جو ہم نے اب تک اپنے ٹی وی اسکرین پر نہیں دیکھی، اَور سب کچھ دیکھا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ سر کٹی لاشوں کو سوَر اور کتے کھا رہے ہیں۔ دیکھا کہ نوکیلے ہتھیار سے دیدے نکال کر پھینک دیے گئے ہیں۔ ہم نے انسانی بدن کے بکھرے ہوے ٹکڑے دیکھے جو اَب کسی بھی جسم، کسی بھی چیز سے متعلق نہیں ہیں۔ پنجر اور اَدھ کھائی کھوپڑیاں، بےٹانگوں کے بچے۔ اور ہم نے شیر خوار دیکھے جنھیں چھپ کر بیٹھے ہوے کسی رائفل بردار نے گولی ماری تھی۔ اور ہم نے زنا بالجبر کی شکار بارہ سالہ بچی دیکھی جو کیمرے کے سامنے بیٹھی روداد سنا رہی تھی۔

دن پر دن گزرتے جاتے ہیں۔ بوسنیا میں موت کو زیادہ، اَور زیادہ بہتر طریقے پر ڈاکیومنٹ کیا جا رہا ہے۔ دس مہینوں میں سرائیوو پر آٹھ لاکھ شیل گرے۔ شہر میں اَسّی ہزار بچے محبوس ہیں ۔ گویا یہ بچوں کا دنیا میں سب سے بڑا قید خانہ ہے۔ اُن میں سے پانچ ہزار (بچے!) مار دیے گئے، یا بس، مر گئے۔ باقی بھوک اور طویل موت، آہستہ رو موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ پچاس برس پہلے یہودیوں نے دکھ بھوگے تھے، اب مسلمانوں کی باری ہے۔ کیا آپ کو آوش وِتز

(Auschwitz) یاد ہے؟ واقعی؟ کیا کسی کو این فرینک یاد ہے؟ ہاں ہاں، ہمیں سب کچھ یاد ہے، اور اسی یادداشت کی وجہ سے ہمیں خیال آیا کہ ہر چیز کو بہت احتیاط سے ڈاکیومنٹ کیا جائے تاکہ وہ شرم ناک تاریخ کبھی نہ دُہرائی جا سکے۔ اور اب، دیکھیے، وہی سب پھر ہو رہا ہے۔ اسکولوں میں نسلوں نے کنسنٹریشن کیمپوں کے بارے میں، موت کے بارے میں جانکاری حاصل کی؛ نسلیں جن کے والدین قسمیں کھاتے تھے کہ جو کچھ ہوا دوبارہ نہیں ہوگا۔ کم سے کم یوروپ میں تو نہیں ہوگا۔ جی ہاں، بالکل درست، ماضیٔ قریب کی زندہ یادداشت کی وجہ سے (نہیں ہونا چاہیے)۔ اور وہی لوگ (وہی لوگ!) یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ تو پھر اُس تمام ڈاکیومنٹیشن نے کیا بدلا؟ اُن موت کی شعوری اور ٹھیک ٹھیک پک کیپنگ کر کے جو سرائیوو میں مرنے والوں کے ٹرانسمیشن دیکھتے ہوئے گویا ہماری زندگیوں میں، ہمارے لونگ روم میں، واقع ہو رہی ہوتی ہے، آخر اب کون سی چیز بدلی جا رہی ہے؟ چھوٹی بچی کی موت بہت سی بیہت ناکیوں میں سے ایک ہے۔ اُن میں سے تو ہر ایک، ہمیں اور بھی زیادہ بھیانک باتوں کے لیے تیار کر دیتی ہے۔

سب سے بڑی تبدیلی تو ہمارے اندر واقع ہوئی ہے، ہم جو حاضرین، تماشائی اور پبلک ہیں۔ کاسٹ کی اس تنظیم میں ہم نے اپنے پبلک کے رول کو حقیقت سمجھنا شروع کر دیا ہے؛ اور یہ بھی کہ پبلک کا رول ادا کرنا ممکن ہے۔ گویا جنگ نہیں، کوئی تھیئٹر ہے۔ بہت آہستگی سے، اور ہمارے جانے بغیر، کوئی چیز ہم میں سرایت کر گئی ہے، ایک نوع کی سختی، حقیقت کا ادراک نہ کر سکنے کی معذوری۔ یہ علامتیں ہیں ہمارے اپنے خاتمے کی۔ بچی کے مُردہ چہرے کا کلوز اپ کچھ زیادہ ہی ہو گیا، نہ ہوتا تو (ہمارے لیے) بہتر تھا۔ یہ احساس کہ جنگ کو پہلی بار اس قدر نزدیک سے اس کی انتہائی بھیانک تفاصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے، صرف اُس وقت بامعنی بن سکتا ہے جب اس کی وجہ سے کسی چیز میں بہتری اور تبدیلی آ سکتی ہو مگر بدلتا تو کچھ بھی نہیں۔ اس لیے اس قبیل کا ڈاکیومنٹیشن مریضانہ بے راہ روی، موت کی پورنو گرافی بنتا جا رہا ہے۔

عرفان ہوروزووِچ

ترجمہ: اسد محمد خاں

بوسنیا کا بچار

اُس نے قسائی کو آتے نہیں دیکھا۔ دکھائی دیتی دنیا کی شبیہیں اُس کی نیند بھری آنکھوں میں دھندلی شکلیں اختیار کرنے لگیں۔ اُس پر کیا گیا وار اِس بات سے کچھ اور زیادہ بھیانک بن گیا۔ اُس نے اپنا سر اچانک باقی بدن سے الگ ہوتا محسوس کیا۔ لگا کہ اُس کی زندگی ہی کسی خوفِ آئندہ سے کٹ گئی ہے اور یوں لگا کہ اُس کی دُم اب ماضی کی اور مستقبل کی سب جونکوں کے مقابل بے طاقت ہے۔

بڑھتی ہوئی تکلیف کی ہنگت میں اُس چھوٹے بچار نے خود کو پہلے کبھی اتنا بڑا محسوس نہیں کیا تھا۔

وہ مرا نہیں۔ اُس کے گھٹا ٹوپ تاریک حواس اُس وقت جاگ اٹھے جب فولاد کے جبڑوں نے کاٹنا، چیرنا اور چبانا شروع کیا اور اُس کا گوشت، اُس کی جان غذا بن گئی؛ نہ سیر ہونے والے دندان و شکم کے لیے اصلی غذا، جو خود کو کھایا جاتا ہوا دیکھتی تھی! اُس نے وہ قصبے دیکھے جن کے بیچ سے اُس کا گوشت کھینچ کر لے جایا جا رہا تھا۔ اُس نے ریپ کی ہوئی گڈرنیوں کی آنکھوں میں اپنے ویلانت دیکھے۔ اُس نے سفر تباہ کیے ہوئے مکانات دیکھے اور بوڑھے آدمی دیکھے، پر وہ بندوخت درختوں کے

اُن مُنٹھوں سے مشابہ تھے جو رات میں دہکتے ہیں۔ اُس نے ہجوموں کو ریلا بنائے جلاوطنی میں نکلتے دیکھا۔ یوں لگا جیسے اُس کا خون ٹُلاریوں میں بہہ رہا ہو۔

اُس نے دیکھا اور اُس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

مگر کھیل تو اَب شروع ہوا تھا۔

عین مین قربانی کے اسپینی تھیئٹر کی طرح اُس کا چھوٹا سا مَرغ زار مبصّروں، حامیوں اور مشیروں سے آباد ہو گیا۔ بلند چیخ کے بعد اچانک سناٹا چھا گیا۔ دوا کی تاثیر والی بُوٹی اُس نے بےدھیانی میں چَر لی تھی اور اُس کے رَس خون میں شامل ہو گئے تھے، سو اُس کی توجہ اُن نیزے بازوں کی طرف سے ہٹ گئی جو مشقت میں تھرتھراتے پُٹھوں کے ساتھ اُس کی نبض، اُس کی شریانوں، اُس کے دل پر نشانہ سادھ رہے تھے۔ لوہے کے گینڈے اُس کے معدے کی طرف اور شانوں کی ہڈیوں کی طرف چلے۔ اُن کے سواروں کے پاس بَیل کے گوشت کے چارٹ موجود تھے جن کی نقلیں "عظیم دکانِ قصاباں" سے حاصل کی گئی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ چانپیں کون لے گا، دَست کس کے حصّے میں آئے گا، پائے کس کے ہوں گے، دُم کس کو ملے گی، دل، آنکھیں، مغز، کلّہ اور زبان ـــ یہ کون کون لے گا۔ وہ جانتے تھے، اور جھگڑتے تھے۔

ضیاع سے بچ جانے والی یادداشت سے طاقت حاصل کرتا ہوا بجار اپنی ٹانگوں کے بل اُٹھا۔ ٹھیک اُسی وقت لوہے کے دندانوں والے سینگ نے اُسے زمین پر گرا دیا اور روندی ہوئی پوشیدہ گھاس پر رگید کر داب لیا۔ اب وہ ایک جیتی جاگتی یادگار کے مشابہ تھا جو فولادی پرندوں کے لیے ہدف کا کام دے رہی تھی کہ پرندے اسی آسمان سے اُس پر اپنے بُخارات کے خدنگ مارتے تھے۔ اُسے اب کچھ بھی سنائی نہ دیتا تھا، نہ خوشی کے نعرے، نہ ہی خفگی کے آوازے۔ اُس نے تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ جس دوران میں فولاد کے پرندوں کا کرتب جاری رہا، کس طرح لوہے کے گینڈوں کو ایک طرف سرکا دیا گیا تھا تاکہ منظر کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ بس ایک گینڈا جو اُسے دبوچے ہوئے تھا وہیں رہا، باقی موقعے کے انتظار میں دائرہ وار گردش کرتے رہے۔

آخرکار اُس نے سر ڈال دیا۔ اُس کا سینہ، اُس کی ٹانگیں ڈھے گئیں۔

قصّاب ٹکڑوں پر جھگڑ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے دانتوں اور دندانے دار سینگوں

سے دھمکاتے اور اُن وعدوں اور خفیہ معاہدوں کے حوالے دیتے جو "عظیم دکانِ قصابان" میں طے پاتے تھے۔ مبصر جھگڑے میں کود پڑے۔ حامیوں نے وہ ناقابلِ برداشت جہنم دھاڑ مچائی کہ بجار کے کٹے ہوئے سر، اُس کے چِرے ہوئے حلق سے جو تاریک صدا نکلتی تھی، حامیوں کے غوغا نے اُسے پوری طرح دبا دیا۔ حلقوم سے نکلتی ہوئی وہ آواز نزع کی خرخراہٹ تھی جس میں یادداشت کی پرچھائیاں چلتی محسوس ہوتی تھیں؛ کچھ ایسا لگتا تھا کہ ایک متوازی دنیا کی نفیری پھونکی جا رہی ہے، نئی پیدائش جیسی۔

ٹکڑوں میں قتل کیا ہوا بجار اُٹھا، اپنے قامت سے کھڑا ہو گیا۔

وہ اُسی طرح کھڑا ہو گیا ــــ کچھ ٹیڑھا، بےڈھب، مگر بےجگری سے، اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے۔

ابتدائی حیرت کے بعد جب چونکے تو سب قصاب، لوہا گینڈوں کے مالک، فولادی پرندے ہنکانے والے اور مبصرین، سب جھپٹ پڑے۔ قسائیوں نے جُدا کیے ہوئے ٹکڑوں کو، جو اُس کے بدن سے ابھی تک چپکے تھے، پیش اندیشگی ہی میں پھر قتل کیا۔ اپنے چاقوؤں کو عین پیش اندیشگی تک پہنچاتے ہوئے انھوں نے ہڈیاں اور اعصاب کاٹ دیے۔

بجار کھڑا تھا اور چیخ مارتا تھا۔

مبصر، حامی اور مشیر جنگلے کے پیچھے دوبارہ اپنی جگہوں پر جا بیٹھے اور تماشا دیکھنے لگے، جس میں ہر قاعدے ضابطے پر ٹھوکا جا رہا تھا۔ انھوں نے قتل دیکھا جس کا ظہور قتل سے ہوا تھا، اور قتل کا مشاہدہ کیا جو اگلے قتل پر منتج ہو رہا تھا۔ انھوں نے سادہ قتل، اور چھانٹ چھانٹ کر اور قرعہ ڈال کر مارنے کا عمل، اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں شکار کرنے کی کارروائی ملاحظہ کی۔ وہ دیکھتے رہے اور انتظار کرتے رہے۔ وقت تھم گیا۔ جنگلے کے پیچھے تھم گیا۔ درد کی نبض چلتی رہی۔ ہر ایک انتظار کرنے لگا کہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں قتل کیا جاتا چھوٹا بجار کب مغلوب ہوتا ہے، ایک سبزی خور اپنے پُرشکوہ سینگ فلک کی جانب اُٹھائے کب گھٹنوں کے بل آتا ہے۔

جولین بارنز

ترجمہ : اسد محمد خاں

ہملٹ وائلڈ ویسٹ میں

امریکا میں سِوِل وار ختم ہونے کے کچھ برس بعد انگریزوں کا ایک تھیئٹریکل ٹروپ مغربی مِزُوری کے ایک چھوٹے قصبے میں پہنچا۔ وہ اِس ڈھب کا قصبہ تھا کہ وہاں کے بیشتر لوگوں نے دو دو پیشے اختیار کر رکھے تھے: مے خانہ چلانے والے نے ایک اصطبل بھی کھول رکھا تھا، قصبے کا شیرف بندوق سازی بھی کرتا تھا، جب کہ اسکول کی اُستانی بھلے مانس مسافروں کو پے اِنگ گیسٹ ٹھیرا لیتی تھی بشرطے کہ وہ سُتھری عادتوں کے ہوں اور کُھلے ہاتھ سے خرچ کرتے ہوں۔ ان سب باتوں میں انگریز ایکٹروں نے بڑی اپنائیت محسوس کی ہوگی، بالکل گھر جیسا لگا ہوگا۔ وہ خود کیوں کہ تعداد میں کم تھے اس لیے ہر آدمی کو مستقل دو دو پارٹ کرنے پڑتے تھے۔ جیسے ہی وِلن گولی کھا کر مرتا، وہ پادری بن کر خود کو دفن کرنے چلا آتا۔ مجبوری تھی۔ خواہ وہ ٹریجڈی کر رہے ہوں، کوئی میلوڈراما یا کامیڈی، یہ ایکٹر خود کو اتنی بار کاسٹیوم اور لہجے بدلتے ہوئے پاتے تھے کہ لگتا تھا جیسے وہ فرنچ زبان کا مزاحیہ ناٹک کھیل رہے ہوں۔

جس رات کی یہ کہانی ہے، انگریزوں کا یہ ٹروپ 'ہملٹ' کھیلنے والا تھا۔ اس کھیل کی وجہ سے منڈلی پر مستقل ایک فالتو بوجھ پڑ رہا تھا کیوں کہ اٹلانٹک پار کرتے ہوئے اُن کی سُپر اسٹار یعنی

اوفیلیا کھیلنے والی لڑکی کو جہاز کے کپتان نے گھر بسانے پر آمادہ کرنا شروع کر دیا تھا اور بالالتزام امریکا کے خطّے مڈویسٹ کے بارے میں ایسی ایسی بھیانک کہانیاں سنائی تھیں کہ اوفیلیا کھیلنے والی نے شادی کی پیش کش فوراً قبول کر لی تھی۔ کپتان نے روایت کے مطابق اپنا بحری حق استعمال کرتے ہوئے شادی کی یہ تقریب بھی خود ہی سرانجام دینے کا فیصلہ کیا۔ گویا اِس بار اُس نے بھی ڈبل رول کیا: ایک سویلین اتھارٹی کا، دوسرا دولھے کا۔ ٹروپ کے دوسرے ممبر اپنے جذبات کو دوچند کرتے ہوئے کپتان کی کیبن کو گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سب ظاہر کر رہے تھے جیسے خوش ہیں۔ بعض واقعی سچّے دل سے اِس نوعمر ایکٹریس کی خوشی میں شریک تھے مگر ساتھ ہی بے حد ناراض بھی تھے کہ اوفیلیا کا رول اب پچاس پچاس برس کی دو بہنوں میں سے ایک کو کرنا پڑے گا۔

بہ ہر حال، جیسے جیسے وہ نیویارک سے دور ہوتے گئے مسئلہ ختم ہوتا گیا، کیوں کہ اُن کے کچھ ہی ناظرین نے پہلے کبھی کھیل 'ہملٹ' دیکھا ہو گا۔ بہت سوں نے تو کبھی تھیئٹر ہی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ہر چیز اُنھیں معجزاتی طور پر انوکھی اور بالکل نارمل لگتی تھی یعنی شیکسپیئر کی زبان، حد سے زیادہ حیران کن ملبوسات، ناموجود سینری۔ یہ بھی انوکھا اور معمول کے مطابق لگتا تھا کہ کھیل کا دورانیہ اب ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رہا تھا۔ اُسے اتنا مختصر کر دیا گیا تھا کہ بس بنیادی سین رہنے دیے گئے تھے: ہملٹ کے باپ کے بھُوت کا ظاہر ہونا، پولونیئس کا قتل، ایک اَدھیڑ عمر اوفیلیا کا پاگل ہو جانا، کلوڈیئس کی سازش، قبر کھودنے والا منظر اور آخری ڈوئل۔

مِزُوری کے قصبے کا تھیئٹر بہت کچھ اسی تھیئٹر جیسا تھا، سوائے اس کے کہ دن میں وہ مے کشی کا سَلُون بن جاتا تھا؛ سیٹیں آپ کی اِن سیٹوں کی طرح تھیں، سوائے اس کے کہ وہ تکلیف دہ تھیں اور ناکافی تعداد میں تھیں۔ حاضرین آپ ہی جیسے تھے، سوائے اس کے کہ بعض اپنی بیلٹ میں گنیں لگائے ہوئے تھے اور اُن میں سے کسی ایک کو بھی 'ہملٹ' ڈرامے کا پلاٹ نہیں معلوم تھا۔ تین مہینے کے دورے میں انگریز ایکٹر اچھی طرح جان گئے تھے کہ کھیل کے کن حصّوں پر زور دینا ہے، کن کو دھیما رکھنا ہے، کس کس حصّے کو نکال باہر کرنا ہے۔ اُنھیں اِس بات کی بھی عادت ہو گئی تھی کہ ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھی ہوئی آج کی کسی فیملی کی طرح، حاضرین بلند

آواز سے کھیل کے بارے میں مسلسل اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے رہتے تھے۔ 'ہملٹ' کی کہانی ــــ ٹریجڈی جسے جھیل کر انھوں نے میلوڈراما بنا دیا تھا ــــ اپنی سادہ ترین شکل میں بھی حاضرین کو پُرجوش اور مشتعل کر سکتی تھی، طیش میں لا سکتی تھی، اُنھیں غم زدہ اور گداز بنا سکتی تھی۔ ہملٹ کے باپ کا بے سر کا بھوت اپنی کھوپڑی خود اپنے ہاتھ میں اُٹھائے اِدھر سے اُدھر جاتا ہوا ہمیشہ زبردست کامیابی سے ہم کنار ہوتا تھا۔ پردے کے پیچھے پولونیئس کے ہلاک کر دیے جانے پر بعضے تو اس ناانصافی کا اتنا اثر لیتے کہ شور مچانے لگتے اور بعض اپنی بھرّائی ہوئی آواز میں خوب ہنستے۔ ہملٹ کا شاہ کلوڈیئس کے قتل سے اُس وقت باز رہنا کہ جب بادشاہ دعا کر رہا ہوتا، بعضوں کو تو بہت پسند آتا اور بعضے اتنا اچھا موقع کھو دینے پر غرقِ حیرت ہو جاتے۔ شمشیروں کی آخری جنگ اور جدال و قتال پر شوروشغب اور بڑھاوے کے نعرے، احتجاج اور ہمّت شکنی کی آوازیں، سبھی اپنے عروج پر ہوتی تھیں۔

***

اُس رات سےَلون میں بڑی گرمی تھی۔ حاضرین معمول سے کچھ زیادہ ہی محویت میں تھے اور خوب شور کرتے تھے۔ اوفیلیا کی موت کا حال بیان کیا گیا تو حاضرین نے اتنی خاموشی سے سُنا جیسے سب سکتے میں ہوں۔ کلوڈیئس کی سازش پر معمول سے زیادہ خفگی ظاہر کی گئی۔ کلوڈیئس نوجوان لیئر تس کی تلوار کی نوک نامعقول حد تک دِکھا دِکھا کے زہر آلود کرتا تھا اور حاضرین کی ہُوٹنگ سے شہ پا کر اُس نے اپنی حرکات میں کچھ زیادہ ہی خباثت ڈال دی تھی۔ تلوار بازی شروع ہوئی اور اُس مرحلے پر پہنچی کہ جب ہملٹ کو زخم لگنے والا ہے جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے گا۔ خود لیئر تس پر زہر اثر کر چکا ہے، وہ بےمدافعت شہزادے کو چرکا لگانے ہی والا ہے کہ ناگاہ حاضرین میں سے ایک کاؤبوائے اٹھا اور اُس نے "دھت تیری!" کر کے لیئر تس کو گولی مار دی۔ اِس پر اُس کے قریب بیٹھے دوسرے کاؤبوائے نے اٹھ کر احتجاج کیا اور کہا کہ میرے دوست نے غلط بدمعاش کو جہنم واصل کیا ہے، سو اُس نے شاہ کلوڈیئس کو، جو تختِ شاہی پر پڑا اَینڈ رہا تھا، تُرنت گولی مار کر

ہلاک کر دیا۔ شیرف نے، جو بندوق ساز بھی تھا، کاؤبوائے صاحبان کو غیر مسلح کر دیا اور سرجن کو بلا لیا۔ انگریز ایکٹروں کے نصیب اچھے تھے جو پستول اُس زمانے میں زیادہ درست نشانے کے نہیں ہوتے تھے جیسا کہ بعد کو ہالی وُڈ میں ہونے لگے۔ اس لیے ماحول جب ذرا پُرسکون ہوا تو لیئرٹس نے، جو کئی منٹ سے مُردہ پڑا تھا، ایک آنکھ کھول کر جائزہ لیا، پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کلوڈیئس بھی مُردے سے زندہ ہو گیا، اگرچہ اُس کے بازو کے پُر گوشت حصّے میں گولی لگی تھی۔ سو گرم لوہے سے داغنے اور پٹّی کرنے کے لیے سرجن کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بعدہ کلوڈیئس نے اس صورتِ حال کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ پارٹ کرتے ہوے وہ بادشاہ کو ایسا آزمودہ کار سپاہی بنا کر پیش کرنے لگا جسے ایک زخم نے اب بھی پریشان کر رکھا ہے۔

کیوں کہ انصاف کی فراہمی اُن دنوں تیزی سے ہوتی تھی اس لیے پانچ آدمیوں کا مقدمہ اگلے ہی دن پیش ہوا۔ کاؤبوائے صاحبان پر اقدامِ قتل اور بلوے کی فردِ جرم لگائی گئی جب کہ تین ایکٹروں ــــ کلوڈیئس، لیئرٹس اور خود ہملٹ ــــ کا جرم یہ بیان کیا گیا کہ انھوں نے بلوے کی ترغیب دی ہے۔ پانچوں آدمی کٹہرے میں بیٹھے جس کا پہرہ شیرف دے رہا تھا، جو بندوق ساز بھی تھا۔

شہادتیں گزاری گئیں کہ کاؤبوائے پچھلی رات بالکل نشے میں نہیں تھے، باہوش تھے؛ اور یہ کہ اُنھوں نے پہلے کبھی ناٹک ہوتے نہیں دیکھا تھا؛ اور یہ کہ وہ پوری سچائی کے ساتھ سمجھ رہے تھے کہ وہ ہملٹ کی جان بچا رہے ہیں۔ گواہوں نے صاف صاف یہ بیان دیا کہ کاؤبوائے بہت پہلے سے اچھے کردار کے مالک ہیں۔ دوسرے تین مدّعاعلیہان کے بارے میں، ایکٹر ہونے کی بنا پر، یہ قیاس کیا گیا کہ وہ پہلے ہی سے بُرے کردار کے لوگ ہوں گے۔

جج، جو سرجن بھی تھا، امریکی سِول وار کا آزمودہ کار سپاہی تھا۔ وہ اُن دانش مندوں میں سے تھا جو اپنی قانون کی کتابوں سے باربار رجوع نہیں کرتے۔ وہ جانتا تھا کہ حقیقت کا مستقل پیچھا کرنے کے مقابلے میں تصوّر کی ایک ٹھیک ٹھاک جَست لگا کر اکثر و بیشتر بہت ہی خوبی سے انصاف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے دُہرے پن کو بھی سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ممکن ہے ہمارے آج کے دوست کبھی ہمارے دشمن بن جائیں، تو اس کا منطقی جواب یہ ہو گا کہ ہمارے

دشمن کبھی ہمارے دوست بھی بن سکتے ہیں، چناں چہ بنی نوعِ انسان کی حیثیت سے یہ ہمارا آخری سہارا ہے۔ جج کا فیصلہ مژوری کی ریاستی حدود میں نافذ قانون سے ایک اعتبار سے ٹھیک ٹھیک مطابقت نہیں رکھتا تھا (تاہم فیصلہ تھا)۔ جج نے دونوں کاؤبوائز کو اس بنیاد پر بے قصور ٹھیراتے ہوئے کلوڈیئس اور لیئرتس کے قتل کے الزام سے بَری کر دیا کہ کلوڈیئس اور لیئرتس تصوّر کی پیداوار، خیالی مخلوق ہیں، اُنھیں کوئی قتل نہیں کر سکتا، ماسوا اُس کے جو خود خیالی مخلوق ہو۔ اُس نے بَلوے کے الزام میں کاؤبوائز کو مجرم گردانا: اُنھیں قصبہ بدر کیے جانے کا حکم دیا۔ مزید بر آں یہ کہا کہ جب وہ ایک بار قصبے کی حدود سے باہر ہو جائیں تو واپس لائے جائیں اور اُن کے جیالے پن اور عوام دوست رویّے پر اُنھیں میونسپلٹی کے فنڈ سے انعام دیا جائے۔ اس فیصلے میں ہملٹ، کلوڈیئس اور لیئرتس کو بلوے پر اکسانے کا مجرم قرار دیا گیا: اُنھیں میونسپلٹی کے فنڈ سے پہلے کچھ انعام دیے جانے کا حکم ہوا کیوں کہ انھوں نے تحمل کیا تھا، یعنی جب اُن پر گولی چلائی گئی تھی تو خود کو جواباً لڑنے سے روکے رکھا تھا۔ پھر حکم ہوا کہ انعام کے بعد سزا کے طور پر اُنھیں قصبے سے نکال باہر کیا جائے اور اُس سمت میں ہنکا دیا جائے جدھر وہ اپنا اگلا کھیل پیش کریں گے۔

جج، جو سرجن بھی تھا، اِس اصول پر ایمان رکھتا تھا کہ انصاف کے تقاضے نہ صرف پورے کیے جائیں بلکہ پورے ہوتے دکھائی بھی دیں۔ اس لیے اُس نے نہ صرف دوسرا بلکہ تیسرا پیشہ بھی اختیار کر رکھا تھا اور وہ پیشہ تھا ایک مقامی اخبار کے مالک کا، جس کا اگلے روز ایک خصوصی ایڈیشن شائع ہوا۔ اخبار کے کرائم رپورٹر نے، جو صرف اس اشاعت کے لیے ڈبل رول کر رہا تھا اور تھیئٹر کا تبصرہ نگار بنا ہوا تھا، واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہوئے کہ گویا وہ بھی وہیں موجود تھا، خاص طور پر سرجن کی پیشہ ورانہ مہارت اور جج کے عدل و دانش کو باری باری زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ قصبے سے دوڑا دیے جانے سے قبل انگریز ایکٹروں نے اخبار کی بہت سی کاپیاں خرید لی تھیں۔ اور چوں کہ ہملٹ میرے پردادے تھے، جبھی میں آج رات یہ کہانی آپ کو سنا رہا ہوں۔

منوج داس

ترجمہ : اسد محمد خاں

جنگل

مسز متی نے سنا، دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ کتنی ہی دستکوں کے بعد اس کی آنکھ کھلی۔ بہت نرمی سے، کئی کئی منٹ کا وقفہ دے کر دروازہ تھپ تھپایا جا رہا تھا۔

اصل میں یہ چوکیدار کی مجبوری تھی۔ وہ اس کے برخلاف کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اُسے پتا تھا۔

مسز متی نے نظروں ہی نظروں میں ہال کا جائزہ لیا۔ اس کے پیروں میں راجا صاحب پڑا تھا، جیسے ڈھے جانے پر فحش مٹی کا ڈھیر۔ چھ آٹھ مکھیاں راجا کے سُوجے ہوئے ہونٹوں کی دراڑ میں پِک نک منا رہی تھیں۔ ایک طرف اکڑباز چکودی صاحب، جو عام حالات میں بڑا معزز بنتا تھا، یوں پڑا خراٹے لے رہا تھا جیسے سؤر خرخراتا ہے۔

متی صاحب اور چکودی کی بیوی ایک دوسرے کی طرف رخ کیے فرش پر پڑے تھے؛ شاید ایک دوسرے کے لیے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے انٹاغفیل ہو گئے ہوں گے۔

پھر ایک بار دستک ہوئی۔ مسز متی ایک درجہ اَور بیدار ہو گئی۔ آواز نے یادداشت پر چھائی ہوئی کاہلی کے بےڈھنگے تودے سے ایک ٹکڑا اَور کاٹ کے پھینک دیا۔ وہ سب لوگ اتنی گہری نیند میں کب جا پڑے تھے، ظاہر ہے اِس وقت اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ ویسے جو جو کچھ ہوتا رہا تھا

ذرا سی کوشش سے سبھی یاد آتا جا رہا تھا۔ آگ کے گرد ان کا ناچنا، اور سؤر کے مردہ جسم سے (جسے انھوں نے آدھا زندہ ہی آگ پر ڈال دیا تھا) پارچے کاٹ کاٹ کر کھانا اسے یاد تھا۔

وہ لوگ چاہتے تھے کہ ایک رات عہدِ قدیم کے وحشیوں کی طرح گزاری جائے؛ بے طرح ٹھونستے، نگلتے، بلانوشی اور خرمستیاں کرتے لاکھوں برس پہلے کے آدمی کی طرح۔ شراب نوشی سے پہلے چکودی صاحب نے، جو خود کو ان معاملات میں سند سمجھتا تھا، اپنے اس فلسفے پر لیکچر دیا تھا کہ عہدِ وحشت کو کبھی کبھی لوٹ کر آنے دیا جائے کیوں کہ گاہے گاہے جوش و ہیجان کا یہ اُبال آدمی کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس طولانی لیکچر کی کسی کو ضرورت نہیں تھی، مگر چکودی باز نہ آیا؛ اس نے بہر حال تقریر جھاڑ دی۔

ایک بار اَور دستک ہوئی۔ جو کچھ ہو چکا تھا تیزی سے مسز متی کو سب یاد آ گیا۔

ایک دن پہلے، سہ پہر کے وقت، جنگل کے بیچوں بیچ ایک اُجاڑ بنگلے تک پہنچنے کے لیے ان کی جیپ میلوں تک جھاڑیوں اور بکھری ہوئی چٹانوں کے درمیان بہت مشکل سے رستا تلاش کر رہی تھی۔ ایک زخمی تتلی جیپ کے پہیوں کی لپیٹ میں آ گئی اور مسز متی نے چیخ ماری۔ دردمندی اس کے چہرے پر مکھن کی طرح چُپڑی ہوئی تھی۔

"تم بڑی نرم دل ہو بے بی،" چکودی صاحب ریشہ خطمی ہوتے ہوئے بولا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر جھڑبیری کی طرح اُگی ہوئی مونچھ مسز متی کے چہرے کے اس قدر قریب پہنچ گئی کہ لگتا تھا دردمندی کا سارا ہی مکھن چاٹ لے گی۔

چکودی کی بیوی نے یہ سب دیکھا اور ایسے ناک سکوڑی جیسے کسی بدبو سے بچنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، وہ سُوں سُوں کرنے لگی؛ پھر ایک ایک سلے بل پر جھٹکا دیتے ہوئے بولی، "ہاں نا! متی صاحب جیسے بھیڑیے کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ زیادہ ہی نرم ہے۔"

ہمیشہ کی طرح اس کی بات سننے میں بے ضرر تھی، مگر ہمیشہ کی طرح جب وہ بات کہہ چکی تو یوں لگا جیسے چکودی کی بیوی گردوپیش میں کوئی بیماری چھوڑ رہی ہے۔

متی صاحب کا سگار گھوم کر اس کے دہانے کے گوشے میں پہنچ گیا اور دانتوں کی گرفت میں جھک گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ بے تکان بولنا شروع کرے گا۔ تقریر کے دوران وقفے

وقفے سے وہ سامعین کو بےاعتباری سے دیکھتا بھی جائے گا کہ اَب جو وہ دانش کے موتی رول رہا ہے تو کتنوں کی جھولی بھر سکی ہے، کتنوں کی خالی ہے۔

متی کہنے لگا، "سچ پوچھیے تو چکودی صاحب، عورت ایک ایسی مسٹری ہے جسے میں آج تک حل نہیں کر سکا... پَر ایک بات کہوں گا، کہ یہ جو مسز متی کہلاتی ہیں ان میں کوئی سمجھ نہ آنے والی بات ایسی ضرور ہے جو میں شادی کے اتنے برس بعد بھی اٹکا ہوا ہوں۔ قسم سے، دشمن کی جان لینے سے زیادہ مزا ہے میری اس چاہت میں۔

"اچھا چپ کرو! راکنس کہیں کے!" مسز متی چہرے پر رومال اور رومال پر چہرہ جَھلتے ہوئے جیسے احتجاج کرنے لگی۔

اسی طرح اَور کچھ دیر مسز متی نازک مزاجی دکھاتی رہی، اور چکودی کی بیوی کی جُھلسَن اور بیزاری بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جیپ گھوم کر ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں بائیں ہاتھ پر ایک نصف دائرہ میدان سا تھا۔ تین طرف سے یہ میدان پہاڑیوں سے گِھرا ہوا تھا۔

یہاں مسز متی نے اچانک شوفر کو حکم دیا، "روکو!" جیپ جھٹکے سے رک گئی۔ سب کود کر باہر آ گئے اور مسز متی کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھنے لگے۔ وہ تلوار کی طرح اپنا ہاتھ سونتے، پہاڑی کے دامن میں کھڑے ہوئے ایک اکیلے ہرن کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ سب نے آنکھیں گڑا کر دیکھا۔ تاریک چمکیلی چٹانوں کے مقابل بجلی کے ٹھہرے ہوئے لشکارے کی طرح یہ ہرن جیسے اس منظر میں جم کر رہ گیا تھا۔

لمحے بھر بعد وہ ہِلا۔ جیپ کی وجہ سے اس کا جنگل میں گھسنے کا راستا بند تھا۔ اس لیے وہ ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی پر چھلانگیں مارنے لگا۔

چکودی کی بیوی کے سوا سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ اور مسز چکودی کی آنکھیں! وہ اس وقت آنکھیں نہیں تھیں، بندوق کی نال سے نکلی ہوئی دو گولیاں تھیں جو ہوا میں آگ لگاتی چلی جا رہی تھیں۔

اچانک ہرن نے بہت بڑا خطرہ مول لے لیا۔ وہ ان لوگوں کے قریب سے زقندیں بھرتا، جنگل میں داخل ہو گیا۔ شوفر شیائل کی بندوق کی نال اس وقت جیسے ہرن کی چھاتی پر جا ٹِکی تھی۔

"شُوٹ کرو!" مسز متی چیخی۔

شیامل نے گولی نہیں چلائی۔ اس نے بندوق کی نال زمین کی طرف جھکا دی، اور ہرن کو سنہری خنجر کی طرح گھنے سرسبز میں داخل ہو جانے دیا۔

آنکھوں کی پانچ جوڑیاں شیامل کے لیے اچانک زہر کی دس پچکاریاں بن گئیں۔

جواب میں شیامل بولا، "وہ گابھن تھی صاحب۔ بچہ تھا پیٹ میں۔"

مایوسی اور غصے میں مسز متی کی آواز ایک دم گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے بہ مشکل اتنا کہا، "بدتمیز! ایسی بے ہودہ بات کہنے کی ہمت کیسے کی تُو نے؟" لگتا تھا مسز متی رو پڑے گی۔

چکودی نے تسلی دی، "نا نا نا، طبیعت پر بار مت ڈالو میڈم! مَیں اب کے ایسا کچھ کر دوں گا کہ اگلا چانس تمھارا ہی ہو گا۔ بندوق گود میں رکھ کے بیٹھنا۔ ہاں؟"

مسز متی اب شوفر شیامل کے برابر آ بیٹھی۔ بدتمیز آدمی! صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کے جذبات کا اسے ذرّہ برابر بھی خیال نہیں ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ لفنگا اپنے مالک راجا صاحب کا سوتیلا بھائی تھا۔ شیامل شوفر، سورگیہ بڑے راجاجی کے بےشمار ناجائز بچوں میں سے ایک تھا۔ اگرچہ مرتبے کے اعتبار سے بہت نچلے درجے کی ناجائز اولاد تھا، کیوں کہ اُس کی ماں ریگولرائز نہ ہو سکی تھی، اُسے کل وقتی کنیز کا درجہ ہی نہ مل سکا۔

شیامل، افسردہ سا آدمی، بعضوں کی نظر میں دل کش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ بڑا ماہر شکاری تھا۔ سورگیہ بڑے راجاجی کا شاہی ناک نقشہ اُسے ورثے میں ملا تھا۔ جب کہ راجا صاحب پیٹ بھر کے بدصورت تھے۔ رہی سہی کسر ان کی بےلگام عیاشیوں نے پوری کر دی تھی؛ زندگی کا سارا رنگ، سبھی رس چوس لیا تھا۔ بقول کسے اب تو نصیب میں ٹھنڈی گرمیاں ہی رہ گئی تھیں۔ عورتوں کے گرد منڈلانے، انھیں سُونگھتے پھرنے، ان سے بھڑ کر اُٹھ بیٹھ لینے سے راجا صاحب کی تسلی ہو جاتی تھی۔

بس اِتنے ہی کے لیے راجا صاحب نے یہ جنگل میں منگل ترتیب دیا تھا اور اپنا تقریباً متروک بنگلا کہیں سے جھاڑ پونچھ کے نکالا تھا۔

باقی رستے شیامل خاموش بیٹھا رہا۔ راجا صاحب کی مسلسل بک بک کا ذرا بھی جو اس نے اثر لیا ہو۔

وہ لوگ سہ پہر میں دیر سے بنگلے پر پہنچے۔ ہلکے ناشتے اور بوتل سے شغل کے بعد انھوں نے شکار کے لیے نکلنے کی تیاری کی، مگر شیامل نے جانے سے انکار کر دیا۔ راجا صاحب کچھ دیر تک دہاڑتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اور کیوں کہ اچھا بھلا ہرن کھو دینے پر مسز متی کی نازک مزاجی کو دھچکا پہنچا تھا، اس لیے ظاہر ہے اس نے کہا کہ وہ بھی شکار پر نہیں جائے گی۔

چکودی کی بیوی نے مسز متی کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا، مگر بلا سے دیکھا کرے۔ مسز متی جانتی تھی کہ اس عورت کو متی صاحب کے ساتھ لگ کر جانے کا بہترین موقع ملا ہے؛ وہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گی۔ اُس کا میاں آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا، مگر وہ پروا کب کرتی تھی۔ چکودی صاحب تو اس لائق بھی نہیں تھا کہ تالی بجا کر مرغے مرغی کو بھگا دے۔

مسز متی اور شیامل کو بنگلے میں اکیلا چھوڑ کر بے بسی سے کندھے اُچکاتی ہوئی، باقی پارٹی اندر جنگل میں گھس گئی۔

باقی رہ جانے والا سناٹا، جسے تھوڑی دیر بعد نامانوس آوازیں درہم برہم کر رہی تھیں، دشت کے جُھٹ پُٹے میں مسز متی کے لیے ایک آسیبی تجربہ بنتا جا رہا تھا۔ اس نے بَولا کر ایک اَور گلاس بنایا اور چڑھا لیا، اکیلے ہی۔

اُس وقت جیسے ایک دم مسز متی کو محسوس ہوا کہ شیامل کی یہ ضدی اداسی اور خاموشی خود اس کے لیے چیلنج ہے۔

اس نے پوچھا، "شیامل، یہ کیا آواز ہے؟"

"شیر کی دہاڑ ہے میڈم۔"

برآمدے میں بچھی کرسی سے چھلانگ لگا کر مسز متی ہال کی طرف دوڑی، اور ہڑبڑاہٹ میں دروازے پر ہی گر گئی۔ اُس وقت تک اس نے اٹھنے کی کوشش نہ کی جب تک کہ شیامل اٹھانے نہ پہنچ گیا۔ اور جب وہ پہنچا تو بس اِتنا اٹھی کہ اُس کے بازوؤں میں ڈھیر ہو سکے۔

پھر اپنے اس مصنوعی حادثے کے بارے میں ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ خیرہ کُن مسکراہٹ کے ساتھ بولی، "بڑے ماہر شکاری ہو۔ کیسی آسانی سے شکار گرا لیتے ہو۔"

شیامل کا دل اُس بچے کی طرح کھیل میں لگ گیا جسے کوئی سینیئر ہم جولی مزے کے کھیل سِکھا رہا ہو۔

باقی وقت اس نے فرماں برداروں کی طرح گزار دیا مگر آخر تک اپنے لفنگے چہرے سے ایک رازدارانہ سی طنزیہ مسکراہٹ نہ ہٹائی، اور اسی مسکراہٹ نے مسز متی کی جیت کی ساری خوشی مٹی کر دی۔ جلد ہی اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی توہین ہوئی ہے۔ اُس کمینے کی طرف سے یہ دُہرا چیلنج تھا۔

راجا صاحب اور پارٹی واپس آئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ مسز متی تھک کر سوئی تھی، اور گھنٹے بھر بعد اَب جب اٹھی تھی تو اسے بخار سا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ جیسے ہی اس کی نظر چکودی کی بیوی پر پڑی، وہ سمجھ گئی کہ یہ عورت بہت سی باتیں قیاس کر کے بیٹھی ہے، جبھی اس کی آنکھیں شیامل پر ٹِکی ہوئی ہیں۔ شیامل ہال کے ایک کونے میں پڑا گھری نیند سو رہا تھا، اور مسز چکودی آنکھیں گڑائے اسے برابر گھورے جا رہی تھی۔ اس کی بھیانک آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے ساتھ کی گئی اس دغا بازی کو کس شدت سے محسوس کر رہی ہے۔

متی صاحب آتے ہی کہنے لگا، "ڈارلنگ! مسز چکودی کو سارے وقت یہی فکر ستاتی رہی کہ تمھیں اکیلا چھوڑ آئے ہیں... کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی... ایں؟"

مسز متی ابھی تک چکرائی ہوئی تھی، مگر اس نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ چکودی کی عورت کا شبہ دور کرنا ضروری ہے؛ ساتھ ہی اس سوئے ہوئے منحوس شیامل کی طنزیہ مسکراہٹ بھی مٹانا ہے۔ ان ہٹیلے پن کی حد تک احسان فراموش ہونٹوں پر یہ مسکراہٹ صاف پڑھی جا رہی تھی۔

چناں چہ وہ پھٹ پڑی۔ مسٹر متی کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کر وہ اسے کھینچتی ہوئی ہال میں لے آئی۔ "تمھیں خبر ہے؟ خبر ہے اِس... اِس وحشی نے میرے... مجھے... میں نے بھی اسے وہ جوتے لگائے ہیں... اچھی ٹھکائی کی ہے حرام زا..."

"کیا؟ کیا اس شیامل نے...؟"

"ہاں... ہاں جی! ایسا بھینگر... اوماں! کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا حرامی نکلے گا یہ۔"

کچھ دیر تک ایک بھاری بے ڈھب سناٹا طاری رہا۔ راجا صاحب، جو ہمیشہ سے اپنے اس شوفر سے ایک نامعلوم سی کد رکھتا تھا، سوئے ہوئے شیامل کی طرف طیش کے عالم میں پیر پٹکتا ہوا بڑھا؛ اس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ راجا صاحب گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور اتنی دیر میں پسینے میں تر ہو چکا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

اندھیرے میں چکودی صاحب اور متی صاحب اکڑی ہوئی لاشوں کی طرح بے حرکت تھے۔ لگتا تھا دو ٹھے فرش میں گڑے ہوئے ہیں۔ یہ ساکت منظر ایک لمحے بعد اچانک مسز چکودی کی سسکیوں سے درہم برہم ہو گیا۔ وہ سسکتی ہوئی جھپٹی اور نہایت غصے میں اس نے شیامل کو ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔

شیامل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، مگر اس کی حیرت اور سراسیمگی عارضی تھی۔ مسز متی کے سوا، سب کے سب چکودی کی بیوی کی پیروی میں اس پر پل پڑے۔ اس پر اتنی وحشت سے لاتیں اور گھونسے برسائے گئے کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اُس وقت تک مسز متی کی ہسٹیریائی ہنسی بتدریج بڑھتی ہوئی سب سے اونچے سُر پر پہنچ گئی تھی۔

وہ شیامل کو کھینچ کر اُس چھوٹے سے کمرے میں پھینک آئے جہاں انھوں نے ابھی ابھی ایک نیم مُردہ سوّر ڈالا تھا۔

اس کے بعد وہ ہانپتے ہوئے، صوفوں پر ڈھیر ہو گئے۔

چوکیدار سے کہہ دیا گیا کہ اب جائے۔ اسے یہاں صبح سویرے آنا ہو گا۔ پھر دروازوں کی چٹخنیاں چڑھا دی گئیں۔ وہ سب کے سب اونچی دیواروں والے کچن گارڈن میں نکل آئے، جہاں انھوں نے الاؤ جلایا اور دائرے میں بیٹھ کر پینے پلانے لگے۔ بعد میں کسی وقت وہ اندر سے اپنا شکار کیا ہوا سوّر کھینچ لائے، اسے آگ پر ڈال دیا۔ پھر پارچے کاٹ کاٹ کر وہ لوگ آدھی کچی آدھی پکی بوٹیاں کھاتے، ناچتے اور گاتے رہے۔

رات میں دیر تک یہ جشن جاری رہا۔

ایک بار پھر دستک ہوئی۔ مسز متی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، ابھی

اندھیرا تھا۔

اور تب، خبر نہیں کہاں سے، خوف و دہشت کی ٹھنڈک اس کے وجود میں اترتی چلی گئی، پسینے بن کر اس کے روم روم سے خارج ہونے لگی۔

اس نے آوازیں دے دے کر سب کو اٹھا دیا۔ چوکیدار نے اس کی آواز سن لی اور دستک دینی بند کر دی۔

سب سے پہلے بات کرنے والا راجا صاحب تھا۔ "ہیلو! سب لوگ کو گڈ مارننگ! کچھ چائے وائے کا بندوبست کیا جائے، آں؟... ذرا دیکھوں اُس سالے شیامل کا کیا حال ہے۔"

راجا صاحب اُس چھوٹے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں شیامل کو پھینکا گیا تھا۔

"نہیں!... پلیز نہیں!" مسز متی چیخنے لگی۔ اس نے راجا صاحب کو کمرے کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔

راجا صاحب حیرت میں ہکلانے لگا، "مم... مگر کیوں؟"

مسز متی کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ بولی، "فرض کرو اُس کمرے میں تمھیں سوَر پڑا ہوا ملے، شیامل کی بجائے؟"

"مگر ہم نے سوَر تو بھون کے کھا لیا تھا پچھلی رات! کھا لیا تھا نا؟"

"فرض کرو تمھیں اندر سوَر ملے، شیامل کی بجائے؟"

"لیکن ہم نے تو... کیوں بھئی؟... سوَر تو کھا لیا تھا نا؟"

"فرض کرو سوَر ملے، شیامل کی بجائے؟"

وہ سب کافی دیر تک خاموش رہے۔

کسی نے کہا، "کچن گارڈن میں جا کے تو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ سوَر کا کافی حصہ اُدھر پڑا ہونا چاہیے۔"

"فر گاڈز سیک! کچن گارڈن میں مت جانا،" مسز متی اور مسز چکودی ایک ساتھ چیخنے لگیں، "اگر وہاں سوَر کی ہڈیاں نہ پڑی ہوئیں... تو؟"

سناٹا آدبا کر لوٹ آیا۔ بنگلے کے عقب میں سیار بولنے لگے۔ ان پانچوں میں سے ہر ایک

کسی دوسرے کو لرزتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

دو گھنٹے بعد جب مسّی صاحب جیپ چلا رہا تھا اور باقی لوگ ریت بھرے تھیلوں کی طرح بے جان بیٹھے تھے، راجا صاحب کوشش کر کے ہنسا۔ کہنے لگا، "مسز مسّی، تمھاری کلپنا یا شاید خواب بھی کیسا فنٹاسٹک تھا... بھئی جو بھی ہو ماننا پڑے گا... تم نے تو سبھی کا خون خشک کر دیا تھا... اورِ جنل ہو آپ بھی!"

مسز مسّی یا کسی اَور کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو راجا صاحب پھر بولا۔ کہنے لگا، "ویسے تو میں نے چوکیدار کو سمجھا دیا ہے۔ پہلے بھی یہ آدمی میرے بہت سے مشکل کام کر چکا ہے۔ میں نے سمجھا دیا ہے، وہ سب بندوبست کر دے گا... مطلب ہے اگر واقعی پچھلی رات ہم لوگوں سے کوئی... کوئی کنفیوژن ہو گیا ہے تو وہ سنبھال... ویسے، ہا ہا... مسز مسّی بلاوجہ ہی ڈر رہی تھیں، جیسے لوگ بھوت پریت کو بلاوجہ ہی سَپوز کر لیتے ہیں۔"

"کسے یقین نہیں تھا صاحب،" چکودی صاحب اور مسّی صاحب دونوں بولے، "رات تو سبھی کو پکا یقین تھا... یہ صفا حماقت تھی جو ہم نے کمرہ نہیں کھولا، یا کچن گارڈن میں نہیں گئے۔"

راجا صاحب کہنے لگا، "بھئی کہہ نہیں سکتے کہ بھوت وُوت صرف وہم ہوتا ہے یا کوئی اصلیت بھی ہوتی ہے... بنگلے کے لیے تو اُڑا رکھا ہے لوگوں نے کہ وہاں کوئی اثر وثر ہے... سنا ہے بھوت پریت شر قسم کی بدمعاشیاں کرتے ہیں۔ کیا لگے ہم سب کی کھوپڑی پھرا دی ہو، اُلو بنا دیا ہو، کچھ کا کچھ دکھا دیا ہو سب کو... ہا ہا۔" راجا صاحب کوشش کر کے پھر ہنسا۔

اچانک مسز مسّی سسکیاں بھرنے لگی اور چکودی کی عورت نے ہسٹیریا کی مریضہ کی طرح ہنسنا شروع کر دیا۔ باقی تینوں آدمی جیسے پھر ریت کی بوریاں بن گئے۔

عورتوں کی سسکیاں اور قہقہے بے رحمی سے کچلتی ہوئی اور غراتی ہوئی ان کی جیپ چلتی رہی، جھاڑیوں اور بکھرے ہوئے پتھروں کے درمیان راستا بناتی ہوئی، چلتی رہی۔

aaj

an urdu journal of literature and ideas

Published quarterly from Karachi, aaj presentseach time a selection of contemporary writings from many languages of the world, translated in Urdu, as well as some ground-breaking Urdu writings of today. At the end of each regular issue aspecial section - a small anthology in itself - is devoted to a particular writer orsubject. The special issues of aaj published so far have presented selections of Arabic, Persian and Hindi short stories, selected fiction of Gabriel Garcia Marquez, writings from different parts of theworld covering the tragedy of Bosnia, and, recently, the "Story of Karachi" in two volumes.

Subscription

Pakistan:
Rs 300 (one year), Rs 500 (two years)
Please send the subscription through
cheque/pay order/draft drawn in favour of
"Quarterly Aaj, Karachi"
to the following address:
Managing Editor, aaj,
A-16, Safari Heights,
Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290.
Tel: (021) 811-3474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Outside Pakistan:
Individuls: US$ 25 (one year), US$ 45 (two years)
Institutions: US$ 40 (one year), US$ 70 (two years)
Please send the subscription in US dollars to
Dr Muhammad Umar Memon,
5417, Regent Street,
Madison, WI 53705, USA.
Tel: (608) 233-2942
Fax: (608) 265-3538
e-mail: mumemon@factstaff.wisc.edu

Subscription includes registered air mail charges.

اسد محمد خاں

غصے کی نئی فصل

یہ اسد محمد خاں کی طبعزاد کہانیوں اور ترجموں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں: "کھڑکی بھر آسمان" (نظمیں، کہانیاں) ۱۹۸۲ میں، "برجِ خموشاں" (کہانیاں) ۱۹۹۰ میں اور "رُکے ہوئے ساون" (گیت) ۱۹۹۷ میں۔

اسد محمد خاں ۶ ستمبر ۱۹۳۲ کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ میں وہ پاکستان آئے اور تب سے کراچی کے شہری ہیں۔ کراچی یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کراچی پورٹ ٹرسٹ سے منسلک رہے اور شاعری اور فکشن کے علاوہ ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی تحریر کرتے رہے۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد سے تصنیف اور ترجمہ ان کا کل وقتی شغل ہے۔ آج کل وہ ایک ناول پر کام کرنے کے علاوہ امیتاو گھوش کی کتاب **In an Antique Land** کا اردو ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔

Cover painting: Bikash Bhattacharjee's "Antique II"

کتب خانہ

پیپر بیک سیریز

ISBN 969-8379-06-1
Rs.90